MAHS301CCT

ہندوستان کی معاشی تاریخ

(1200 تا 1757 عیسوی)

Economic History of India

(A.D.1200–1757)

ایم۔اے۔تاریخ

(تیسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Economic History of India (1200-1757 A.D.)
ISBN: 978-81-975411-5-5
First Edition: June 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	500
Price	:	368- (The price of the book is included in the admission fee of distance mode students)
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, Programme Coordinator–History, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, Asst. Professor of History (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, Asst. Professor of Urdu (C), DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Economic History of India (A.D. 1200–1757)

for

M.A. 3rd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad – 500 032 (TG), Bharat

Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ

(Chief Editor)

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head
Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر شعبہ تاریخ و ثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مدیر

(Editor)

Vidya Vachaspati
Shaik Mahaboob Basha
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
MANUU, Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر، تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مدیر زبان

(Language Editor)

Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) /
Guest Faculty
Directorate of Distance Education
MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر، اردو (کانٹریکچول)/گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس ادارت

(Editorial Board)

Prof. Mushtaq Ahmad Kaw
Former Head, Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر مشتاق احمد کاؤ
سابقہ صدر شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies
Department of History Aligarh Muslim University,
Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز
شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Prof. Danish Moin
Department of History
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر دانش معین
شعبہ تاریخ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Mohammad Tazeem
Retired Lecturer (S) in History
Jamia Sr. Sec. School
Jamia Millia Islamia
New Delhi

ڈاکٹر محمد تعظیم
ریٹائرڈ لیکچرر، تاریخ
جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
DDE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Mohd Aasim
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
DDE, MANUU, Hyderabad

محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر، تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Khursheed Ahmad Bhatt
Assistant Professor of History (C) /
Guest Faculty
Lucknow Campus, MANUU, Lucknow

ڈاکٹر خورشید احمد بٹ
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (کانٹریکچول)/ گیسٹ فیکلٹی،
لکھنؤ کیمپس، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ

کورس کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• ڈاکٹر عرشی اشفقت	اکائی 1
• محمد عاصم	اکائی 2،12
• شیخ زاہد اقبال	اکائی 3
• ڈاکٹر داؤد ابراہیم	اکائی 4
• ڈاکٹر غلام احمد رضا	اکائی 5،7
• ڈاکٹر شاہد جمال	اکائی 6
• ڈاکٹر مرزا ممتاز بیگ	اکائی 8،9،10
• ڈاکٹر فردوس حمید پرے	اکائی 11
• ڈاکٹر ضیاء الحق	اکائی 13،15
• ڈاکٹر اختر حسن	اکائی 14،16

پروف ریڈرس

اول	:	محمد عاصم
دوم	:	سید میر ابوالحسین
فائنل	:	شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	8
پیغام	ڈائرکٹر	9
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	10
بلاک I	**دہلی سلطنت کی معیشت**	
اکائی 1	ترکوں کی فتح کے وقت ہندوستانی معیشت	13
بلاک II	**زرعی معیشت**	
اکائی 2	دیہی ساخت: زرعی پیداوار اور تکنیک	34
اکائی 3	زرعی مال گزاری اور تشخیص اور ادائیگی کے طریقے	47
اکائی 4	مال گزاری کی تفویضات اور عطیات	60
بلاک III	**غیر زرعی معیشت**	
اکائی 5	پیشے اور شہر کاری: اہم پیشے اور تنظیمیں	84
اکائی 6	ٹکنالوجی اور شہر کاری	96
اکائی 7	تجارتی ساخت اور نظام زر	108
بلاک IV	**مغل ہندوستان کی معاشی تاریخ**	
اکائی 8	مغل ہندوستان: دیہی برادری	124
اکائی 9	زرعی پیداوار اور ٹکنالوجی	137

اکائی 10	زرعی مال گزاری، تشخیص اور ادائیگی کے طریقے	165
اکائی 11	مال گزاری کی تفویضات اور عطیات	192
اکائی 12	زرعی بحران	205
اکائی 13	زرعی معیشت: مراٹھا، دکن اور کشمیر کی علاقائی ریاستیں	220
اکائی 14	پیشے اور شہر کاری	241
اکائی 15	اہم صنعتیں اور تنظیم	257
اکائی 16	ٹکنالوجی اور شہر کاری	270
نمونہ امتحانی پرچہ		286

پیغام

مولاناآزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج و ترقی (2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4)تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دور حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سر نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کار گر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدر آباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوئوں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل رمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جا رہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جا سکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کار گر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز طلباء! آداب ۔ 'ہندوستان کی معاشی تاریخ (1200 تا 1757 عیسوی)' کورس میں خوش آمدید۔ آپ نے کہاوت سنی ہو گی: 'پیسہ میں ہے پرماتما۔' اس کا مقصد نہ صرف ایک فرد کی زندگی میں بلکہ سماجوں، قوموں اور تہذیبوں کی حیات میں بھی معیشت کے کردار پر زور دینا ہے۔ چونکہ علم تاریخ کے افق ہمیشہ وسعت پذیر رہے ہیں، اس سبب سے مختلف تاریخی ادوار میں لوگوں کے معاشی حالات کو سمجھنا تاریخی تحقیق کا ایک اہم جزو بن گیا ہے۔ مندرجہ بالا کی روشنی میں، موجودہ کورس آپ کو 13 ویں سے 18 ویں صدی کے اوائل تک ہندوستان کے معاشی حالات کے بارے میں صحیح تفہیم پیدا کرنے کے قابل بنانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں، آپ ہندوستان پر ترکوں کی فتح کے معاشی نتائج، زرعی اور غیر زرعی معیشتوں کے مختلف پہلوؤں جیسے نظام مالگزاری اور محاصل، تکنیک اور اس کے نتیجے میں زرعی ترقی، ملکی اور غیر ملکی تجارت، صنعتوں کے ظہور اور سرمائے کے افزائش، دہلی سلطنت اور ہندوستانی مغلوں کے دور میں دیہی زندگی کے طریقوں اور زرعی بحران وغیرہ کو سمجھیں گے مزید برآں آپ مراٹھا ریاستوں، دکنی سلطنتوں اور کشمیر وغیرہ کے معاشی حالات کو سمجھیں گے۔ آخری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ کورس آپ کو برطانوی سامراج کے ہندوستان پر قبضہ کرنے اور اس کی معیشت کو مکمل طور پر تباہ کرنے سے پہلے کی ہندوستانی معیشت کی تاریخ کی صحیح تفہیم پیدا کرنے میں مدد کرے گا۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور 'تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ ناوہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: 'جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔' ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس ایس شیشن نے زور دیا کہ 'تاریخ کا سماج سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔' ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہو گا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید۔ میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

کورس کوآرڈی نیٹر

ہندوستان کی معاشی تاریخ

(1200 تا 1757 عیسوی)

Economic History of India

(A.D.1200–1757)

اکائی 1۔ ترکوں کی آمد کے وقت ہندوستان کی معیشت

(Indian Economy on the Eve of Turkish Conquest)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 جاگیرداری نظام کے متعلق مباحثہ

1.3 زمینی عطیات

1.4 شہروں کا عروج

1.5 مالیاتی بحران

1.6 اکتسابی نتائج

1.7 کلیدی الفاظ

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید (Introduction)

تاریخ میں بحث ومباحثہ نے ہمیشہ علمی دنیا میں جوش وولولہ پیدا کیا ہے۔ بہت سارے موضوعات پر بحث ومباحثے نے ہی تاریخ کے متعلق علوم میں دلچسپی پیدا کی ہے۔ ایک بحث ہندوستانی جاگیرداری نظام کے متعلق ہے۔ تاریخ داں ابتدائی عہد ووسطی کے سماجی، سیاسی ومعاشی حالات کو کافی عرصے سے بحث کا موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ اس عہد کو کئی نام دیے گئے۔ جیسے بحران کا عہد، زوال کا عہد، پستی کا عہد۔ مورخین اس عہد کو جاگیرداری کا عہد گردانتے ہیں۔ وہ دور جس میں سیاسی انتشار تھا یا سیاسی قوت ٹکڑوں میں منقسم تھی اس دور میں کاشتکار بندھوامزدور میں تبدیل ہوگئے تھے اور شہری مراکز ونقدی معیشت کا زوال ہوجاتا ہے۔ اس جاگیرداری موضوع یا نظام یا تصور کو شمالی اور جنوبی ہندوستان دونوں علاقوں پر لاگو کیا گیا ہے۔ یہ ہندوستانی تاریخ میں تعمیری بحث ومباحثے کا اہم موضوع رہا ہے۔ دہائیوں تک چلنے والی اس اہم بحث کا یہ اثر ہوا کہ سیاسی، سماجی ومعاشی طریقہ عمل کے بارے میں کئی اہم سوال اٹھائے گئے ہیں۔ جاگیردارنہ نظام کا تصور یوروپین تاریخ نویسی سے لیا گیا ہے۔ کثیر الاتعداد علاقائی قوتوں کا عروج اور ذی اختیار اقتدار کی عدم موجودگی جو پورے ہندوستان کے ڈھانچے کو نظر میں رکھ کر مارکسی نظریے کی پیروی کرنے والے مورخین نے بیان کی ہے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ابتدائی عہد وسطی میں جاگیرداری نظام کے متعلق مباحثہ کا تجزیہ کرسکیں گے۔
- ابتدائی عہد وسطی میں زمینی عطیات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ابتدائی عہد وسطی میں شہروں کا عروج پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- ابتدائی عہد وسطی میں مالیاتی بحران کو سمجھ سکیں گے۔

1.2 جاگیرداری نظام کے متعلق مباحثہ (The Feudalism Debate)

ابتدائی عہد وسطی میں مغربی یوروپ میں رومن سلطنت کے بکھرنے کے بعد ایک نئے سماجی ڈھانچے اور ایک نئے طرز حکومت کی بنیاد پڑی۔ یہ نیا نظام جو کہ بتدریج ابھرا اس کو جاگیرداری (Feudalism) کہتے ہیں۔ یہ ایک لاطینی لفظ *Feudum* سے اخذ کیا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں یہ فیف (Fief) بن گیا۔ اس نئے سماج میں بہت سے طاقتور جاگیردار یا حاکم ہوتے تھے۔ وہ اپنی مسلح افواج کی بنا پر آراضی کے بڑے بڑے حصوں پر قابض تھے اور حکومت میں اہم رول ادا کرتے تھے۔ بادشاہ کی بھی حیثیت ایک بڑے جاگیردار کی طرح ہوتی تھی۔ ان طاقتور سربراہوں کے مابین مستقل تصادم رہتا تھا۔ ان کو قابو میں کرنے کے لیے بادشاہ نے یہ طریقہ نکالا کہ ان سے وفاداری کا عہد کرالیا اور اپنا اطاعت گزار بنالیا اور بدلے میں ان کے تحت مقبوضہ زمین پر ان کے اختیار کو تسلیم کرلیا۔ یعنی زمین کو ان کی جاگیر (فیف) مان لیا۔ اب یہ سربراہ چھوٹے سرداروں کو اپنا اطاعت گزار مقرر کرسکتے تھے۔ اور اپنی مقبوضہ زمین میں ایک حصہ ان کو جاگیر کے طور پر دے سکتے

تھے۔اصولی طور پر بادشاہ باغی ماتحت (Vassal) کو برخاست کر سکتا تھا مگر عملی طور پر یہ ہوتا نہیں تھا۔اس طرح جاگیر داری نظام میں حکومت پر ان جاگیرداروں کا تسلط قائم ہو گیا۔وقت کے ساتھ یہ سردار موروثی (hereditary) ہو گئے۔

جاگیر داری نظام سے منسلک دو عناصر تھے۔پہلا زرعی غلامی (Serfdom) تھا۔زرعی غلام (Serf) ایک کاشتکار ہوتا تھا جو زمین پر کام کرتا تھا مگر اپنا پیشہ تبدیل نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی اور علاقے میں ہجرت کر سکتا تھا۔شادی بھی اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا تھا۔دوسرا عنصر میز نظام (Manor System) سے جڑا ہوا تھا۔میز وہ قلعہ جس میں جاگیر دار رہتا تھا۔بہت سے یوروپی ممالک میں زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر ان میزوں کے مالکوں کی عملداری تھی۔زمین کے کچھ حصے پر جاگیر دار زرعی غلام کی مدد سے براہ راست کاشتکاری کرتا تھا،ان زرعی غلاموں کو اپنا وقت تقسیم کرنا پڑتا تھا۔وقت کے ایک حصے میں وہ اپنی زمین پر کاشتکاری کرتے تھے اور دوسرے حصے میں مالک کی زمین پر کاشتکاری کرتے تھے۔اصولی طور پر زمین جاگیر دار کی ہوتی تھی۔اور زرعی غلام کو نقد اشیاء کے طور پر کچھ دینا ہوتا تھا۔ جاگیر دار کی ذمہ داری نظم و نسق قائم کرنے کی ہوتی تھی۔

کچھ مؤرخین کا یہ خیال ہے زرعی غلامی اور میز نظام جاگیر داری نظام کے دو عناصر ہیں اور وہ سماج جہاں یہ دونوں موجود نہیں ہیں ان کو جاگیر داری نظام نہیں کہہ سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ہندستان نہ زرعی غلامی تھی اور نہ ہی میز نظام۔مگر ہندستان میں بھی زمینوں پر قابض سامنت (Samantas) ویسے ہی اختیار رکھتے تھے جیسے کہ یورپ کے جاگیر دار کو حاصل تھی۔اسی طرح یہاں کے کاشتکار بھی جاگیر دار پر منحصر تھے۔دوسرے الفاظ میں عہد وسطی کے ہندستان میں زمینوں پر قابض سامنت اپنے ہم عصر یوروپی جاگیرداروں کی طرح زمینوں پر برتر حقوق (Superior Rights) رکھتے تھے جس کی بنا پر وہ حکمرانوں کے نمائندوں کے طور پر کاشتکاروں سے لگان وصول کرتے تھے۔اسی طرح یورپ کے زرعی غلاموں کی طرز پر ہندستان کے کاشتکار ان سامنتوں کے غلام (Peasantry Servile) تھے۔ان حالات کے مطالعہ کے بعد کئی مؤرخین نے ہندستان میں بھی اوائل عہد وسطی کو جاگیر داری نظام سے منسلک قرار دیا ہے۔جبکہ بعض مؤرخین اس سے متفق نہیں ہیں۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کا دور جو 600 عیسوی سے 1300 عیسوی پر مبنی ہے ،تاریخ کی ابتدا سے عہد وسطی تک کا درمیانی دور ہے۔ مورخین اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ہندوستانی تاریخ میں اس دور کی ایک الگ شناخت ہے اور اس طرح یہ دور ابتدائی تاریخ اور بعد کے عہد وسطی سے مختلف تھا۔اسی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی تاریخ میں تبدیلی اور تسلسل کے عناصر موجود تھے جسے عہد وسطی میں منتقلی (Transition) کے ایک مرحلے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ہندوستانی تناظر میں جاگیر داری کا پہلا انضمام 19 ویں صدی کے اوائل میں کرنل جیمس ٹاڈ (James Tod) کے ہاتھوں ہوا۔جو راجستھانی تاریخ کے اہم مورخ تھے۔ٹاڈ کے مطابق جیسا کہ تمام مغربی (یوروپین) مورخین کی رائے تھی جاگیر داری کی بنیاد آقا اور غلام جیسے نظام پر مبنی تھی۔عہد وسطی کے یورپ میں آقاؤں (جاگیرداروں) کا ذمہ اپنی رعیت کی حفاظت اور نگہداشت کرنا تھا جس کے عوض وہ انہیں فوجی اور دیگر خدمات فراہم کرتے تھے۔اس نظام میں وفاداری کے جذبے نے بھی ہمیشہ آقا اور اس کی رعیت کو جوڑے رکھا۔ٹوڈ نے اپنے دور کے راجستھان میں اس نظام اور اس کے طرز و انداز کو رائج پایا۔جاگیر داری کی

اصطلاح ہندوستانی تاریخ میں اکثر و بیشتر ملتی ہے،اور بعض اوقات غیر واضح طور پر۔

1950-1960 کی درمیانی دہائی میں ہندوستانی تاریخ نویسی پر مارکسی (Marxist) نظریہ کا کافی اثر تھا۔ جس کے نتیجہ میں جاگیر دارانہ نظام کو صرف جاگیر دار اور رعیت پر مبنی نہ کر کے معاشی نقطہ نظر سے دیکھا گیا تھا جو ہندوستانی طبقاتی نظام کے ارتقا کے تناظر میں تھا۔ ہندوستانی جاگیر داری کی تشکیل کے سلسلے میں مارکسی مورخین کا اس بات پر عدم اتفاق تھا کہ کارل مارکس (Karl Marx) نے ماقبل نوآبادیاتی ہندوستانی تاریخ کو 'ایشیائی طریق پیداوار' (Asiatic Mode of Production) کے زمرے میں کیوں رکھا۔ مارکس کے قیادت میں دوسری مغربی مفکرین جیسے ہیگل (Hegel)، جیمس مل (James Mill) اور مونٹیسکیو (Montesquieu) وغیرہ نے 18-19 صدی میں 'ایشیائی طریق پیداوار' کے تصور سے یہ خیال رائج کیا کہ ایشیائی میں کیوں کہ ملکیت یا تو سلطان یا پھر سماج کا پورا حق ہوتی ہے اسی لیے یہاں پر طبقاتی جدوجہد کے غیر حاضری میں طویل عرصے تک اتنی بڑی آبادی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں پائی گئی۔

ان مغربی مورخین کے برعکس ہندوستانی مارکسی مورخین نے 1950-60 میں طبقاتی جدوجہد کو ہندوستانی تاریخ میں جاگیر داری کے تصور کے طور پر بیان کیا ہے۔ ڈی ڈی کوشامبی (D.D. Kosambi) نے معاشی سماجی تاریخ کے حوالے سے ہندستانی تاریخ میں جاگیر داری نظام کو ایک اہم جگہ دی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جاگیر داری نظام کی ترقی ہندوستان کی تاریخ میں دو طرفہ طریقہ سے عمل میں آئی۔ ایک نیچے کی طرف سے دوسری اوپر کی طرف سے۔ یہ نظریہ اپنی کتاب *An Introduction to The Study of Indian History* (1956) میں پیش کیا۔ 'اوپر کی طرف سے والے طریقے' میں ریاست نے، زمین کے مالکانہ حقوق برہمن اور دوسرے ریاستی اہلکاروں کو دے کر جاگیر داری کی ساخت تیار کی اور 'نیچے کی طرف سے والے نظام' کئی افراد اور چھوٹے گروہوں دیہی سطح پر ترقی کر کے بادشاہ کے طاقتور زمیندار اور جاگیر دار بن گئے۔ ڈی ڈی کوشامبی نے اپنے خصوصی انداز میں جاگیر داری کے تصور کو تفصیلی تجزیاتی مطالعے کے بجائے اصولی طور پر وضع کیا ہے۔ اس اہم نکتہ کو آر ایس شرما (R.S. Sharama) نے 1965ء میں *Indian Feudalism* میں شائع کیا۔ حالانکہ شرما نے کوشامبی کے جاگیر داری کے تصور، نیچے اور اوپر کے قاعدہ کی پیروی نہیں کی۔ اس کے بجائے انہوں نے ہندوستانی تاریخ میں جاگیر داری کو خاص ریاستی عمل 'اوپر سے' ہونا تسلیم کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی توجہ دوسرے پہلوؤں پر بھی مبذول کی ہے۔

آر ایس شرما نے یورپ میں جاگیر داری کے عروج و زوال کے بلجیم کے مورخ ہنری پیرین (Henri Pirenne) کے پیش کردہ نظریے کو نقل کیا ہے۔ پیرین نے جاگیر دارانہ نظام کے آقا اور رعیت کے رائج نظریہ کو رد کیا ہے اور ایک ایسی رائے قائم کی جس کے سماج پر گہرے اور وسیع نتائج تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یورپ میں لمبی دوری کی وسیع تجارت (Grand Trade) نے قدیم زمانہ میں سماج، تہذیب اور معیشت کو فروغ دیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں یورپ پر عربوں کے حملوں کی وجہ سے اسے نقصان ہوا۔ ان حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی معیشت ایک دیسی معیشت بن گئی اور بقول پیرین ایک مسدود اراضی معیشت (Closed Estate Economy) میں تبدیل ہو گئی۔ مسدود اراضی (Closed Estate) سے مراد زمین کی وہ اکائی ہے جو آقا (جاگیر دار) کی جاگیر (اوسطاً 10000 ایکڑ) ہو اور جس پر کسان کاشتکاری کرتے ہوں۔ جہاں تجارت کم سے کم ہو اور تقریباً ہر وہ چیز جو جاگیر میں رہنے والے باشندوں کو درکار ہو وہیں پیدا کی جاتی ہو۔

دوسرے الفاظ میں یہ جاگیریں معاشی طور پر خود کفیل تھیں۔ گیارہویں صدی میں ایک بار پھر مختلف حالات پیدا ہوئے جب صلیبی جنگوں نے یورپیوں کو مشرق وسطی (Near East) کی طرف موڑ دیا جو یورپی تجارت اور شہروں کے فروغ کے ساتھ جاگیر داری نظام کے زوال کا باعث بنی۔ اس طرح پیرین کے نظریہ نے تجارت اور شہروں کے فروغ اور جاگیر داری کے درمیان ناقابل مصالحت مخالفت پیش کی۔

آر ایس شرما نے اس نظریہ کو جس میں اکثر پیرین کی اصطلاحات بھی شامل ہیں بہت تفصیل سے ہندوستانی تاریخی منظر نامے پر نقل کیا ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ گپت دور حکومت کے زوال کے بعد ہندوستان کی دنیا کے مختلف ممالک سے لمبی دوری کی تجارت میں کمی آئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں شہروں کی ترقی (Urbanisation) کو نقصان پہنچا اور دیہی معیشت کو فروغ ملا۔ اس طرح ایسے حالات پیدا ہوئے جہاں معاشی وسائل کی کمی نہیں تھی لیکن زر (Currency) کی کمی ہو گئی اور چونکہ سکے دستیاب نہیں تھے، تو ریاست نے ملازمین اور برہمنوں کو تنخواہ اور انعام کی ادائیگی میں زمین دینا شروع کر دیا۔ اس تمام صورت حال میں ایک اہم عنصر یورپ پر عربوں کا حملہ آور ہونا تھا جو کہ ہندوستانی نمونے میں موجود نہ تھا۔ تاہم ہندوستانی جاگیر داری کے موضوع کے ایک نامور حامی، بی این ایس یادو (B.N.S. Yadava) نے ہندوستان پر ہنوں (Huns) کے حملوں کی طرف توجہ کروائی جو تقریباً ہندوستان میں جاگیر داری نظام کے عروج کے آغاز سے مطابقت رکھتا تھا۔ یورپ میں ظالمانہ جاگیر داری نظام کے نتیجے میں وہاں کے کسانوں نے بارہا بغاوتیں کیں۔ ہندوستان میں آر ایس شرما نے اس طرح کی بغاوت کے امکانات تلاش کیے لیکن انہیں صرف ایک مثال کیورتاز (Kaivartas) کی ملی، جو مشرق بنگال میں کشتی چلانے والے ملاح تھے اور کبھی کبھی باڑی بھی کرتے تھے انہوں نے گیارہویں صدی میں اس نظام کے خلاف بغاوت کی۔

آر ایس شرما اپنا نظریہ مکمل شکل میں 1965 میں پیش کیا جس نے اس کے بعد کی ہندوستان کی تاریخ نویسی پر بہت اثر ڈالا۔ دوسرے کئی محققین نے بھی کسی نہ کسی نکتے پر کچھ مزید تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ کی تائید کی۔ بی این ایس یادو اور ڈی این جھا (D.N. Jha) بھی اس نظریہ کے مضبوط حامی ہیں۔ مزید برآں جنوبی ہندوستانی تاریخ نگاری میں بھی اس نظریہ کے حامی پائے جاتے تھے جس میں ایم جی ایس نارائنن (M.G.S. Narayanan) اور نوبارو کاراشیما (Noboru Karashima) جیسے مشہور مورخین بھی اس کے حامی ہیں۔ کچھ انتہائی باشعور حلقوں میں اس پر تنقید بھی ہوئی۔ ان کے ناقدین میں سب سے اہم ڈی سی سرکار (D.C. Sircar) تھے۔ 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں ہندوستان میں تاریخ نگاری کے طریقوں میں صاف اختلاف دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں ڈی ڈی این جھا صاف طور پر مارکسی خیال کے ہمنوا تھے، تو دوسری طرف ڈی سی سرکار ان سب کے برعکس تھے۔

1946 میں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک مشہور مارکسی ماہر معاشیات موریس ڈاب (Maurice Dobb) نے اپنی کتاب *Studies In the Development of Capitalism* شائع کی۔ اس کتاب میں اس نے تجارت اور جاگیر داری کے مابین پیرین کے بیان کردہ تضاد پر سوال اٹھایا اور Engels کے نظریات کی بنا پر اس حقیقت کی طرف توجہ کروائی کہ مشرقی یورپ میں تجارت کے احیاء نے دوسری زرعی غلامی کو پیدا کیا جو کہ جاگیر داری نظام کا ایک عنصر ہے۔ اس طرح انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مغربی یورپ میں بھی جاگیر داری کا زوال تجارت کے احیاء سے نہیں بلکہ دیہی علاقوں میں جاگیرداروں کی زیادتیوں اور بڑھتے ہوئے استحصال سے کسانوں کی

شہروں کی طرف منتقلی کی وجہ سے ہوا۔1950 کی دہائی کے اوائل میں مارکسی ماہرین معاشیات اور مورخین کے لیے یہ نظریہ ایک بین الاقوامی بحث کا موضوع بن گیا اور یہ بحث اب بھی بنیادی طور پر اس سوال تک محدود تھی کہ جاگیرداری نظام اور تجارت ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں کہ نہیں۔ وہیں فرانس میں جہاں تاریخ لکھنے کا ایک متبادل نمونہ جسے انال مکتب فکر (Annals School) کہتے ہیں وجود میں آرہا تھا جس کے تحت نئے سوالات پوچھے جارہے تھے اور مسئلے کی نئی جہتیں تلاش کی جارہی تھیں جس کا کچھ اثر ہندوستان میں بھی دیکھا گیا۔

1979 میں Indian History Congress کے Medieval Indian Section کے صدارتی خطاب میں مارکسی دانشور ہربنس مکھیا نے اپنا تحقیقی مقالہ Was there Feudalism In Indian History? (کیا ہندوستان میں جاگیرداری نظام تھا) پیش کیا۔ اس میں انہوں نے ہندوستانی جاگیرداری کے موضوع پر نظریاتی و تجرباتی سطح پر عہد وسطی کے ہندوستانی منظر نامے کا عہد وسطی کے یورپ سے موازنہ کرتے ہوئے کچھ خدشات کا اظہار کیا۔ اس سے متعلق نظریاتی سوال یہ تھا کہ کیا جاگیرداری کو ایک عالمگیر نظام تصور کیا جاسکتا ہے یا جاگیرداری، عالمی نظام کے بجائے صرف علاقائی نظام ہو سکتا ہے۔ ہربنس مکھیا کے ہندوستانی جاگیرداری پر اس مقالہ کی تجرباتی بنیاد عہد وسطی کے مغربی یورپ اور عہد وسطی کے ہندوستان کی تاریخ کے مابین موازنہ پر رکھی گئی تھی جس کا تعین تین سطحوں پر کیا گیا۔ ماحولیاتی حالات، دستیاب ٹیکنالوجی اور زراعت میں مختلف محنت کشوں کی سماجی تنظیم۔ اب اس نئے زاویئے کے ساتھ یہ بحث صرف جاگیرداری، تجارتی اختلاف تک محدود نہیں رہی۔

یہ استدلال اس نقطہ نظر کی پیروی کرتا تھا، کہ مغربی یورپ کی آب وہوا اس طرح کی تھی کہ وہاں سال میں صرف چار مہینے ہی موسم گرما اور سورج کی روشنی فراہم تھی۔ جس کے باعث وہاں بوائی، فصل کی دیکھ بھال، کٹائی اور ذخیرہ کرنے تک تمام زرعی کام انہیں چار مہینوں میں مکمل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ تمام کام بہت محنت کش (Labour Intensive) تھے۔ اس لیے ان چار مہینوں کے دوران مزدوروں کی ضرورت زیادہ بڑھ جاتی اور ایک دن کو بھی مزدورون کی کمی پیداوار پر اثر ڈالتی تھی۔ جس کا حل یہ نکلا کہ مزدوروں کو زمینوں سے منسلک کر دیا گیا۔ یعنی ایک ہی زمین پر کاشت کے لیے مجبور کیا گیا اور غلام بنا دیا گیا۔ اس سے کسان اور جاگیردار، جاگیردار اور زرعی غلام کے درمیان بہت تناؤ پیدا ہو گیا۔ جاگیردار کی کوشش ہوتی کہ کسان کو زیادہ قابو میں کیا جائے۔ کسان اکثر مطیع تھے لیکن اپنی زمین کاشت کرنے کے لیے حکم عدولی کی کوشش کرتے۔ یہ جدوجہد غیر متحرک مگر شدید تھی اس کے نتیجے میں تکنیکی بہتری آئی۔ بارہویں صدی تک زرعی پیداوار میں 4:1 تک اضافہ ہوا۔ آبادی میں خاطر خواہ افزائش ہوئی اور اسی وجہ سے زمینوں سے مزدوروں کی رہائی بھی عمل میں آئی۔ زراعت کی توسیع سے تجارت اور شہروں کی ترقی میں تیزی آئی۔ تاہم 1348-51 کے طاعون (Black Death) کی وجہ سے ایک چوتھائی آبادی کا صفایا ہو گیا جس کے نتیجے میں دوبارہ مزدوروں کی قلت پیدا ہو گئی اور ایک بار پھر بندھوا مزدوروں کا نظام شروع ہو گیا۔ حالانکہ کسان جنھوں نے 12-گیارہویں صدی میں بہتر حالات دیکھے تھے خاص طور پر بارہویں صدی میں پوری طرح سے بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ یہ بغاوتیں غریب کسانوں کے بجائے خوشحال لوگوں کا کام تھیں، اور صدی کے آخر تک جاگیرداری کا نظام خاک میں مل گیا۔

دوسری طرف ہندوستانی ماحولیات کو تقریباً دس مہینوں کی دھوپ میسر ہوتی تھی جس میں زراعت کے کام ہوتے تھے۔ یہاں شدید

گرمی کے بعد بارش کی وجہ سے مٹی کا اوپری حصہ زرخیز تھا۔اس لیے زیادہ سخت محنت اور گہری کھدائی کی ضرورت نہیں تھی۔ہندوستانی بیل کی ساخت اس طرح کی ہے کہ اس کے کوہان پر ہل (Plough) آسانی سے رکھا جاسکتا ہے اور بیل کی قوت کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔جب کہ یورپ میں پائے جانے والے بیل کوہان والے نہ تھے جس سے ہل کو آسانی سے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔عہد وسطی کا یورپ کئی صدی کی تکنیکی کاوش کے بعد بیلوں کی طاقت کو کھیتوں میں استعمال کر سکا۔عہد وسطی کے ہندوستان میں زمین کی پیداوار کی صلاحیت زیادہ تھی جس کا تخمینہ 1:16 تھا۔اس کے علاوہ ہندوستان میں زیادہ تر دو فصلیں ہوتی تھیں، جس کا 19 ویں صدی سے پہلے یورپ مین کوئی امکان نہیں تھا۔یورپ کے مقابلے ہندوستان کے حالات میں بنیادی فرق کی وجہ سے یہ بھی تھی کہ زراعت میں مزدوروں کے استعمال کی شکلیں بھی مختلف طرز کی تھیں۔بے گار یا بندھوا مزدور، معاوضہ یا بلا معاوضہ ہندوستانی زرعی پیداوار کے عمل میں کم ہی ہوتے تھے۔ان کا زیادہ استعمال غیر زرعی پیداوار کے عمل میں تھا۔جیسے کسانوں کا زمیندار کا بوجھ اپنے سروں پر لادنا یا مخصوص مواقعہ پر زمینداروں، جاگیرداروں کو دودھ یا تیل وغیرہ فراہم کرنا۔دوسرے باالفاظ میں کسان اور جاگیردار کے مابین تعلقات میں تناؤ زراعت سے ہٹ کر ہوتا تھا۔یہ تناؤ زیادہ تر لگان کی مقدار پر ہوتا تھا۔لہذا ہم عہد وسطی کے ہندوستان میں ٹکنالوجی کی پیش رفت، زرعی پیداوار کے طریقوں میں تبدیلیوں کا اس سطح کا مشاہدہ نہیں کرتے جیسا کہ ہم عہد وسطی کے یورپ میں دیکھتے ہیں۔اگرچہ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس دوران ہندوستان میں ٹکنالوجی اور زرعی پیداوار کا عمل کسی بھی طرح سے جامد نہیں تھا۔

1979 کے خطاب میں عہد وسطی کے ہندوستان کو غیر محکوم کسان پر مشتعمل معیشت بتایا گیا ہے یعنی عہد وسطی کے یورپ کے غلام کسان سے مختلف آزاد کسان۔یورپ میں جہاں زرعی پیداوار کے کاموں کے لیے کسان مالک (جاگیردار) کے محکوم تھے وہیں ہندوستان میں کسان مالک کے پابند نہ تھے۔جو چیز مالک زمیندار کے قبضہ میں تھی وہ پیداوار کی مقدار محصول کی صورت میں تھی۔یہاں ایک اہم فرق یہ بھی تھا کہ کسانوں پر زمینداروں کے تسلط کے نتیجے میں بارہویں صدی کے بعد سے یورپ میں زراعت جاگیردارانہ سے سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیل ہوگئی۔لیکن ہندوستان میں زراعت مین محصولاتی نظام کی وجہ سے کچھ زیادہ اثر نہیں دیکھا گیا۔جس کی وجہ سے یہاں سرمایہ دارانہ نظام صرف 20 ویں صدی میں وہ بھی مختلف حالات کے تحت شروع ہوا۔

'Was There Feudalism In Indian History?' کو 1981 میں ایک برطانوی رسالہ Journal of Peasant Studies نے دوبارہ شائع کیا۔جس نے اگلے چند برسوں میں بین الاقوامی حلقوں میں کافی شہرت پائی۔1985 میں اس مضمون کے حوالے سے دنیا بھر کے آٹھ مضامین اور اصل مصنف کا رد عمل Feudalism and Non-European Societies کے عنوان سے ایک مخصوص اشاعت میں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سے شائع ہوا۔یہ بحث یورپ اور ہندوستان سے نکل کر ترکی، چین، عرب، ایران تک پھیل گئی۔اس کے علاوہ تین دیگر مقالات بعد میں اسی بحث سے متعلق شائع ہوئے۔ان مباحث کو اکثر جاگیردارانہ بحث (Feudalism Debate) کہا جاتا ہے۔متعلقہ مقالات کا ایک مجموعہ 1999 میں نئی دہلی سے *The Feudalism Debate* کے عنوان سے شائع ہوا۔

یہ بحث جاگیر دارانہ نظام کی عالم گیریت کے نظریاتی پہلو کا تنقیدی جائزہ لیتی ہے۔اس میں پایا جاتا ہے کہ ہر مورخ کا اپنا ایک آزاد موقف تھا۔ہندوستانی تاریخی شواہد کے پس منظر میں آر ایس شرمانے جو کافی تنقید کی زد میں تھے،اپنے پرانے موقف پر نظر ثانی کی اور ہندوستانی جاگیر داری کے اپنے مقالے کی اصلاح کی،اور اپنے مقالہ 'How Feudal was Indian Feudalism' میں بھرپور طریقہ سے اس کا دفاع کیا۔ان کا موقف ہندوستان میں جاگیر داری صرف ریاست کی طرف سے جاگیر دار بچولیوں (Intermediaries) میں اراضی کی منتقلی کے بناپر ہوا، باعث تنقید بنا۔انہوں نے اپنے اس موقف میں ترمیم کی اور جاگیر دارانہ نظام کو ایک معاشی تشکیل بتایا جو سماج میں معاشی اور سماجی بحران سے پیدا ہوا اور پھر لوگوں کے ذہنوں میں 'کل یگ (Kaliyug) کے تصور کو عام کرتا ہے' کے نقطہ نظر کو فروغ دیا۔ اس نقطہ نظر سے اپنے اس دعوے کو رد کیا کہ یہ ایک مکمل ریاستی عمل کا نتیجہ تھا۔بی این ایس یادو نے بھی عہد وسطی کے ابتدائی ہندوستانی ادب میں کل یگ کے تصور کا تفصیلی مطالعہ کیا اور تجویز پیش کی کہ یہ تصور بحران کی سی خصوصیت رکھتا ہے۔یعنی ایک ایسا تناظر جہاں معاشرہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہوتا ہے۔ان سب دلائل نے ہندوستان میں جاگیر داری کے نظریہ کی بحث کو تقویت بخشی۔آر ایس شرما نے کسانوں کی بغاوت کے کئی دیگر واقعات کا بھی تذکرہ کیا جس کا پہلا ذکر انہوں نے اپنی 1965 کی کتاب میں کیا تھا۔یہ بھی اس بحث میں ایک اہم دلیل تھی۔آر ایس شرما نے جاگیر دارانہ سماج کے نظریاتی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی توجہ دلائی ہے۔2001 میں نئی دہلی سے شائع ہوئے *Early Medieval Indian Society: A Study in Feudalisation* کے عنوان سے اپنے مقالات کے ایک مجموعے میں انہوں نے اپنے کئی پرانے دلائل پر نظر ثانی کی اور کچھ نئے موضوعات جیسے The Feudal Mind شامل کیے جہاں وہ فن اور فن تعمیر میں جاگیر دارانہ درجہ بندی کی عکاسی، جاگیر دارانہ معاشرے میں انکساری اور وفاداری جیسے محکومانہ خیالات وغیرہ جیسے مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔کئی دیگر مورخین جو جاگیر داری کے تصور کی پیروی کرتے تھے ثقافت کے اس نئے پہلو کی طرف متوجہ ہوئے۔

اپنے 16 مقالات کے مجموعہ *The Feudal Order: State, Society and Ideology in Early Medieval India*, 1987 میں ڈی این جھا نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ وہ ایسے مقالوں کو شامل کریں جو جاگیر دارانہ نظام کی ثقافتی اور نظریاتی جہتوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔اس طرح دریافت کی جانے والی ایک بڑی جہت مذہب یا بھکتی تحریک تھی جو شمالی اور جنوبی ہندوستان میں مقبول عام تھی،اور دوسری ہندوستان کی علاقائی ثقافتوں اور زبانوں کی ترقی ہے۔اگرچہ اکثر محقق یہ مانتے ہیں کہ بھکتی تحریک کا عروج برہمنی قدامت پسندی (Brahman Orthodoxy) کے تسلط کے خلاف ایک مقبول احتجاج کے طور پر ہوا تھا۔جاگیر دارانہ نظام کے حامی اسے جاگیر داری کی ایک اہم کڑی مانتے ہیں کیوں کہ اس فرقہ میں مکمل سپردگی،تابعداری اور دیوتا کی وفاداری ایک اہم صفت ہے۔اس لیے یہ سمجھا گیا ہے کہ ایسی خصوصیت بآسانی جاگیر دارانہ نظام کے آقا اور غلام کے تعلق میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ہندوستان میں جاگیر داری نظام کی تائید کرنے والے کچھ مورخین آپس میں اختلافی نظریات بھی رکھتے ہیں۔

خود یورپی تاریخ نگاری میں اس مسئلے پر مورخین کی رائے میں تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔اگر ہنری پیرین نے 1930 کی دہائی میں شہری تجارت و دیہی جاگیر داری اور فطری معیشت (Natural Economy) اور معیشت زر (Money Economy) کے

درمیان ایک ناقابل حل اختلاف بتایا، تو بعد کے مورخین نے ان میں مطابقت ظاہر کی۔ فرانسیسی مورخ مارک بلاک (Mark Bloch) نے اپنے ایک مقالہ کو 'Natural Economy or Money Economy: A Pseudo-Dilemma' کا عنوان دیا ہے اور ایک دوسرے فرانسیسی مورخ گائے بوئس (Guy Bois) نے اپنی ایک حالیہ تحقیق میں مغربی یورپ میں سنہ 1000 کے آس پاس انہیں علاقوں میں جہاں تجارت میں بہت ترقی ہوئی تھی، جاگیر دارانہ معاشی تعلقات کے فروغ پر نظر ڈالی ہے۔ یعنی اس نے تجارت اور جاگیر دارانہ نظام کے درمیان ایک براہ راست غیر معمولی تعلق قائم کیا ہے۔ اس طرح تجارت / جاگیر داری کے اختلاف کو اس کے آغاز کی جگہ یعنی یورپ میں ہی ترک کر دیا گیا۔ تجرباتی طور پر بہت سے مورخین اس نقطہ نظر سے اتفاق رکھتے نظر آئے کہ ہندوستانی جاگیر داری کا دور اس میں اس خطہ میں تجارت کے زوال اور سکوں کی کمیابی کا دور تھا۔ آر ایس شرما کا اس نظریے پر بہت زیادہ انحصار کرنا کہ ہندوستان میں جاگیر داری کے عروج کی وجہ لمبی دوری کی بیرونی تجارت کی غیر موجودگی تھی، ڈی این جھا کے ذریعے تنقید کا باعث بنا۔ لیکن زیادہ اہم یہ ہے کہ سن 1000 جسے مورخین یورپ میں تجارت کے احیا کا دور مانتے ہیں، ہندوستان کے کئی خطوں میں اس سے بہت پہلے تجارت پروان چڑھ رہی تھی ۔ بی ڈی چٹوپادھیائے (B. D. Chattopadhyay) کے مطابق یہ کم از کم ایک صدی پہلے ہوا تھا۔ حال ہی میں رنبیر چکرورتی (Ranabir Chakravarti) نے دو کتابوں *Trade In Early India*, 2001 اور *Trade and Traders in Early Indian Society*, 2002 میں متعلقہ دور میں تجارت کے فروغ کے کافی شواہد پیش کیے ہیں۔

سکوں کی کمی (Monetary Anemia) کا مفروضہ جو ہندوستانی جاگیر داری کی تشکیل کے لیے بنیاد ہے کو بھی بی ڈی چٹوپادھیائے اور بی این مکھر جی (B. N. Mukherjee) کی حالیہ تحقیقات نے سوالوں کے دائرے میں کھڑا کیا ہے۔ جان ایس ڈیل (John S. Deyell) نے اپنی کتاب *Living without Silver: The Monetary History of Early Medieval North India*, 1990 میں بھی پیسے کی کمی کے مفروضے کو رد کیا ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ سونے چاندی یا تانبے جیسی دھات عہد وسطی کے معاشروں میں زر مبادلہ کی واحد شکل نہیں تھی۔ مارک بلاک کا یہ بھی کہنا ہے کہ عہد وسطی کے یورپ میں تقریباً کوئی بھی چیز زر مبادلہ (رقم) کا کام دے سکتی تھی۔ جیسے مخصوص قسم کے مصالحے کا ایک خاص پیمانہ، ایک خاص قسم کے کپڑے کا ایک خاص عرض یا ایک خاص اناج کا پیمانہ وغیرہ۔ ہندوستان میں بھی تبادلے کے طور پر کوڑی (Cowrie) کے استعمال نے حال ہی میں مورخین کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اور یہ حقیقت سے کہ کوڑی کی خریداری درحقیقت لمبی دوری کی تجارت میں شامل تھی۔ کیونکہ کوڑی کے خول دور دراز کے علاقے جیسے مالدیپ سے حاصل ہوئے تھے جو اس کی اہمیت بتاتے ہیں۔

1.3 زمینی عطیات (Land Grants)

ہندستانی تاریخ میں سب سے مشکل ابتدائی عہد وسطی کو سمجھنا یا کوئی نام دینا ہے۔ کئی سالوں سے مورخین نے اس عہد کو کئی نام دینے کی کوشش کی ہے۔ کیا یہ عہد ریاستی اقتدار کے زوال کا عہد تھا یا ریاستی سماج کے پھیلاؤ کا؟ کیا یہ دیہی معیشت کا دور تھا یا زراعت کی وسعت کا ؟ کیا یہ شہروں کے زوال کا دور تھا یا شہروں کے عروج کا تیسرا دور ؟ کیا یہ جاگیر داری کا دور تھا یا اتحاد و مرکزیت کا ؟ یہ بحث ابھی بھی نامکمل

ہے۔اس بحث کا مرکز وہ زمینیں ہیں جو عطیے کے طور پر اس عہد میں وسیع پیمانے پر دی گئی تھیں۔ہندستان میں ابتدا سے ہی زمین کو خاصی اہمیت حاصل تھی۔زمینی عطیات (Land Grants) سماج میں رتبے کا پتہ دیتے تھے۔زمینی عطیہ کے بارے میں پہلی شہادت جس کتبے (Inscription) سے ملی ہے،وہ ستواہن دور کا ہے۔ان حکمرانوں نے زمینی عطیات دینا شروع کیے۔چوتھی صدی عیسوی تک اس روایت کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا تھا۔پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی تک آتے آتے ہندوستان میں ہر حکمراں خاندان اس روایت پر عمل کر رہا تھا۔ جاگیرداروں ماتحت بھی زمینی عطیے کر رہے تھے۔یہ زمینی عطیے کی تحریری سند یا منشور (Charter) تانبے پر کندہ کیے جاتے تھے۔ان کو تامر پتہ 'یعنی تانبے کی پلیٹ یا تامر شاسن 'یعنی تانبے کا حکم نامہ کہا جاتا تھا۔چوتھی وساتویں صدی کے درمیان زمینی عطیے زیادہ تر برہمنوں و مندروں کو دیے گئے۔برہمنون کو جو گاؤں دیے جاتے تھے وہ اگرہار یا برہماد یا یا شاسنہ کہلاتے تھے۔کئی عطیے بودھ و جین آشرموں اور ویشنو اور شیومت کی عبادت گاہوں کو بھی دیے گئے۔کچھ زمینی عطیے غیر مذہبی ہوتے تھے جو کہ افسران کو دیے جاتے تھے۔کتبات میں کافی تفصیل ان زمین کی عطیے کے بارے میں ملتی ہے۔جیسے عطا کرنے والے کے بارے میں،عطیہ کو پانے والے کے بارے میں،دینے اور پانے والے کے حالات اور بہت ساری اصطلاحات کے بارے میں،یہ زیادہ تر سنسکرت زبان میں ہیں۔

حکمراں کے زمین عطیہ کرنے کے فیصلے کو زمینی سطح پر افسران نافذ کرتے تھے،ان عطیے کو جائز ٹھہرانے کے لیے مذہبی دلائل کا بھی سہارا لیا جاتا تھا۔زمینی عطیے کی توسیع کا مقصد،خاص طور پر ان اندرونی علاقوں پر تسلط حاصل کرنا تھا جو قابو میں نہ تھے۔زیادہ تر زمینی عطیے کی تحریری سند میں عطیہ پانے والے کو کیا کیا مفاد یا رعایتیں حاصل تھیں،لکھی ہوتی تھیں۔یہ بھی لکھا ہوتا تھا کہ یہ عطیہ،پانے والوں کے بیٹے، نواسے یا پوتے اور آگے کی نسلوں تک منتقل ہوتا رہے گا۔ان رعایت و فوائد کی تکرار ہندوستان میں جاگیرداری نظام کی تائید کرنے والے مؤرخین کو شاہی اقتدار کے انتشار (Fragmentation of Power) کی طرف اشارہ کرنے کا موقع دیتی ہے۔آر ایس شرما و دوسرے مؤرخین کا یہ موقف ہے کہ ان عطیات نے مقامی لوگوں کے حقوق پامال کر دیے۔وہ وسائل جن پر پہلے عام لوگوں کا اجتماعی حق ہوتا تھا جیسے گھاس کے میدان،چراگاہ،پانی کے ذرائع،عطیہ پانے والوں کے استعمال میں آگئے۔ان تحریری اسناد میں یہ بھی واضح ہوتا تھا کہ یہ عطیے سرکاری افسران کی پہنچ سے دور ہوں گے،یعنی ان کا کوئی حکم ان زمینوں پر نافذ نہیں ہوگا اور گاؤں والوں یا ان زمینوں کے باشندوں کو ان نئے مالکوں کا تابعدار ہونا ہوگا اور ان ہی کو ٹیکس یا لگان دینا ہوگا۔ان ساری بندشوں نے کاشتکاروں کو نئے مالکوں کا اطاعت گزار بنا دیا اور ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

ابتدائی تاریخی دور سے ابتدائی عہد وسطی میں منتقلی بھی بحث کا موضوع ہے۔جاگیرداری نظام کی تائید کرنے والے مؤرخین کا یہ ماننا ہے کہ ابتدائی تاریخی دور میں ریاستیں (States) ایک مرکزی نظام والی تھیں۔مثال کے طور پر موریہ سلطنت جو کہ ایک وسیع علاقے پر تسلط رکھتی تھی مگر اس کی رعایا مختلف گروہوں پر مشتمل تھی۔ابتدائی تاریخی دور میں شہروں کا عروج ہوا جو کہ تجارت اور کاروبار پر منحصر تھے۔تجارت کے زوال اور دوسرے وجوہات کی بنا پر ایک سماجی و معاشی بحران پیدا ہوا اور سیاسی بکھراؤ شروع ہو گیا۔اس بحران اور بکھراؤ نے ایک خود کفیل معیشت کو فروغ دیا جو کہ زراعت پر منحصر تھی۔یہ حالات گپت خاندان کے زوال کے بعد کے دور میں پیدا ہوئے۔اس نظریے

کے بر خلاف مؤرخین کا ایک گروہ ابھرا جس میں بی۔ ڈی۔ چٹوپادھیااور ہرمن کلکے(Herman Kulke) شامل تھے۔ان کا ماننا تھا کہ ابتدائی عہد وسطی کو ایک انضمام و یکجائی(Integration) کا عہد کہہ سکتے ہیں۔بی۔ڈی۔ چٹوپادھیائے کے مطابق سماج میں کچھ سر گرمیاں چل رہی تھی، مثلاً ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زراعت کی توسیع، ریاستی سماجوں کا پھیلنا، علاقائی سطح پر ریاستوں کا وجود میں آنا، قبائلی لوگوں کا کاشتکاروں میں تبدیل ہونا، ساتھ ساتھ ہی ان کا ورن و ذاتوں کے دائرے میں شامل ہونا، انضمام کے عمل کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ جاگیر داری نظام کے حامی اس عہد کو تباہی کا عہد مانتے ہیں۔اس کے بر خلاف یکجائی وانضمام کا حامی گروہ اس عہد میں تبدیلی کے اعمال میں تیز رفتاری دیکھتا ہے۔اس گروہ نے زمینی عطیے کو ایک مختلف نظریے سے دیکھا ہے اور جاگیر داری نظام کے حامیوں کے موقف پر کئی سوال اٹھائے ہیں۔ان مورخین کے مطابق زمینی عطیے کی تحریری سند ایک قانونی دستاویز ہے۔ یہ کہنا کہ ان اسناد سے حکمراں کے قوت و مراعات میں کمی آئی، غلط ہوگا اور یہ سمجھنا کہ ان عطیات نے بادشاہ یا حکمران کے سارے حقوق چھین لیے، صحیح نہیں ہے۔ان عطیات کے بعد بھی زمین کا کافی رقبہ حکمرانوں کے قبضے میں بچا اور زمین کا بڑا حصہ پرانی روایت کے ماتحت منظم کیا جاتا رہا۔ دوسری طرف ان عطیات کے ذریعہ ریاستوں نے اپنی پہنچ کو وسعت دی اور جو سماجی و معاشی نظام ان عطیوں کے ذریعہ وجود میں آیا وہ معاشی وسعت میں کار گر رہا اور اس طرح ریاستوں نے اپنی قوت کو بڑھایا۔

زمینی عطیے جو برہمنوں، مندروں اور افسران کو دیے گئے، اس کا ایک سیاسی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ علاقے جو اب تک سیاسی اقتدار کی پہنچ سے دور تھے، وہ قابو میں آگئے، اس کے ساتھ ہی اس عمل سے نئے زرعی وآباد علاقے وجود میں آئے۔ اکثر کتبوں میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ عطیہ کردہ زمین آباد علاقوں سے دور تھی۔ان علاقوں کے لیے جو لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ یہ ہیں: ارد کھیلا(Ardhakhila) یعنی جزوی پیداوار والا، اپراتیکارا(Apratikara) یعنی کم لگان والا، اپردا(Aprada) یعنی پیدا نہ کرنے والا، آترانیا(Atraranye) یعنی جنگل میں واقع علاقہ وغیرہ۔ان الفاظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عطیہ والی زمین آبادی سے دور تھی اور جنگلات میں یا جنگلات کے قرب و جوار میں تھی۔ ساتویں صدی کے ایک کتبے سے جو بنگال سے دریافت ہوا ہے پتہ چلتا ہے کہ برہمنوں کے لیے ایک علاقہ آباد کیا گیا جو جنگل میں تھا اور وہاں جنگلی جانور رہتے تھے۔ واکاٹکوں(Vakataka) کے دو صدی کے دور میں مرکزی ہندستان اور جنوبی دکن میں زراعت کی کافی توسیع ہوئی۔ کے ایم شریمالی(K.M Shrimali) نے قریب 131 نوآباد علاقوں کی پہچان کی ہے۔ یہ نوآباد علاقے ان ہی دو صدیوں میں وجود میں آئے۔ واکاٹک حکمرانوں نے یہ عطیے زیادہ تر برہمنوں کو دیے تھے۔ کچھ مندروں و علاقائی فرقوں(Cults) کو بھی ملے۔ان عطیات نے ریاست کے دور دراز علاقوں(Periphery/Outlying Areas) کو سنسکرت تہذیب کے دائرے میں شامل کرنے کا رول ادا کیا۔

زرعی وسعت کے ساتھ زراعت کی تکنیک میں نئی و گوناگوں تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ جنگلات، چراگاہ اور بنجر زمین کو صاف کر کے زراعت کے قابل بنانا آسان کام نہیں تھا۔اس کے لیے سرمایہ اور وسائل درکار تھے۔آبپاشی کے ذرائع بھی مہیا کرانے تھے۔ یہ سرمایہ اور وسائل عام کاشتکاروں کے پاس نہیں تھے، اس لیے یہ اختیارات اور وسائل، ان کو دے دیے گئے جن لوگوں کو زمین عطا کی گئی، تاکہ وہ زراعت کی توسیع کریں۔ان عطیہ کردہ زمینوں میں جب زراعت کا پھیلاؤ ہوا تو تجارت اور کاروبار کو بھی فروغ ملا۔ مختلف گروہ ان علاقوں میں

آباد ہوئے اور دولت کے نئے ذرائع پیدا کیے۔اس پیچیدہ باہمی تعامل (Interaction) میں گاؤں والوں نے علاقائی بازار قائم کیے، زیارت کرنے والوں سے ملے اور انتظامیہ کے افسران سے باہمی تعاون کیا۔اس طرح زراعت کی توسیع کے ساتھ ساتھ سنسکرت تہذیب اور برہمنی نظریے کا فروغ ہوا۔ان عطیات کے ذریعہ حکمران نے برہمن اور مندر کے پیشواؤں کو زمینیں اور ان پر اختیارات دیے۔بدلے میں انہوں نے حکمرانوں کا ہر حال میں ساتھ دیا اور ان کے قصیدے پڑھے۔

زمینی عطیات نے نہ صرف زراعت کی توسیع کی، دور دراز میں نئے علاقے آباد کیے بلکہ اس کے ذریعے نئی نئی ریاستوں کی بنیاد بھی رکھی گئی۔موجودہ ریاستوں کی پہنچ دیہی علاقوں تک ہوئی، ساتھ ہی ساتھ دیہی معیشت اور سماج نے ایک زرعی ساخت تشکیل دی، جس کے اوپر نئے حکمراں گروہوں نے اپنے اختیارات قائم کیے۔اس طرح یہ بکھراؤ کا دور نہ ہو کر علاقائی سلطنتوں کے عروج کا عہد ہو گیا۔یہ علاقائی ریاستیں کئی صدی تک حکومت کرتی رہیں۔مختلف قسم کے سیاسی گروہ نئے آباد کردہ علاقوں میں وجود میں آئے۔ان ریاستوں کی شروعات تابعدار (Feudatory) کے طور پر ہوئی یا ان کے حکمراں پہلی سلطنتوں کے سلسلہ نسب سے واسطہ رکھتے تھے۔اب وہ اتنے خود مختار اور طاقتور ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو آزاد حکمراں کے طور پر اعلان کر دیا۔مثال کے طور پر میتراکا (Maitraka) خاندان نے سوراشٹر کے علاقے میں ایک علاقائی ریاست قائم کی۔یہ علاقہ موریہ، گپت اور دیگر حکمرانوں کے ماتحت رہ چکا تھا۔میتراکا حکومت کے بانی نے اپنی سیاسی زندگی گپتوں کے ماتحت جنگی افسر کے طور پر شروع کی۔علاقائی ریاست کے طور پر ان کا محور یا مرکز سوراشٹر کا علاقہ تھا۔چوتھی اور چھٹی صدی کے درمیان تقریباً پچاس ریاستیں وجود میں آئیں۔یہ ریاستیں مہاراشٹر، جنوبی مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور بنگال میں وجود میں آئیں۔یہ ریاستیں پہلے کی ریاستوں کے بکھراؤ کے سبب وجود میں نہیں آئیں بلکہ ان کا قائم ہونا نئے علاقوں میں آبادکاری و نئے معاشی و سماجی تبدیلی حالات کی ترقی کی عکاسی کرتا ہے۔

پانچویں صدی سے زرعی معیشت کی ترقی نے علاقائی زمیندار طبقہ کو وجود میں آنے کا موقع دیا۔قدیم گاؤں اور قبائلی گروہ جن میں آپس میں بہت تفریق نہ تھی، ٹوٹ گئے۔نئے زمیندار طبقہ کے وجود میں آنے سے اب جو دیہی سماج وجود میں آرہا تھا، اس میں طبقات کے مابین کافی تفریق تھی۔اس کا مطلب یہ تھا کہ کئی تابع دار گروہ وجود میں آئے جو دوسروں پر منحصر تھے یا پابند تھے۔مثال کے طور پر نچلے درجے کے کاشتکار، گاؤں کے نوکر، مزارع (کرایہ دار) اور نچلے درجے کے دستکار یا کاریگر۔انہی تابعدار گروہوں کی محنت پر پورا سماجی ڈھانچہ ٹکا ہوا تھا۔ان تابعدار کاشتکاروں اور گروہوں کی بڑھتی ہوئی غلامی، جاگیر دارانہ تعلقات کی ایک اہم کڑی تھی۔جاگیر دارانہ نظام کے حامی مورخین کا یہ نظریہ تھا کہ زمینی عطیوں نے ایک زمیندار طبقہ کو پیدا کر دیا جس نے کاشتکاروں کی زمینوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔وقت کے ساتھ کاشتکاروں کی غلامی بڑھتی گئی اور ان کے حقوق پامال ہوتے گئے۔ان علاقوں میں جہاں اب تک وہ آزاد تھے ان تبدیلی کی صدیوں میں انہی تابع دار لوگوں پر پورا نئی زراعت کا ڈھانچہ انحصار کرنے لگا۔

جاگیر دارانہ نظام کے حامی مورخین کا یہ نظریہ ہے کہ حالانکہ ہندوستان میں یورپ کے طرز پر زرعی غلامی نہیں تھی مگر کاشتکاروں اور تابعدار مزدوروں کا استحصال وسیع پیمانے پر تھا اور یہ استحصال نئی نئی شکلیں اختیار کر رہا تھا۔مورخین آر۔ایس۔شرما اور بی۔این۔ایس۔یادو

نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ کتبات یہ بتاتے ہیں کہ گاؤں یا زمینی عطیے میں زمین کی منتقلی کے ساتھ ساتھ زمین یا گاؤں میں آباد لوگوں کو بھی عطیہ پانے والوں کے تسلط میں دے دیا جاتا تھا۔ اس عمل کا یہ مطلب تھا کہ علاقائی سطح کے گروہ عطیہ پانے والوں کو مزدوری وخدمات فراہم کریں اور اس وجہ سے وہ زمین سے زبردستی جڑے رہیں۔ آر۔ ایس۔ شرما یہ بتاتے ہیں کہ ابتدا میں عطیوں میں کچھ رعائتیں اور مالکانہ حقوق دیے گئے۔ مگر بعد کے عطیوں کے بارے میں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ عطیہ پانے والوں کو زمین کا پورا مالک بنا دیا گیا۔ مثال کے طور پر بعد کے عطیہ پانے والوں کو ہر قسم کا ٹیکس یا لگان وصول کرنے کا حق دے دیا گیا۔ درست وغیر درست، صحیح یا غیر صحیح اور معین یا غیر معین آمدنی کا مالک بنا دیا گیا۔ عطیہ کی تحریری اسناد جو کہ مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کونکن اور گجرات کے علاقوں سے گپت ومابعد گپت عہد میں ملتے ہیں، میں عطیہ یافتگان کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ کاشتکاروں کو زمین سے بے دخل کر سکتے ہیں اور نئے کاشتکاروں سے کام لے سکتے ہیں۔ ان رعایتوں نے کاشتکاروں کو غلامی کی طرف دھکیل دیا، اور عطیہ پانے والوں کو زمین کی پیداوار پر برتر حقوق فراہم کر دیے۔

ساتویں صدی کے بعد کے عطیوں نے گاؤں کی زمین کے ساتھ وسائل جیسے زرخیز زمین پانی کے ذرائع اور مختلف قسم کے پیڑ اور چراگاہ عطا کر دیے گئے۔ اس قسم کے عطیات نے گاؤں کے باشندوں کو اپنے گاؤں کے ہر وسائل سے الگ کر دیا جس پر آج تک انہیں اجتماعی حقوق حاصل تھے۔ ان رعائتوں کو نافذ کرنے کے لیے جبر وطاقت کی ضرورت ہوتی تھی۔ عطیہ پانے والوں نے اس کو خوب استعمال کیا۔ جبری مزدوری (Forced Labour) جس کو وشتی (Vishti) کہا جاتا تھا، کا تزکرہ مغربی مرکزی اور جنوبی ہندوستان کے کتبوں میں ملتا ہے۔ جبری مزدوری کا حق عطیہ پانے والوں کو دی جانے والی رعائتوں میں سے ایک رعایت تھی۔ زمین کے مالکان، تابعدار مزدوروں سے کام لینے میں کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ دسویں صدی کے بعد جبری مزدوری کا بیان کم ملتا ہے، مگر لگان کے لیے اصطلاحات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کئی طرح کے لگان وصولے جانے لگے۔ بلاآخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی عہد وسطی میں جو سماجی نظام وجود میں آیا تھا وہ عدم مساوات پر مبنی تھا۔ یہ ڈھانچہ برہمنوں نے ترتیب دیا تھا اور حکمرانوں کا پورا ساتھ ان کو ملا ہوا تھا۔ یہ ڈھانچہ دونوں کے لیے فائدے مند تھا۔ مندروں کی بڑھتی طاقت اور دیہی علاقوں میں ان کی وسعت بھی اس عہد کا اہم عمل تھا۔ آٹھویں صدی سے مندروں نے دیہی علاقوں میں اپنا تسلط قائم کر دیا تھا، جہاں اب تک مقامی دیوی دیوتا اور مذاہب رائج تھے مگر اب مندر بڑھتی سیاسی قوت کی نشان دہی کر رہے تھے۔ مندر اب لمبی چوڑی ساخت کے ہونے لگے تھے اور دیہی علاقوں پر قابض ہو رہے تھے۔ دسویں صدی آنے تک مندر ایک بڑے زمیندار کے طور پر ابھر کر سامنے آ گئے تھے اور معاشی وتہذیبی کاموں میں اہم رول ادا کرنے لگے۔

1.4 شہروں کا عروج (The Emergence of Cities)

ہندوستانی تاریخ کے ابتدائی عہد وسطیٰ کے دور (600 تا 1300 عیسوی) میں شہروں کا عروج ہونے کا تعلق علاقائی سلطنتوں کی ترقی اور بحر ہند کی تجارتی توسیع کا نتیجہ تھا۔ بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئیں جس نے باہمی تعامل کے لیے نئی راہیں ہموار کیں۔ حکمرانوں کے ذریعہ زمینوں کے عطیے نے ایک نیا طبقہ تشکیل دیا جس پر مبنی ایک نیا سماجی واقتصادی ڈھانچہ وجود میں آیا۔ ان عطیوں سے ایک نئی زرعی

معیشت کی توسیع ہوئی ساتھ ہی ساتھ ریاستی سماج کی شروعات ہوئی۔اب نا تو دیہی علاقے یعنی گاؤں الگ تھلگ تھے اور نہ اب وہ غیر امتیازی رہ گئے تھے۔اب وہ مقامی سطح پر انتظامی ڈھانچے کے ذریعہ اعلی یا مقامی سیاسی مراکز سے منسلک تھے اس نئی زرعی معیشت نے غیر زرعی شعبے کے کو تقویت بخشی جس نے شہروں کے عروج کو فروغ دیا۔اس طرح ابتدائی عہد وسطیٰ میں شہروں کی ترقی کا مطالعہ زرعی معیشت علاقائی سلطنتوں کا وجود میں آنا اور بحر ہند کے تجارتی نیٹ ورک کے پھیلاؤ کو نظر میں رکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ مگر شہری علاقوں کا پتہ لگانا اور پھر ان کی نشو نما کی وضاحت کرنا ایک مشکل امر ہے۔عام طور پر تحریری ذرائع اور کتبوں کے ذریعہ شہروں کی ترقی اور عروج کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔بہت سے کتبے قصبوں (Towns)، تبادلے کے مراکز (Exchange Centres)اور تجارتی جال (Commercial Networks) کی وضاحت کرتے ہیں۔کچھ سفر نامے ،کاویہ ادب، غیر مذہبی ادب وغیرہ ابتدائی عہد وسطی کے شہری علاقوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔آثار قدیمہ اس سلسلے میں زیادہ مددگار نہیں ہے۔ابتدائی عہد وسطیٰ کے مقامات پر کھدائی کی گئی ہے۔ماضی میں شہروں کا مطالعہ ،عرب جغرافیہ دانوں کے کھاتوں،البیرونی کے شواہد اور اصولی نسخہ جات میں ملی اطلاع پر زیادا منحصر ہے جیسے مانسارا(Manasara)مایاماتا (Myamata)وغیرہ۔یہ شہروں کے بارے میں اور اُنکی منصوبہ بندی کے بارے میں زیادہ اطلاع دیتے ہیں مگر اس تاریخی تناظر کا کوئی حوالہ نہیں دیتے جس میں یہ شہر وجود میں آئیں ہونگے یا ابھرے ہوں گے۔

عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور میں شہروں کی موجودگی یا غیر موجودگی یا شہروں کے زوال وشہروں کے عروج کو لے کر مورخین کے مابین اختلافات موجود ہیں ۔ شہروں کی غیر موجودگی اور زوال کی وکالت کرنے والے اہم مورخین میں آر۔ایس ۔شرما،بی۔این۔ایس یادو وغیرہ ہیں۔ان کے موقف کو رد کرنے والوں میں بی ڈی چٹوپادھیائے،رنبیر چکرورتی، چمپا لکشمی(Champakalakshmi)،ڈی سی سرکار(D.C.Sircar)اہم ہیں۔

عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور میں زمینوں کے عطیے میں کافی توسیع ہوئی ہے۔اس توسیع نے ایک نیا سماجی ومعاشی نظام تشکیل دیا۔جس کو ہندوستانی جاگیرداری نظام کا نام دیا گیا۔ان زمینوں کے عطیے کی وجہ زمیندار بچولیوں کا ایک طبقہ وجود میں آیا۔اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک خود کفیل معاشی دیہی گروہ تشکیل ہو گیا۔ساتھ ہی ساتھ زرعی وسعت بھی ہوئی۔ مگر اس خود کفیل معشیت وزرعی وسعت نے شہری مراکز کی نشو نما پر منفی اثر ڈالا۔ان حالات کو دیکھ کر آر۔ایس۔شرما،بی۔این۔ایس۔یادو وغیرہ نے ابتدائی عہد وسطیٰ کے عہد کو شہروں کے زوال کا دور کہا ہے۔ ان کے مطابق اس عہد میں تجارت بھی کمزور ہو گئی تھی اور سکوں کی کمی بھی واقع ہوئی۔ان کے مطابق شہروں کا زوال زرعی وسعت کے نتیجے میں تھا۔دستیاب شواہد کے نظر ثانی کے بعد کچھ مورخین آر۔ایس۔شرما وغیرہ کے شہروں کے زوال کے موقف سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق اس عہد میں ابتدائی تاریخی دور کے کچھ شہری مراکز کے زوال کا ثبوت دیتے ہیں مگر کچھ مراکز ویران نہیں ہوئے اور انحطاط کے کوئی آثار نہیں دیتے ہیں۔سب سے پہلے آر۔ایس۔شرما نے آثاری دستاویزات کی مدد سے شہری مراکز کے زوال کا مطالعہ کیا۔انہوں نے شمالی ہندوستان کے چار علاقوں کے شواہد کا باریکی سے معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ تجارت وشہروں کا زوال جاگیردارانہ نظام سے منسلک ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب *Urban Decay in India (c. 300–c. 1000)* میں یہ نظریہ دیا کہ شہری مراکز کا زوال نئے زرعی

وسعت کا ایک حصہ ہے۔ انہوں نے نئے حالات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ زمینی عطیے اگرہار (Agrahara) نظام نے دیہی معیشت کو وسعت دی اور خود کفیل دیہی معیشت ہی شہری مراکز کے زوال کی وجہ ہے۔ انہوں نے کتبوں سے شواہد جمع کر کے بتایا کہ برہمن قصبوں سے دیہی علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے تھے ان کے مطابق دور دراز علاقوں سے تجارت کا زوال جاگیرداری نظام کی تشکیل میں ایک اہم کردار رکھتی ہے۔ اور شہری مراکز کا زوال اس تجارت کے زوال کا ایک حصہ تھی آر۔ ایس۔ شرما کا زور اونچے قیمت والے کاروباری معاملے کم مقدار والے لین دین اور آسائش کے ہلکے سامان کی تجارت پر تھا۔ انہوں نے روزمرہ کی ضروریات کی تجارت کو نظرانداز کیا جو کہ اہم بھی تھی اور جاری وساری بھی تھی۔ دور دراز علاقوں سے تجارت کے زوال کو قیمتی دھات کے سکوں کی کمی سے بھی جوڑا گیا۔ ان کے مطابق اس عہد کی تین بڑی علاقائی ریاستوں یعنی پال اور سین (750-1200) جو بنگال و بہار پر قابض تھے اور راشٹر کوٹ (754-974) جو دکن پر حکمراں تھے، انہوں نے کوئی سکے جاری نہیں کیے اور قنوج کے گرجر پرتی ہار حکمراں نے کم قیمت والے (Debased) سکے جاری کیے۔

ڈی۔ این۔ جھا، آر۔ ایس۔ شرما کے تجارت زوال کے نظریے سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں مگر وہ ہندوستانی جاگیردارانہ نظام کے حامی ہیں۔ ان کے مطابق یہ کہنا کہ جاگیردارنہ نظام کا وجود میں آنا دور دراز علاقوں کے تجارت کے زوال کے باعث ہوا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اس تجارت کے زوال کے لیے جو وجوہات ہیں وہ ہندوستان کے باہر کے حالات ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ ہندوستان کے اندرونی سماجی تضاد کی وجہ سے ایک بند معاشی نظام کی شروعات ہوئی، اور تجارت کا زوال اور سکوں کی کمی کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ پورانی (Puranic) تحریروں میں سماجی معاشی وسیاسی تبدیلیوں کا ذکر ہے اور ایک سماجی بحران کی طرف اشارہ ملتا ہے جو کل یگ کہلاتا ہے اس عہد میں تجارت یا سوداگروں کی خراب حالت کے بارے میں کہا گیا ہے۔ اس سماجی بحران نے زمینی عطیے میں تیزی لادی جو کہ حکمراں برہمنوں اور افسران کی مدد کے لیے دیے تھے۔ ان حالات نے قصبوں کو فیف میں تبدیل کر دیا۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور کی شہری مراکز کی کھدائی و تحقیق ابھی نامکمل ہے اور ابتدائی تاریخی دور کے شہری مراکز تباہی و ویرانگی کے ثبوت دیتے ہیں۔ ایک پراکرت تحریر یہ بیان کرتی ہے کہ شہری مراکز دیہی علاقوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ شہری مراکز، ادلا بدلی و دست کاری کی جگہ کے طور پر دھیرے دھیرے ختم ہو گئے اور ان کی جگہ سیاسی و عسکری انتظامی مراکز نے لے لی۔ اس عہد کی کتبوں کی پلیٹوں میں Jayaskandhavaras کا کافی ذکر ملتا ہے جو فاتح عسکری یا لشکر کے ہوتے تھے۔ اس کے ساتھ شمالی ہندوستان میں بہت سے مذہبی مراکز یا تیرتھوں کا عروج دیکھنے کو ملتا ہے جو کبھی کبھار شہری تناسب اختیار کر گئے۔ شہری مراکز کے زوال کی وکالت کرنے والوں کا یہ نظریہ ہے کہ شہری مراکز نے اپنی بنیادی اہمیت جواز کاروباری علاقے کے طور پر کھو دیا تھا اور وہ مذہبی مراکز بن گئے جو پیداوار یا کاروبار کا کام نہیں کر رہے تھے۔ ہیون سانگ کے بیان کے مطابق قصبے و دکانیں مندروں و خانقاہوں کو اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دی جا رہی تھیں۔ فن تعمیر پر ایک تحریر مانسارا، جو کہ بارہویں صدی کے آس پاس مرتب ہوئی تھی شہری و دیہی علاقوں کے بیچ فرق سمجھنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تحریر دیہی علاقوں اور شہری مراکز کی منصوبہ بندی اس طرح بیان کرتی ہے کہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے۔

شہری مراکز کے زوال کے نظریہ پر کئی سوال اٹھائے گئے ہیں کیونکہ شمالی و جنوبی ہندوستان میں اس عہد میں شہروں کے کافی ثبوت

ملتے ہیں۔ شہری مراکز کا کتبوں و تحریروں دونوں میں ذکر ملتا ہے اور ان کے لیے خاصی اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے۔ جیسے پورا (Pura) نگرا (Nagara) پٹانا (Pattana) اور مہانگر (Mahanagar) وغیرہ۔ پٹی نم (Pattinam) بندرگاہوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ شہری مراکز کا ذکر کتبوں میں نویں صدی سے ملنا شروع ہو گیا ہے۔ ہٹا (Hatta) یا منڈاپیکا (Mandapika) دو خاصی اصطلاحات تھیں جو کہ شہری مراکز کے بنیادی حصہ کو سمجھنے کے لیے استعمال ہوئیں ہیں ۔ یہ بنیادی حصہ مصنوعات کی تیاری اور ان کی ادلا بدلی یا تبادلے میں ملوث تھا جو کہ ایک شہری مرکز کا بنیادی کام ہے۔ ہٹّا کا مطلب شہر میں کاروباری سرگرمیوں کا عام مفہوم ہے۔ شہری علاقے جو معیشت کے غیر زرعی شعبے سے تعلق رکھتے تھے تجارتی مراکز سے منسلک تھے اور بہت سے شہری مراکز تجارت اور کاروبار کے بڑے مراکز تھے۔ شہری مرکز کیسے وجود میں آئے یہ ایک اہم سوال ہے۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کے دستاویزات میں حکمرانوں اور عہدیداروں کے ذریعہ بستیوں کی بنیاد رکھنے کے متعدد حوالہ موجود ہیں۔ لیکن یہ دستاویز ہمیں یہ معلوم کرنے کے لیے کوئی وسیلہ نہیں دیتے کہ ان بستیوں کی منصوبہ بندی کیسے کی گئی۔ یہ بات کہی جاتی ہے کہ حکمرانوں وعہدیداروں کے ذریعہ بستیوں کی بنیاد رکھنا پہلے سے جاری عمل کی توسیع تھی۔ یعنی شہری مراکز کے اس وقت وجود میں آنے کی ابتدا ہو گئی تھی اور حکمرانوں وعہدیداروں نے نئی بستیوں کو قائم کر کے اس عمل کو آگے بڑھایا۔ ایسے معاملات میں بستیوں کا قیام، بنیادی تبادلے کے مرکز (Core Exchange centre) یا رسمی مرکز (Ceremonial Centre) کی بنیاد رکھنے پر مشتمل تھا۔ یہ بنیاد ضروری تھی مگر یہ عمل عمومی طور پر شہری عمل کے مترادف نہیں تھا۔ یہاں پر 861 عیسوی کے جودھ پور کے گھٹیالہ (Ghatiyala) علاقے کے کتبہ کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ جہاں ایک ہٹہ کی تخلیق کا واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

آر۔ ایس۔ شرما کے شہری زوال کے موقف سے اختلاف کی پہل ڈی سی سرکار نے کی۔ انہوں نے اپنی تصنیف *Trade and Commerce* میں تحریری شواہد، کتباتی شواہد اور وسیع متنی ذرائع جس میں البیرونی کا بیان بھی شامل تھا کی مدد سے مواصلات کے راستوں کے جال (جو پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا) کا پتہ لگایا اور ساتھ ہی ساتھ طرح طرح کے سامان جنگی تجارت برصغیر کے ایک حصے تک ہوتی تھی۔ اور ان علاقوں تک جو سمندروں کے پار تھے۔ اس طرح ڈی سی سرکار نے دور دراز علاقوں سے تجارت کے زوال کی تردید کی۔ بی ڈی چٹوپادھیائے نے استدلال کیا کہ غیر ملکی تجارت کبھی بھی شہری مراکز کی ترقی میں مرکزی حیثیت نہیں رکھتی تھی، اور غیر ملکی تجارت میں کمی کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ اندرون ملک چھوٹی چھوٹی یا روزمرہ کی ضروریات کی تجارت زوال پذیر ہو جائے گی اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے چٹوپادھیائے نے شہری مراکز کی ساختوں کا معائنہ کیا ہے جو کہ ہندوستانی جاگیرداری نظام کے تصور میں ایک نہایت اہم محرک مانا گیا تھا۔ انہوں نے اس کام میں بنیادی طور پر کتبوں کے شواہد استعمال کیے ہیں۔ کیونکہ اس سلسلے میں اس عہد کے لیے آثار قدیمہ کے مواد کی کمی ہے دلچسپ بات یہ ہے کہ چٹوپادھیائے نے راجستھان گنگاندی کے بالائی و درمیانی علاقے اور مالوا جیسے خطوں سے کتبوں کا انتخاب کیا جو سابقہ گرجار پرتیہار سلطنت کے زیر تھے اور اتفاق سے آر۔ ایس۔ شرما نے بھی انہی خطوں سے اپنے شواہد لیے تھے۔ چٹوپادھیائے کی تحقیق نے تبادلے کے مراکز جیسے ہٹا یا منڈاپیکا اور ان سے وابستہ رہائشی علاقوں کی توسیع دکھائی ہے جو اکثر مقامی حکمرانوں کی نشست ہوا کرتی تھی۔ اس

سلسلے میں نادولہ (Naddula) ایک شاندار مثال ہے۔ وہ ایسے بارہ علاقوں میں سے دیہی علاقہ ہے۔ دیگر دیہی مراکز کے مقابلے میں نڈولہ کے مرکزی مقام نے اس کو بارہ دیہی علاقوں کے درمیان نقل و حرکت کے لیے مرکز میں تبدیل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہی بستیاں منڈاپیکا کے ساتھ تجارتی مرکز میں تبدیل ہو گئیں۔ نڈولہ بالا خر ایک شہری مرکز بن گیا اور چوہان حکمرانوں کی ایک شاخ کا انتظامی مرکز ہو گیا۔ رنبیر چکرورتی نے منڈاپیکا اور پینٹھا (Pentha) کے درمیان بازار کے مراکز کے بارے میں مطالعہ کیا جو کے کتبوں اور ادبی ذرائع پر مبنی ہے۔ ان کا یہ مطالعہ عہد وسطیٰ کی ابتدائی دور میں شہروں اور دیہات کے بازار کے درمیان روابط کو اجاگر کیا ہے۔ منڈاپیکا، شلک منڈاپیکا (Sulka Mandapika) بھی کہلاتی تھی کیونکہ ان پر چنگیاں، نقد اور جنس دونوں میں عائد کیے جاتے تھے۔ کتبے ہم کو ان اشیا کی متاثر کن فہرست فراہم کرتے ہیں جو منڈاپیکا پر لا کر فروخت کی جاتی تھی۔ منڈاپیکا کی طرح دکن میں پینٹھا بازاری مرکز ہوتے تھے یہ ہٹا/اڈا، اور ہفتہ میلا سنتھے (Santhe) سے بڑے ہوتے تھے مگر پورا (Pura) یا پٹنا (Pattana) سے چھوٹے ہوتے تھے۔ دکن میں پینٹھا ایک طویل عرصے تک موجود رہے۔ نگرم (Nagaramsa) جو کہ اہم تجارتی راستوں اور مقامات پر واقع ہوتے تھے جہاں پر تاجر آتے جاتے تھے اس عہد میں بڑے شہری مراکز کی شکل اختیار کر گئے وہ کافی بڑے رقبے میں پھیلے ہوتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ تجارت کی سرگرمیاں میں ملوث ہوتے تھے۔ K.R.Hall نے تجویز کیا ہے نگرم ناڈوں کے بازار ہوتے تھے اور مقامی سطح پر بازار کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ شہری ترقی کے ممکنہ مراکز تھے۔ اور گیارھویں صدی سے علاقوں کے مابین اور بیرون ملک تجارت کی وسیع جال کا حصہ بن گئے۔ اس طرح یہ تحقیقات شہری زوال کے نظریہ کو مسترد کر دیتی ہیں۔

شہری مراکس کی افزائش کو سماجی تبدیلی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جانا چاہیے ابتدائی قروں وسطی کے ہندوستان میں ایک مخصوص معشت و سماجی تشکیل کا تجربہ ہوا۔ اس وجہ سے بہت سے دیہی مراکز بتدریج شہری مراکز میں تبدیل ہوئے۔ اس عمل کی حتمی شکل نویں صدی کے بعد شہری مراکز میں اضافے کے ذریعے ہوتی مختلف علاقوں شہری ترقی اپنی اپنی وجوہات تھیں۔ اندھرا کے علاقے میں ۱۰۰۰ اور ۱۳۳۶ کے درمیان شہری مراکز کے وجود میں آنے کی کئی وجوہات بتائی گیئں جیسے علاقے میں میلوں کا انعقاد ہونا۔ مزہبی مراکز کا وجود میں آنا۔ بندرگاہوں کے قریب وجود میں تجارتی سرگرمیاں ہونا دیہی علاقوں کو شہری حیثیت عنایت کرنا اور شہری مراکز کی تشکیل میں بادشاہوں اور وزیروں کا رول ہونا۔ دو عناصر ایک مقام کو شہری مراکز کا درجہ دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اس مقام کا باہر کے علاقوں سے تعلق ہونا چاہیے اور دوسرا علاقے کے اندر ایک مراکز ہونا چاہیئے جہاں تعامل (Interaction) ایک باقاعدہ شہری سرگرمی کے طور پر ہوتا ہو ایک شہری علاقے میں اقتصادی سیاسی ثقافتی و مزہبی سرگرمیوں کا جتنی ہم آہنگی ہو گی اسکی پوزیشن ان شہروں سے نمایاں ہو گی جن کا بنیادی طور پر واحد فعال کردار ہو گا۔ اس سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے ایک شہر کا کردار اسکی متعدد (Multifunctional) (و مختلف) یا افعال پر منحصر ہو گا۔ اس سلسلے میں کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں اول Tattanandapur جو اب اہار مغربی یوپی میں ہے۔ دوسرا شہری مرکز Siyadoni بندیل کھنڈ کے علاقے میں ہے۔ تیسرا بیل گام (Belgaum) یا (Venugrama) جنوبی کرناٹک میں ہے۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی عہد کی شہری مراکز کو ادب میں کیسے پیش کیا گیا ہے اسکو بھی جاننا ضروری ہے اس کے ذریعہ شہری مراکز کے مختلف نوعیت کو سمجھا جا سکے گا۔ بان بھٹ کی

تخلیق کدمبری اوجنین شہر کاایک شان دار بیان دیتاہے۔ یہ شہر خندق سے گھراہواتھا۔ یہاں پر بہت سے مندر تھے۔ یہاں پر باغ،تالاب، وکافی تعمیرات بھی تھیں جیسے اسمبلی ہال،پُل وغیرہ۔ یہاں باشندے خوش شکل، خوش اخلاق اور شائستہ تھے۔ان لوگوں کو کئی ممالک کی زبانیں آتی تھی۔ یہ چیز تباتی ہے کہ دوسرے علاقوں سے لوگ اوجین آتے تھے۔کنیا کوبجایا قنوج شہر کی خوشحالی اور خوبصورتی کی تصویر ہوین سانگ نے اپنے سفر نامہ میں کی ہے۔اس بیان سے کنیا کوبجاکا تجارتی کردار بھی سامنے آجاتاہے۔اس عہد میں کنیا کوبجانے شمالی ہندوستان میں ایک خاص مقام حاصل کرلیاتھاجواس عہد سے پہلے پاٹلی پتر کو حاصل تھا۔

ابتدائی عہد وسطی میں شہروں کے عروج کے ساتھ بندرگاہوں کا عروج بھی منسلک ہے کتبے اور متنی زرائع اس بارے میں کافی اطلاع دیتے ہیں۔ مغربی ساحل پر کئی اہم بندرگاھے تھیں جیسے دابھول، بھروکچ،(بروچ)، سومناتھ، ستمبھاکا(کیمبے)،استھاناکا(تھانے)، سمیانہ (سنجن)سورپارکا(سوپارہ)، کیمولیا(چول)،منگلاپورہ(منگلور)، کلمالی(کولئون)وغیرہ۔ مشرقی ساحل پر اہم بندرگاہیں تھیں مملاپورم(مہابلی پورم)، ناگاپٹنم، وشاکھاپٹنم، تمرلیپتا(آٹھویں صدی تک)، سمندار وغیرہ۔ان بندرگاہیوں کا کبھی عروج ہوااور کبھی زوال ہوا۔ بھروچ ایک ایساہی بندرگاہ ہے۔ابتدائی دور میں یہ ایک اہم بندرگاہ تھامگر پھراس کازوال ہوگیا۔ گیارہویں بارہویں صدی میں ایک اہم تجارتی مرکز کے طورپر دوبارہ ابھرا۔ تھانے کی بندرگاہ جو کی شمال میں بحری کریک پر واقع ہے جو کہ سالسیٹ جزیرے کے شمال میں واقع ہے۔ یہ ساتوی صدی میں چالوکیہ اور بادمیں سلہاراخاندان کے ایک اہم بندرگاہ کے طورپر ابھرا۔ سلہاراخاندان نے مہاراشٹر کے مغربی ساحل کے زیادہ ترحصے پر قبضہ 800اور 1265 کے درمیان کیاہواتھا۔ مراکشی سیاح الادریسی نے جنوب مشرقی بنگلہ دیش میں سمندر کی بندرگاہ(جوچٹاگونگ کے پاس واقع تھی)کو بیان کراہے اور کہاکہ سمندر ایک بڑا تجارتی شہر تھا۔ناگاپٹنم کی تاریخ پرایک نظرڈالنے سے پتاچلتاہے کہ یہ عبوری بندرگاہ سے ایک بڑے بندرگاہ میں تبدیل ہوگیا تھا۔ ناگاپٹنم میں پلو حکمران راجاسمہانے ایک چینی پگوڈا بنوایا تھا۔ چولوں کے ماتحت ناگاپٹنم عروج پر تھا۔ چول عہد میں یہ شری وجئے سلطنت کے ساتھ دوستانا سفارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ابتدئی قرون عہد وسطی ایک خاس پہچان مندروں کے شہروں کاابھرناتھا۔ یہ عمل زیادہ تر جنوبی ہندوستان میں ہواجہاں شہری ترقی کی نئی قسم کااغاز ہوا۔ یہ پالواخاندان (چھٹی نویں صدی)کے تحت، خاص طورپر دارالحکومت کانچی پورم سے شروع ہواجو چول عہد میں جاری رہاجب تمل ناڈو کے بہت سے علاقوں نے مندروں کے آس پاس چھوٹے شہری مقامات کی ترقی کا تجربہ کیا۔

1.5 مالیاتی بحران (The Monetary Anemia)

مالیاتی تاریخ کے حوالے سے جان ایس ڈیل(John S. Deyell) نے یہ ثابت کیاہے کہ عہد وسطیٰ کی ابتدائی دور میں ہندوستان میں پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اوراس عہد کی ریاستیں کسی قسم کے مالیاتی بحران سے دوچار نہیں تھیں۔ مگر سکوں کی اقسام میں کمی تھی اور سکوں کی مقدار میں تنزلی(گراوٹ) تھی۔ سکوں کے گردش کی مقدار میں بھی کمی نہیں تھی۔ان کی توجہ دسویں صدی کے بعد کے عہد پر ہے مگراس وقت کی نظام زر کی جڑیں پچھلی صدیوں سے پیوست تھیں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ سکوں کاوزن کم ہونا،ضروری نہیں ہے کہ ریاستیں

(States) کوئی مالیاتی بحران سے دوچار ہوں اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک عام معاشی بحران ہو۔ در حقیقت یہ حالات سکوں کی بڑھی ہوئی مانگ کو ظاہر کرتا ہے جہاں پہلے ہی دھاتوں کی سپلائی محدود تھی۔ اس طرح کی قلت بھی دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف وجوہات کی بناپر واقع ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برصغیر کے لیے افغانستان چاندی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ جان ایس ڈیل کا یہ کہنا ہے کہ دسویں صدی سے اور کچھ جگہوں پر 750 عیسوی سے شمالی ہندوستان کو چاندی کی کمی کا سامنا کرنا پڑا اور اس قلت نے اس عہد کے حکمرانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ جاری کردہ سکوں میں چاندی کی مقدار کم کر دیں۔ اس لیے اس عہد میں زیادہ سکے دستیاب نہیں ہیں اور جو ہیں وہ کم چاندی کی مقدار والے سکے ہیں۔ یہ کسی بحران کی نشاندہی پیش کر رہے ہیں۔

1.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ترکوں کی آمد کے وقت ہندوستانی سماج بہت سی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ سابقہ نظریے کے برخلاف یہ زوال اور انحطاط کا دور نہیں تھا اور نہ ہی یہاں یورپی نظام کی طرح جاگیرداری کا غلبہ تھا۔ کچھ شعبوں میں بھلے ہی تنزلی دیکھنے کو ملی مگر اس دور مین تجارت، زراعت اور صنعت کل ملا کر فروغ پذیر ہی تھی۔ مالیاتی بحران کا مطلب سکوں میں وزن کی کمی ضرور تھی، مگر ان کے چلن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دوسری طرف کوڑیوں کی بیشمار تعداد میں موجودگی تبادلہ نظام کی نفی اور لمبی دوری کی تجارت میں اضافے کی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ کوڑیاں سراندیپ اور دیگر مشرقی ایشیائی ملکوں سے لائی جاتی تھیں۔ اس عہد سے متعلق جاگیرداری نظام کے نظریے میں بھی بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملے اور حامیوں اور مخالفین کے استدلال کو آپ نے پڑھا۔ اب آپ غور کیجیے کیا یہ عہد جاگیرداری اور تنزلی کا دور تھا یا پھر اتحاد کی طرف بڑھتے ہوئے ایک عبوری پڑاؤ تھا۔ دہلی سلطنت کا قیام کوئی انقلابی تبدیلیاں نہیں لایا، ان تبدیلیوں کی شروعات بہت پہلے ابتدائی عہد وسطیٰ میں ہی ہو چکی تھی۔

1.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

اردکھیلا	:	(Ardhakhila) یعنی جزوی پیداوار والا۔
اپراتیکارا	:	(Apratikara) یعنی کم لگان والا۔
اپردا	:	(Aprada) یعنی پیدا نہ کرنے والا۔
آترارانیا	:	(Atraranye) یعنی جنگل میں واقع علاقہ وغیرہ۔
وشتی	:	کتبوں میں جبری مزدوری (Forced Labour) جس کو وشتی (Vishti) کہا جاتا تھا۔
زرعی غلامی	:	Serf اور Serfdom یہ یورپی جاگیرداری نظام کا ایک عنصر تھا۔ سرف ایک مزارع/کاشتکار تھا، جو زمین پر کاشت تو کرتا تھا مگر وہ زمین کا مالک نہیں تھا اہم بات یہ کہ یہ چاہ کر بھی کاشتکاری ترک نہیں کر سکتا تھا بلکہ ایک طرح سے وہ بندھوا کاشتکار تھے۔ اس نظام میں وہ جاگیرداری کی طرف سے ملی زمین پر کاشتکاری کرتا تھا جس

کے بدلے میں وہ جاگیر دار کو پیداوار کا کچھ حصہ دیتا تھا۔اس کے علاوہ بھی وہ جاگیر دار کو کئی طرح کی خدمات فراہم کرتا تھا۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. زمین کے عطیہ کے بارے میں پہلی شہادت کس دور کے کتبے سے ملی ہے؟
2. 'تامر پتہ' یا 'تامر شاسن' سے کیا مراد ہے؟
3. Feudalism کس لاطینی لفظ سے اخذ کیا گیا ہے؟
4. یورپی جاگیر داری نظام سے منسلک دو عناصر کیا تھے؟
5. *An Introduction to The Study of Indian History* کے مصنف کون ہیں؟
6. سکوں کی کمی (Monetary Anemia) کا مفروضہ کس کی تشکیل کے لیے بنیاد ہے؟
7. ارد کھیلا (Ardhakhila) سے کیا مراد ہے؟
8. اپراتیکارا (Apratikara) سے کیا مراد ہے؟
9. اپردا (Aprada) سے کیا مراد ہے؟
10. جبری مزدوری (Forced Labour) کو کتبوں میں کیا کہا جاتا تھا؟

1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ابتدائی عہد وسطی میں مالیاتی بحران پر نوٹ لکھیے۔
2. جاگیر داری کے عروج سے متعلق آر ایس شرما کے نظریے پر مختصر مضمون لکھیے۔
3. 'ایشیائی طریق پیداوار' سے آپ کیا سمجھتے ہیں، اس کے حق اور خلاف میں دلیلیں بیان کیجیے۔
4. تجارت اور جاگیر داری کے درمیان مفروضہ تضاد پر نوٹ لکھیے۔
5. ہندوستان میں جاگیر داری نظام نہیں تھا، اس کے حق میں کسی مورخ کا استدلال پیش کیجیے۔

1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ابتدائی عہد وسطی میں جاگیر داری نظام کے متعلق مباحثہ کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔
2. ابتدائی عہد وسطی میں زمینی عطیات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

3. ابتدائی عہد وسطی میں شہروں کا عروج پر تفصیلی طور پر روشنی ڈالیے۔

1.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ahmed, Fouzia Farooq, *Muslim Rule in Medieval India*: *Power and Religion in the Delhi Sultanate*, Bloomsbury, New Delhi, 2022.
2. Ashraf, K.M., *Life and Conditions of the People of Hindustan*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1970.
3. Eshwari Prasad, *A Short History of Muslim Rule in India from the Conquest of Islam to the Death of Aurangzeb*, The Indian Press Ltd., Allahabad (second edition).
4. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
5. Habib, Irfan, *Interpreting Indian History*: *Zaki Husain Memorial Lectures*, North-Eastern Hill University, Shillong, n.d.
6. Habibullah, A.B.M., *The Foundation of Muslim Rule in India*, Central Publishing House, Allahabad, 1999 (first pub. in 1945).
7. Kumar, Sunil, *The Emergence of the Delhi Sultanate*, *1192–1286*, Permanent Black, Ranikhet, 2007.
8. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*: *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers, New Delhi,1995 (first pub. in 1983).
9. Mujeeb, M., *The Indian Muslims*, Munshiram Manoharlal, New Delhi, 2003 (first pub. in 1967).
10. Nizami K.A. ed., *Politics and Society during the Early Medieval Period, Collected Works of Professor Muhammad Habib*, Vol. I, Centre of Advanced Study, Department of History, Aligarh Muslim University, People's Publishing House, 1974.
11. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That Was India*, part-II, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first pub. in 1987).
12. Sachu, Edward C., *Alberuni's India*, Two Vols., Kegan Paul, Trench, Turner and Co. Ltd., London, 1910.
13. Shrimali, Krishna Mohan, *Land, Agriculture and Money in Central India and Beyond* (*c. 100 to c. 1300 A.D.*): *A Feudal Order Revisited*, Aakar, Delhi, 2024.
14. Sharma, R.S., *Indian Feudalism*, *c. AD 300–1200*, Macmillan, Delhi, 2013 (first pub. in 1965).
15. خلیق احمد نظامی/ محمد مجیب 'جامع تاریخ ہند' نیشنل کونسل فار پرموشن آف اردو، نئی دہلی۔

اکائی 2۔دیہی ساخت: زرعی پیداوار اور ٹکنالوجی

(Village Structure: Agricultural Production and Technology)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 سلطنت دور میں دیہی ساخت

2.2.1 کاشتکار طبقہ

2.2.2 دیہی درمیانی طبقہ

2.2.3 معافی دار طبقہ

2.3 سلطنت دور میں زرعی پیداوار

2.3.1 فصلیں

2.3.2 آبپاشی نظام

2.4 تکنیکی ارتقاء

2.4.1 آبپاشی تکنیک

2.4.2 نہروں کا ارتقا

2.4.3 کشید کاری تکنیک

2.4.4 کپڑے اور ریشم کی تکنیک

2.4.5 کاغذ بنانے کی تکنیک

2.4.6 دھات کی تکنیک

2.4.7 تعمیراتی تکنیک

2.4.8 عسکری تکنیک

2.4.9 سائنسی ایجادات

2.5 اکتسابی نتائج
2.6 کلیدی الفاظ
2.7 نمونہ امتحانی سوالات
2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے قیام کے بعد زرعی پیداوار کی حالت میں انقلابی تبدیلیوں کی توقع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ تاہم، کچھ نئی تکنیکوں کی آمد سے آبپاشی کا نظام بہتر ہوا اور کچھ فصلوں جیسے نیل اور انگور زیادہ عام ہوئیں، جنہیں نقدی فصلیں (جن کی بازار میں مانگ ہو) کہا جاتا ہے۔ درحقیقت نمایاں تبدیلیاں، زرعی تعلقات کے شعبوں میں نظر آرہی تھیں۔ ڈی۔ ڈی۔ کوسامبی (D.D. Kosambi) کے مطابق، ان تبدیلیوں نے 'ہندوستانی جاگیرداری' میں پہلے سے موجود عناصر کو تقویت دینے سے زیادہ کچھ نہیں کیا، جب کہ دوسری طرف محمد حبیب (Mohammad Habib) نے ان تبدیلیوں کو اتنا اہم اور ترقی پسند سمجھ کر اسے 'شہری انقلاب' (Urban Revolution) کا نام دے دیا۔ ڈی۔ ڈی۔ کوسامبی نے اسلامی حملہ آوروں کے کردار کو اس معنی میں بھی سراہا تھا کہ اُنہوں نے نئی حرفتوں کو متعارف کر کے دقیانوسی رسوم کو ختم کرنے میں مدد کی تھی۔ یہ نظریہ اب پوری طرح تسلیم شدہ ہے۔ حالیہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ بعض بہت سی اہم حرفتیں تقریباً حملہ آوروں کے ساتھ ہی ہندوستان پہنچیں، جن کا ہم آئندہ صفحات میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سلطنت دور میں دیہی سماج کی ساخت اور دیہی اشرافیہ کے کردار کا مطالعہ کریں گے۔
- تیرہویں تا پندرہویں صدی کے دوران زرعی معیشت کا مطالعہ کریں گے۔
- دہلی سلطنت کے قیام کا زرعی پیداوار اور زرعی تعلقات پر کیا اثر پڑا؟ یہ جاننے کی کوشش کریں گے۔
- سلطنت دور میں قابل کاشت زمین کی توسیع، فصلوں، نہری آبپاشی نظام کے بارے میں جانیں گے۔
- سلطنت دور میں تکنیک اور صنعتوں کی ترقی کا تجزیہ کر سکیں گے۔

2.2 سلطنت دور میں دیہی ساخت (Village Structure during the Sultanate Period)

زرعی معیشت کے بارے میں بحث کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ دہلی سلطنت کے قیام کے بعد زرعی تعلقات کی نوعیت میں کیا فرق آیا اور یہ فرق کس حد تک تھا۔ یہ جاننے کے لیے 1200 سے پہلے کے زرعی نظام کو سمجھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں اس وقت اس

بحث میں نہیں پڑیں گے کہ آیا اس وقت کے سماجی اور معاشی ڈھانچے کو 'جاگیر دارانہ نظام' کہا جاسکتا ہے یا نہیں، لیکن ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ معزالدین سام/شہاب الدین غوری کے حملے کے وقت حکمران طبقے کی بنیاد دیہات ہی تھی۔ تقریباً اسی شکل میں جس طرح مغربی یورپ کا عام جاگیر دارانہ اشرافیہ طبقہ اس وقت تھا۔ مؤرخ منہاج، ہندوستانی حکمران طبقے کو رائے اور رانا اور ان کے گھڑ سوار کمانداروں کو راوت کہہ کر مخاطب کرتا ہے جس نے ابتدائی ترک سلطانوں کا سامنا کیا۔ شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے کتبات کے شواہد کی بنیاد پر راجا (رائے)، رانک (رانا) اور راؤت (راوت) کی جاگیر دارانہ درجہ بندی تقریباً ثابت ہو چکی تھی۔ ترک حکومت کے ابتدائی دور میں سلطانوں نے اس شکست خوردہ اور محکوم دیہی اشرافیہ کے ساتھ ایک طرح کا سمجھوتہ کیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، خراج، بنیادی طور پر نذرانہ کے طور پر وصول کی گئی رقم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کے دور میں، جب نذرانہ کی جگہ زمینی مالگزاری نے لے لی جو کسانوں پر سختی سے نافذ اور وصول کی گئی، تب بھی سابقہ دیہی اشرافیہ ٹیکس کی وصولی میں ایک خاص کردار ادا کرتا رہا۔ علاؤالدین خلجی کے دور کا ایک واقعہ اس موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عفیف کے مطابق جب دیپالپور کے مقطی (گورنر) غازی ملک نے وہاں کے رانا مل بھاٹی پر دباؤ ڈالنا چاہا تو اس سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر پورے سال کا زمینی ٹیکس نقدی کی صورت میں ادا کرے۔ جب رانا اپنا مطالبہ پورا نہ کر سکا تو غازی ملک نے مقدموں (گاؤں کے سربراہوں) اور چودھریوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ پہلے کی اشرافیہ، اگرچہ اب اقتدار میں نہیں تھی اور محکوم تھی، پھر بھی کم از کم چودھویں صدی کے اوائل تک، اپنے علاقے سے زمینی محصول وصول کرنے کا حق رکھتی تھی۔ انتظامیہ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ گاؤں کے سربراہ اور چودھریوں کی مدد سے براہ راست ٹیکس وصول کر لے۔

2.2.1 کاشتکار طبقہ (The Peasantry)

کاشتکار زمین کے الگ الگ حصوں پر زرعی پیداوار کرتے تھے۔ لیکن یہ زرعی معیشت مساوات پر مبنی نہیں تھی۔ کسانوں کے پاس مختلف جسامت کے زمین کے قطعات تھے۔ برنی کی تفصیل کے مطابق ایک طرف زمین کے بڑے ٹکڑوں کے مالک کھوت اور مقدم تھے تو دوسری طرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے مالک بلاہار تھے جو گاؤں میں پست حیثیت شمار کیے جاتے تھے۔ مختلف قسم کے کسانوں کے نیچے بے زمین مزدوروں کی بڑی تعداد ہو رہی ہو گی لیکن ان کی موجودگی کے بارے میں واضح معلومات بعد کے ذرائع سے ملتی ہیں نہ کہ عصری تحریروں سے۔ قابل کاشت زمین کی کثرت کے باوجود کسان جس زمین کو جوتتا تھا 'اس پر شاید ہی اس کی مالکانہ حقوق کا کوئی مسئلہ تھا'۔ اس کے برعکس اس کی اگائی ہوئی فصلوں پر اعلیٰ طبقے کے اختیارات صاف طور پر متعین تھے۔ اگرچہ کسان پیدائشی طور پر آزاد سمجھا جاتا تھا، لیکن اسے اکثر اس کی جگہ بدلنے یا اپنی خواہش کے مطابق زمین چھوڑنے کے حق سے محروم رکھا جاتا تھا۔

شمس سراج عفیف کے مطابق ایک گاؤں میں تقریباً 200 سے 300 مرد ہوتے تھے۔ برنی کے مطابق حساب رکھنے کے لیے ہر گاؤں میں ایک پٹواری ہوتا تھا۔ اس کے بہی کھاتوں کی چھان بین سے ہر وہ قانونی اور غیر قانونی ادائیگی سامنے آجاتی تھی جو کسانوں نے مالگزاری حکام کو کی تھی۔ پٹواری کوئی سرکاری ملازم نہیں بلکہ گاؤں کا اہلکار تھا۔ یقیناً اس منصب کو دہلی سلطنت نے شروع نہیں کیا تھا۔ اس طرح، ایک گاؤں کے افسر یا کلرک کا وجود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ایک انتظامی اکائی کے طور پر گاؤں کا وجود دہلی سلطنت کی انتظامیہ سے باہر تھا۔ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا ٹیکس پورے گاؤں سے ایک اکائی کے طور پر لیا جاتا تھا، ورنہ پورے گاؤں کا حساب کتاب رکھنے کے لیے کلرک کی کیا ضرورت تھی۔ اس طرح پٹواری کا وجود اور اس کے افعال کی نوعیت بھی دیہی برادری کی موجودگی کا تاثر دیتی ہے۔ علاؤالدین خلجی کی کوششوں کے باوجود کہ ہر کسان سے الگ الگ مالگزاری کا تخمینہ لگایا جائے، ایسا لگتا ہے کہ عملی طور پر گاؤں کو زمین کے ٹیکس کی ادائیگی کے لیے ایک اکائی سمجھا جاتا تھا۔ برنی کی شکایت کہ 'امیر کا بوجھ غریبوں پر پڑتا ہے' یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دیہی برادری ایک مثالی ادارہ نہیں تھی بلکہ استحصال کا ایک آلہ تھی۔

2.2.2 دیہی درمیانی طبقہ (Rural Middle Class)

کھوت، مقدم اور چودھری دیہی اشرافیہ کا اہم حصہ تھے۔ یہ طبقہ کسانوں کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ برنی کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین کی زرعی اصلاحات سے پہلے اس طبقے کے پاس محصول سے مستثنیٰ (tax free) زمینیں تھی۔ ایک طبقے کے طور پر گاؤں کے سربراہ بہت خوشحال تھے۔ برنی حاسدانہ خوشی کے ساتھ لکھتا ہے کہ علاؤالدین نے اس طبقے (کھوت، مقدم اور چودھری) پر مکمل مال گزاری عائد کر دی اور گھرائی اور چرائی محصول سے انہیں جو چھوٹ حاصل کی تھی اسے بھی ختم کر دیا۔ اس نے ان کو اپنی طرف سے کوئی ٹیکس لگانے کی بھی ممانعت کر دی۔ اس طرح اس (خصوصی) طبقے کو عام کسانوں کے برابر کر دیا۔ لیکن چونکہ یہ دیہی متوسط طبقہ زمینی مالگزاری کی وصولی کے لیے اہم تھا، اس لیے ان کے خلاف یہ سخت اقدامات زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے اور غیاث الدین تغلق نے دوبارہ توازن قائم کر دیا۔ سب سے پہلے، ان کو چرائی ٹیکس اور ان کی اپنی زمین پر ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا، لیکن انہیں اپنی طرف سے کسانوں پر اضافی محصول (cess) لگانے کا حق نہیں ملا۔ فیروز تغلق کے دور میں انہیں اور بھی بہت سی مراعات حاصل ہو گئیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ برنی ان مراعات اور اس کے نتیجے میں اس طبقے کی بڑھی ہوئی خوشحالی کو بڑی رضامندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

اس دیہی متوسط طبقے میں چودھری کا عہدہ غالباً چودھویں صدی میں ابھرا تھا۔ منہاج یا تیرھویں صدی کے کسی دوسرے ماخذ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے برنی نے چودھویں صدی کے وسط میں استعمال کی ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ چوہدری ایک سو گاؤں کا سربراہ تھا جسے وہ صدی کہتا ہے۔ لیکن چودھویں صدی کے وسط میں دیہات کے ایک گروپ کے لیے پرگنہ کی اصطلاح رائج ہو چکی تھی۔ مورخ عرفان حبیب کے مطابق، غالباً چودھری، چوراسی (84 دیہاتوں کا ایک گروہ) نامی افسر کا تبدیل شدہ نام تھا جو گرجر پرتی ہار اور چالوکیوں کے زمانے میں ہوا کرتا تھا، حالانکہ اس کا اختیار اور طاقت کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔ فیروز تغلق کے زمانے سے ان تمام متوسط طبقوں کو ایک مشترکہ عہدہ، زمیندار سے مخاطب کیا جانے لگا، جو مغل دور میں بہت زیادہ رائج ہوا۔

2.2.3 معافی دار طبقہ (Maafidars)

مذہبی افراد اور ادارے جیسے درگاہیں، مساجد اور مدارس اور حکمران طبقے پر منحصر ایسے دیگر افراد کی کفالت مال گزاری عطیات سے کی جاتی تھی۔ ان مال گزاری عطیات کو ملک، ادرار اور انعام کہا جاتا تھا۔ ان عطیات کو عام طور پر نہ تو واپس لیا جاتا اور نہ ہی منتقل کیا جاتا تھا۔

لیکن، سلطان کو ان عطیات کو منسوخ کرنے کا حق حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ علاؤالدین خلجی نے تقریباً تمام عطیات منسوخ کر دیے تھے۔ غیاث الدین تغلق کی طرف سے بھی بڑی تعداد میں عطیات منسوخ کر دیے گئے۔ تاہم، فیروز تغلق نے اس پالیسی کو تبدیل کیا اور نہ صرف پہلے شروع کیے گئے تمام عطیات کو دوبارہ جاری کیا بلکہ نئے عطیات کو بھی منظوری دی۔ سلطان کی اس سخاوت کے باوجود، عفیف کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق، ان عطیات کا کل حصہ، کل تخمینہ کردہ آمدنی (جمع) کا تقریباً 20/1 تھا۔ امرا بھی اپنے اقطاعوں سے مالگزاری عطیات فراہم کرتے تھے۔ قابل ذکر ہے کہ سلطان یہ عطیات نہ صرف خالصہ بلکہ اقطاع علاقوں میں بھی فراہم کرتے تھے۔ ان عطیات میں کاشت کی گئی زمین کے ساتھ ساتھ قابل کاشت زمین بھی شامل تھی جہاں فصلیں پیدا نہیں کی جاتی تھیں۔

2.3 سلطنت دور میں زرعی پیداوار (Agricultural Production during the Sultanate Period)

تیرہویں اور چودھویں صدی میں انسان اور زمین کا تناسب بہت سازگار تھا (یعنی بہت زیادہ زمین دستیاب تھی اور اس پر کاشت کرنے والوں کی تعداد کم تھی)۔ 1200ء کے قریب ہندوستان کی آبادی 1800ء کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ لیکن ہمیں اس بارے میں کوئی علم نہیں کہ یہ کتنا کم تھی۔ اس عہد کے ایسے کوئی آنکڑے تو دستیاب نہیں ہے لیکن تاریخی متون سے پتہ چلتا ہے کہ 16 ویں صدی کے مقابلے تیرہویں اور چودھویں صدی میں بہت کم علاقے آباد تھے۔ گنگا جمنا دوآب کے انتہائی زرخیز علاقے میں بھی بڑے بڑے جنگلات اور چراگاہیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تیرہویں صدی کے صوفی بزرگ نظام الدین اولیاء نے دہلی اور بدایوں کے درمیان شیروں کے مسافروں کو پریشان کرنے کا بیان کیا۔ برنی کے مطابق چودھویں صدی میں اس علاقے میں اتنے گھنے جنگلات تھے کہ کسانوں کی بڑی تعداد نے سلطان کی فوج سے بچنے کے لیے یہاں پناہ لی تھی۔ بابر کے زمانے (1526–30) میں بھی وسطی ہندوستان کے جنگلات کالپی اور کانپور کے جنوب میں یمنا کی بیابانوں کے پار ہاتھی گھومتے پھرتے تھے۔ لیکن اکبر کے دور حکومت (1605) کے آخر تک وسطی دوآب کا تقریباً پورا علاقہ زیر کاشت آچکا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سلاطین کے دور میں قابل کاشت زمین کے ایسے وسیع علاقے موجود تھے جن پر زراعت نہیں ہوتی تھی۔ لہذا، زراعت کرنے والے افراد پر تسلط، زمین کے ٹکڑوں پر قبضہ کرنے سے زیادہ اہم تھا۔ ہم جگہ جگہ اس صورتحال کے زرعی تعلقات پر اثرات کا مطالعہ کریں گے۔ تاہم زرعی نظام کو سمجھنے کے لیے زمین اور لوگوں کا تناسب بھی بہت ضروری ہے۔ زمین کے سازگار تناسب کا مطلب ہے کہ زراعت کافی وسیع تھی۔ وسیع زراعت کا سیدھا اور صاف مطلب، زرعی پیداوار میں اضافہ اور زیادہ زمین پر فصلیں بونا ہے۔ جبکہ دوسری طرف، گہری کاشتکاری کا مطلب قابل کاشت زمین میں اضافہ نہیں ہونا بلکہ اسی محدود دستیاب زمین پر زیادہ سرمایہ کاری کر کے زیادہ فصلیں پیدا کرنا ہے۔ یہ سرمایہ کاری زیادہ محنت، زیادہ ہل، زیادہ کھاد اور آبپاشی کے اضافی ذرائع کی شکل میں ہوتی تھی۔ لہذا، قابل کاشت زمین کی ایک بڑی مقدار کی دستیابی کی وجہ سے، دہلی سلطنت میں زراعت بہت وسیع تھی۔ زیادہ مقدار میں قابل کاشت اضافی زمین اور خالی زمین کا مطلب یہ تھا کہ جانوروں کے لیے کافی چراگاہ دستیاب تھی۔ مسالک الابصار نامی ایک عصری کتاب کے مصنف کے مطابق ہندوستان میں جانوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کی قیمت بہت کم تھی۔ عفیف کے مطابق دوآب میں کوئی گاؤں ایسا نہیں جس میں مویشیوں کا باڑہ نہ ہو۔ ان مویشیوں کے بارے کو 'کھرک' کہا جاتا تھا۔ بیلوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اناج اور دیگر سامان، ڈھونے کے لیے بیل گاڑیوں کی

بجائے بیلوں پر لادا جاتا تھا۔

2.3.1 فصلیں (Crops)

دہلی سلطنت کی زراعت کی سب سے اہم خصوصیت کسانوں کی طرف سے بڑی تعداد میں فصلوں کی کاشت تھی۔ شاید جنوبی چین کے علاوہ دنیا کے کسی اور حصے میں اتنی بڑی تعداد میں فصلیں نہیں اگائی جاتی تھیں۔ ابن بطوطہ ہندوستان میں اتنی بڑی تعداد میں فصلوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے خریف اور ربیع دونوں فصلوں کی مختلف پیداواروں کی تفصیلی وضاحت کی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں دو فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ خریف اور ربیع دونوں فصلیں ایک ہی زمین پر اگائی جاتی تھیں۔ تھکر پھیرو جو علاؤالدین خلجی کے زمانے میں دہلی کی ٹکسال کا سربراہ تھا، 1290 کے قریب، اس نے تقریباً 25 فصلوں کے نام درج کیے ہیں اور ان کی اوسط پیداوار بھی بتائی ہے۔ ہم پیداوار کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہیں کیونکہ ہمارے پاس پیمائش اور وزن کی ان اکائیوں کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں ہیں جو پھیرو بیان کرتا ہے۔ لیکن اس کی تفصیل سے مختلف فصلوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اناج کی فصلوں میں، وہ گندم، دھان، موٹے اناج (جوار، موٹھ وغیرہ) اور دالوں (اڑد، مونگ، مسور وغیرہ) کی تفصیلات دیتا ہے۔ جبکہ نقدء فصلوں میں وہ گنے، کپاس، تیل پیدا کرنے والی فصلوں، تل اور السی وغیرہ کی وضاحت کرتا ہے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ شاید آبپاشی کی سہولیات میں اضافے سے ربیع (موسم سرما کی فصلوں) کی فصلوں جیسے گنے اور گندم کے ماتحت رقبہ بڑھانے میں مدد ملی ہو گی۔ ترک فاتحوں کے ساتھ گنے سے شراب بنانے کا طریقہ بہت بڑے علاقے میں مقبول ہوا۔ برنی کے مطابق چودھویں صدی کے آغاز تک، دہلی کے ارد گرد دوآب کے علاقے میں شراب سازی ایک دیہی صنعت کے طور پر قائم ہو چکی تھی۔ یہ قدرے حیرت کی بات ہے کہ تھکر پھیرو نے اپنی تفصیل میں نیل کی کاشت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، جب کہ نیل کی پیداوار کا اندازہ اس بات سے ملتا ہے کہ اس وقت ایران کو بڑی مقدار میں نیل برآمد کی جاتی تھی۔ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ ایران میں ایل خانی حکمرانوں کی طرف سے نیل کی کاشت کو فروغ دیا جا رہا تھا تاکہ ان کا ہندوستان پر انحصار ختم ہو سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ نیل بنانے کے حوض میں چونے اور گارے کے استعمال سے بہتری آنے کی وجہ سے نیل کی کھیتی کو فروغ ملا ہو گا۔ ابن بطوطہ کی تفصیل میں ہم دہلی سلطنت میں پھلوں کی پیداوار کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کاشتکاروں کو پھلوں کی پیوند کاری کی تکنیک کا علم نہیں تھا۔ شروع میں انگور دہلی کے علاوہ صرف چند ہی جگہوں پر اگائے جاتے تھے۔ لیکن عفیف کے مطابق چودھویں صدی میں انگور کی پیداوار اتنی بڑھی کہ اس کی قیمتیں گر گئیں۔ یہ شاید دو وجوہات کی بنا پر ہوا:

1. محمد تغلق کا کسانوں کو مشورہ تھا کہ وہ اپنی فصلوں کو مسلسل بہتر بنائیں اور گندم کی جگہ گنے اور گنے کی جگہ انگور کی بوائی کریں۔
2. فیروز تغلق نے انگور کی سات اقسام کی کاشت کے لیے دہلی کے آس پاس 1200 باغات لگائے۔

تاہم ہندوستانی کسان اس عرصے کے دوران ریشم کی پیداوار (ریشم کے کیڑے پالنے کا کام) نہیں کرتے تھے اور اس عرصے کے

دوران ریشم کی پیداوار کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ صرف جنگلی یا نیم جنگلی (کیڑے سے بنے ہوئے) ریشم جیسے ٹسر، ایری اور موگا کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلی بار 1432 میں چینی تاجر ماہوان (Ma Huan, 1413–51)، بنگال میں ریشم کے کیڑوں کی پرورش کا تذکرہ کرتا ہے۔

2.3.2 آبپاشی نظام (Irrigation System)

زراعت، زیادہ تر بارش یا دریاؤں سے قدرتی آبپاشی پر مبنی تھی۔ چونکہ زراعت قدرتی وسائل پر منحصر تھی، اس لیے بارش کے پانی سے ہی خریف کی فصلیں اور موٹے اناج اگانے کا رجحان زیادہ تھا۔ ہمعصر ذرائع میں ہمیں نہروں کے ذریعے بھی آبپاشی کی تفصیلات ملتی ہیں۔ دہلی کے سلطانوں نے خود آبپاشی کے لیے نہریں کھدوائیں۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ دہلی کے سلطانوں میں تغلق خاندان کا سلطان غیاث الدین (Ghiyasuddin Tughlaq, 1320–1325) پہلا سلطان تھا جس نے نہریں کھدوائیں۔ لیکن بعد میں بڑے پیمانے پر نہروں کی تعمیر کا کام فیروز شاہ تغلق نے کروایا۔ فیروز تغلق نے دریائے جمنا سے حصار تک پانی لے جانے کے لیے دو نہریں بنائیں: رجبواہ اور الغ خانی، دوآب میں کالی ندی سے ایک نہر کھدوائی جو دہلی کے قریب جمنا سے ملتی تھی اور دریائے ستلج اور گھگر سے بھی ایک ایک نہر نکلوائی۔ یقیناً انیسویں صدی سے پہلے یہ نہروں کا سب سے بڑا جال تھا۔ نہروں سے آبپاشی کی وجہ سے مشرقی پنجاب میں زراعت کو بہت زیادہ وسعت ملی۔ اب نقد فصلوں جیسے گنے وغیرہ کی پیداوار پر بہت زیادہ توجہ دی گئی کیونکہ اسے دوسری فصلوں کے مقابلے زیادہ آبپاشی کی ضرورت تھی۔ عفیف کے مطابق، تقریباً 80 کوس/کوروہ (200 میل) پر محیط زمین کا ایک وسیع خطہ رجبواہ اور الغ خانی نامی دو نہروں سے سیر اب ہوتا تھا۔ عفیف کے مطابق مشرقی پنجاب میں جہاں پہلے صرف ایک فصل بوئی جاتی تھی، اب آبپاشی کی سہولت کے باعث خریف اور ربیع کی دو فصلیں پیدا ہونے لگیں، جس کی وجہ سے اب نہروں کے کناروں پر زرعی بستیاں قائم ہو گئیں۔ نہروں سے سیر اب ہونے والے علاقوں میں ایسی تقریباً 52 بستیاں میں بس گئیں۔ عفیف بہت پر جوش انداز میں کہتا ہے، 'کوئی ایک گاؤں بھی ویران نہیں رہ گیا اور ایک گز زمین بھی ایسی نہیں بچی جہاں کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو۔'

2.4 تکنیکی ارتقاء (Technological Development)

2.4.1 آبپاشی تکنیک (Irrigation Techniques)

اب یہ قریب قریب یقینی بات ہے کہ ایرانی پہیہ (Persian Wheel) یا دندانے دار ساقیہ نے ہندوستان میں اپنی موجودہ شکل اسی دوران اختیار کی تھی۔ چھٹی صدی سے پہلے نوریہ (یعنی ایک عمودی حالت میں کھڑا پہیہ جس کے ڈنڈوں کے سروں پر برتن بندھے ہوں) ساقیہ یا ایسے پہیہ میں تبدیل ہو گیا جس پر برتنوں یا گھڑوں کا ہار، پڑا ہوتا تھا۔ لیکن یہ پہیہ اس کے بعد بھی صرف انسانی بازو کے زور سے ہی چل پاتا تھا۔ اسے بیلوں کی مدد سے گھمانا اُسی وقت ممکن ہو سکا جب ایک مسطح پہیہ کو، کھینچنے کے کام آنے والی بلی کی مدد سے دائرہ میں گھمایا جا سکتا ہو اور وہ دوسرا پہیہ گراری کے عمل (pin drum gearing) کے ذریعہ کنویں میں کھڑے پہیے کو چلا سکے۔ مغربی ایشیا میں اس طرز کی

گراری دار مشین کی موجودگی کا اندازہ گیارہویں صدی عیسوی کی ایک تحریر میں اُس کے ذکر سے لگایا جاسکتا ہے اور بغداد میں بنی ہوئی بارہویں صدی کی ایک تصویر میں اُس کو دیکھا بھی جاسکتا ہے۔ اگلے دو یا تین سو برسوں میں یہ مشین ہندوستان پہنچ گئی کیونکہ بابر اس کا تفصیلی ذکر کرتا ہے۔ اُس وقت تک گراری دار پہیے اور برتنوں یا گھڑوں کا ہار اس مشین کے (جو پنجاب میں استعمال ہو رہی تھی) حصے بن چکے تھے۔ اس ساقیے نے قدرتی طور پر دریائے سندھ کی وادی میں کنوے کے پانی سے آبپاشی کو فروغ دیا۔ یہ صورت حال انیسویں صدی تک جاری رہی۔

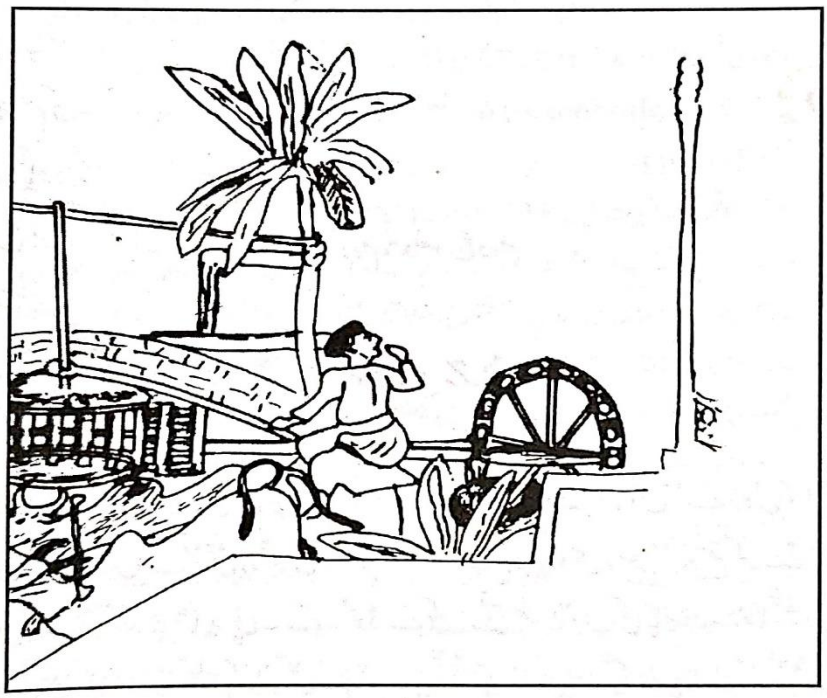

تصویر 2.2۔ گراری دار ساقیہ (رہٹ یا پرشین وھیل) مصور سانوال، اکبر کی کارگاہ

ماخذ: عرفان حبیب، عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان: ایک تہذیب کا مطالعہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2010، صفحہ 92۔

2.4.2 نہروں کا ارتقا (The Development of Canals)

نئے قسم کی عمارتی کاریگری اور مسالوں کی وجہ سے پہلے سے زیادہ مستحکم بند اور پشتے بنانا ممکن ہو سکا۔ اس کے ساتھ لمبی دوریوں تک نہریں نکالنا بھی شروع ہو گیا۔ شمالی ہند میں اس قسم کی نہروں کا سلطنت کے عہد سے پہلے نکالے جانے کا پتہ نہیں ملتا ہے۔ فیروز شاہ تغلق (دور حکومت 1351 تا 88) نے خاص طور پر نہروں کا ایک پورا سلسلہ تیار کر دیا تھا جو ستلج، گھاگھرا اور کالی ندی سے نکالی گئی تھیں۔ اُس نے دو نہریں جمنا سے بھی نکلوائیں جن کو جدید عہد کی مغربی جمنا نہر (West Jamuna Canal) کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے۔ چکنی مٹی (gypsum) اور چونے کا بطور گارا استعمال کئے جانے کی بنا پر نیل بنانے کے طریقہ میں خاصی بہتری آگئی۔ نیل نکالنے کی غرض سے ایسے عریض کنڈے بنانا ممکن ہو گیا جن کی اندرونی سطح واٹر پروف (water proof) یعنی پانی کا اثر قبول نہ کرنے والی ہوتی تھی۔ اب تک اس قسم کے نیل کے کنڈے جن کا جائزہ لیا جا چکا ہے پندرہویں صدی کے بعد کے ہی نکلے ہیں، جہاں تک عہد قدیم سے تعلق رکھنے والی جگہیں ہیں وہاں ایسے کنڈے نہیں ملے ہیں۔

2.4.3 کشید کاری تکنیک (Distillation Technique)

ایک اور میدان جہاں نئی مہارتوں نے زرعی پیداوار سے تعلق رکھنے والی کسی صنعت کو متاثر کیا، عطر یا شراب کی کشید کا کام تھا۔ آثار قدیمہ کے ماہروں نے گندھار (شمالی مغربی پاکستان) میں کشید کے مقصد سے بنائی گئی ایسی بھٹیاں ڈھونڈ نکالی ہیں جو عیسوی سنوات کی ابتدائی صدیوں میں چالو تھیں، لیکن زیادہ ترقی یافتہ اور ستھری بھٹی (جس میں مرغ کے سر سے مماثل ایک ٹونٹی بھی لگی ہو) وہ تھی جو تیرہویں صدی عیسوی میں مغربی ایشیا سے ہندوستان پہنچی۔ اب یہ بھٹیاں دہلی اور آس پاس کے علاقہ میں گنے کے رس کی شراب تیار کرنے کے لئے استعمال ہونے لگی تھیں۔ پندرہویں صدی کے آتے آتے ایسی بھٹیوں کے ذریعہ بنگال میں چاول اور کھوپرے کے رس کی شراب بھی تیار ہونے لگی جو زیادہ نشہ آور تھی۔

2.4.4 کپڑے اور ریشم کی تکنیک (Textile and Silk Techniques)

ہندوستان کی سب سے بڑی یعنی کپڑا پیدا کرنے والی صنعت کو اس دوران، دو چینی ایجادوں کے یہاں آنے سے بہت فائدہ ہوا۔ یہ ایجادیں تھیں: سوت کاتنے کا چرخہ اور پاؤں سے چلنے والی لوم یا بنکر کا راچھ، جس میں ایک پائدان لگا تھا۔ ایک تیسری ایجاد نے، جو شاید مقامی تھی، اُس صورت حال کو مزید تقویت پہنچائی۔ یہ ایجاد تھی کپڑے پر چھپائی کرنے کے اسلوب کی۔ پہلی صدی عیسوی میں چرخہ کی چین میں موجودگی ثابت ہے لیکن ایک ہزار سال تک یہ وہاں سے باہر نہیں نکل سکا۔ ایشیا اور ایران کے راستہ پہنچا وسط میں ہندوستان پہنچنے کے ہر حصہ میں پھیل گیا۔ ایک تحریر عسامی کی 'فتوح بار ذکر 1350 میں ملتا ہے پندرہویں صدی کے اواخر کام کو بہتر بنانے کے لئے

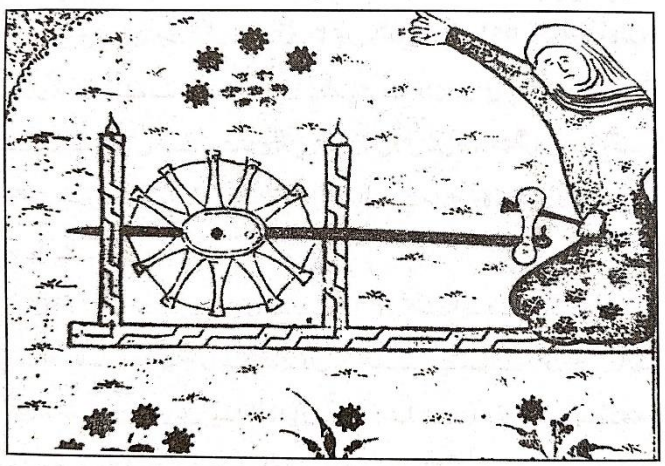

تصویر 2.3۔ گھریلو چرخے کی پہلی معروف ہندوستانی خاکہ کشی، مفتاح الفضلا، Br.Lib.Ms پندرہویں صدی برٹش میوزیم
ماخذ: عرفان حبیب، عہد وسطیٰ کا ہندوستان: ایک تہذیب کا مطالعہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2010، صفحہ 95۔

چرخہ ہندوستان تک وسط تھا۔ چودھویں صدی کے کے بعد یہ تیزی سے ملک ہندوستان میں لکھی ہوئی السلاطین' میں اس کا پہلی اور اس کا پہلا تصویری خاکہ کا ہے۔ اسی طرح بنائی کے بنگر کے راچھ یا لوم میں پائدان لگا دیا گیا جس کا پہلا ذکر 69-1468ء میں ملتا ہے جو اُسی لغت میں ہے جہاں چرخہ کا تصویری خاکہ دیا گیا ہے۔ جہاں تک کپڑے کی چھپائی کا تعلق ہے، گو کہ عہد قدیم کے مٹی سے بنے چھپائی کے سانچے ملتے ہیں لیکن اُن کی کمزور ساخت کے پیش نظر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ انہیں کپڑا چھاپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہوگا۔ اس بات کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں ہے کہ عہدِ قدیم میں کپڑے کی چھپائی مٹی کے سانچوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ لیکن جب ہم چودھویں صدی کی طرف رخ کرتے ہیں تو ہمیں تحریروں میں چھیپہ (چھپائی کرنے والا) اور چھاپہ (یعنی چھاپنا ایسے الفاظ پارچہ بافی کے تعلق سے استعمال ہوتے ملنے لگتے ہیں جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اُس زمانہ میں لکڑی کے سانچوں سے

کپڑے کی چھپائی کا کام شروع ہو چکا تھا۔ یہ حرفت تیزی سے پھیلی اور سولہویں صدی آنے تک چھپا ہوا کپڑا، جو اب چھینٹ (*Chhint*) کہلانے لگا تھا، باہر کے ملکوں کو جانے والے سب سے اہم ہندوستانی کپڑوں میں شمار کیا جانے لگا تھا۔

گو کہ زمانہ قدیم سے ہندوستان میں ریشم سے تعلق رکھنے والی کئی ایسی دستکاریاں موجود تھیں (مثلاً ایری، موگا اور ٹسر) جو پوری طرح سے گھریلو پیداوار کا حصہ نہیں مانی جائیں گی لیکن ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت کا بنگال سلطنت کے زمانہ یعنی پندرہویں صدی سے پہلے تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ یہ پوری طرح صاف نہیں ہے کہ یہ دستکاری چین سے یہاں آئی تھی یا ایران سے۔ لیکن اگلی دو صدیوں میں بنگال دنیا کا سب سے بڑا ریشم برآمد کرنے والا علاقہ بن گیا تھا۔

2.4.5 کاغذ بنانے کی تکنیک (Paper Making Techniques)

نامعلوم وجوہات کی بنا پر، کاغذ بنانے کی صنعت کافی تاخیر سے ہندوستان پہنچی۔ یہ ایک قطعی نئی چیز تھی۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ چینی سیاحوں، مثلاً یی۔ چنگ (671-95ء) کو کاغذ استعمال کرتے دیکھنے کے باوجود ہندوستانی کیونکر پام کے پتوں، پیڑ کی چھال اور کپڑے کو لکھنے کے لئے استعمال کرتے رہے۔ تیرہویں صدی میں دہلی میں کاغذ بننا شروع ہو چکا تھا۔ چودھویں صدی کے آتے آتے یہ اتنا عام ہو گیا کہ حلوائی اپنے سامان کو کاغذ میں رکھ کر فروخت کرنے لگے تھے۔

2.4.6 دھات کی تکنیک (Metallurgy Techniques)

چودھویں اور پندرہویں صدیوں کے دوران، ایک نئی تکنیک کی مدد سے کھانے کا سامان پکانے اور کھانے کے لئے پیتل کے مہنگے برتنوں کے بجائے تانبے کے سستے برتنوں کا استعمال ممکن ہو گیا۔ اس میدان میں ایک اہم کامیابی یہ تھی کہ جستہ (zink) کو خام معدن سے علیحدہ کیا جا سکا۔ زمانہ قدیم میں زاور کی کانوں سے جستہ نکالا جاتا تھا لیکن یہ تانبے، سیسہ اور چاندی کی خام دھول کے ساتھ ملا ہوا نکلتا تھا۔ اسی لئے عہد قدیم کا پیتل (جو جستہ اور تانبے کا مرکب یعنی alloy ہے) بہت کم ملتا ہے۔ لیکن چودھویں صدی تک آتے آتے زاور میں جستہ کو بھپارے (distillation) کے ذریعہ علیحدہ کرنا شروع ہو گیا تھا۔ اب تک یہ صاف نہیں ہے کہ ہندوستان میں اس قاعدہ کی دریافت، چین کی ایسی ہی پیش رفت سے پہلے ہوئی تھی یا بعد میں۔ ابوالفضل (1595ء) نے جستہ کا ذکر ایک نئی دریافت شدہ دھات کے طور پر کیا ہے جس سے، اُس کے مطابق، عہد قدیم کے لوگ ناواقف تھے۔

2.4.7 تعمیراتی تکنیک (Construction Techniques)

تیرہویں صدی میں عمارت بنانے کے طریقوں کی نوعیت میں ایک اہم تغیر پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ قدیم ہندوستان میں پتھر کے ٹکڑوں اور اینٹوں سے بنی ہوئی عمارتیں تقریباً گلی طور پر کڑیوں یا شہتیروں کے اصول (trabeate system) کے مطابق بنتی تھیں۔ ان عمارتوں میں چھتیں کھمبوں پر شہتیر رکھ کر بنائی جاتی تھیں یا پھر اُن میں مخروطی دیواریں ہوتی تھیں جو اوپر جا کر آپس میں مل کر مناروں کی

شکل اختیار کر لیتی تھیں جیسا کہ ہم باب 1.6 میں دیکھ چکے ہیں، اس قسم کی بڑی عمارتوں کو بنانے کے لئے بڑے بڑے پتھروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ان میں اینٹوں کا استعمال کم پسند کیا جاتا تھا خاص طور پر اس لئے کہ اُن کی چنائی کو مضبوط بنانے کے لئے کسی چپکنے والے مسالہ کا استعمال عام نہیں ہوا تھا لیکن سلطنت کے قیام کے بعد محراب اور گنبد بنانے کے طریقے کے ساتھ کھریہ مٹی اور چونے کی آمیزش سے بنے گارے (mortar) کا استعمال عام ہو گیا۔ اس طرح عمارتوں میں اینٹوں اور ملبہ (rubble) کا استعمال زیادہ بڑے پیمانہ پر ممکن ہو سکا۔ یوں نہ صرف بڑی عمارتوں اور پبلک کے استعمال میں آنے والی تعمیرات کی نوعیت میں زبردست تبدیلی آگئی بلکہ متوسط درجہ کے مکانات اور بازاروں کی ساخت بھی متاثر ہوئی۔ رنگین روغنوں سے مزین اینٹوں یا کھپریل (glazed tiles) کا استعمال قدیم ہندوستان میں بہت کم تھا۔ یہ سب سے پہلے وادی سندھ کی تہذیب میں ملتی ہیں اور اس کے بعد گشان عہد میں نظر آتی ہیں۔ لیکن تیرہویں صدی کے بعد نئی حرفتوں کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی، نیلی مچھلی کی پشت سے مشابہ دھاری دار اینٹیں اور برتن ہندوستان میں بنائے جانے لگے۔

2.4.8 عسکری تکنیک (Military Technique)

شہ سواری سے تعلق رکھنے والی تین ایجادیں، مجوف ساخت کی کانٹھی، لوہے کی رکاب اور لوہے کے نعل نے شمالی ہند میں سلطانوں کی فوجوں کی کارکردگی بڑھادی تھی۔ اب یہ ئی چیز میں جنوبی ہند میں بھی پہنچنے لگیں۔ لوہے کا نعل سب سے پہلے تیرہویں صدی کے اواخر کے ہو شالیہ سنگ تراشی کے نمونوں میں نظر آنا شروع ہوا۔ لیکن اس سے پہلے کے نمونوں میں یہ غائب ہے۔ لوہے کی رکاب بھی اُس زمانہ کے ہو شالیہ سنگ تراشی کے نمونوں میں خال خال نظر آتی ہے لیکن زیادہ تر جگہوں پر رکاب چھڑے یا لکڑی کی بنی ہوئی ملتی ہے۔ ہو شالیہ سنگ تراشی میں مجوف کانٹھی 1250ء کے بعد ہی دیکھنے کو ملی۔ شورہ کے استعمال پر مبنی آتش بازی جو چین میں ایجاد ہو چکی تھی، 1400ء کے قریب ہندوستان پہنچ گئی اور پندرہویں صدی میں بارود سے چلنے والے راکٹ دکن میں استعمال ہو رہے تھے اور شاید شمالی ہند میں بھی۔ 1526ء میں بابر نے پانی پت کی لڑائی میں توپوں اور تفنگوں کو بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ جنگ میں ان آلات کے استعمال کی ترکیب اُس نے عثمانی ترکوں سے سیکھی تھی۔

2.4.9 سائنسی ایجادات (The Scientific Inventions)

اس کے ساتھ بعض اہم قسم کے آلات جن سے چیزوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا مثلاً مختلف مقاصد کے لئے کام آنے والے اسطرلاب اور سورج کی گھڑی، دونوں، اب ہندوستان میں بتدریج سنورتی ہوئی درجہ بندی (refined graduation) کے ساتھ استعمال میں آنے لگے تھے۔ فیروز تغلق نے دہلی میں ایک اونچے مینار پر آسمان کے مشاہدہ کی غرض سے آلات لگوائے تھے۔ اُن میں ایک ایسا اسطرلاب بھی تھا جو اسکندریہ کے مشہور اسطرلاب (جس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ یونانی بولنے والوں کی دین ہے) کی نقل تھا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں سورج کی گھڑی اور اسطرلاب سمندری سفر میں کام آتے تھے۔ تیرہویں صدی کے آتے آتے چینیوں کا بنایا ہوا قطب نما، جس کو تیرتی ہوئی سوئی (floating needle) بھی کہا جاتا تھا، ہندوستانی سمندروں میں چلنے والے جہاز استعمال کر رہے تھے۔

2.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے دہلی سلطنت کے دور میں زرعی نظام، زرعی پیداوار، آبپاشی کے ذرائع اور کسانوں اور زمین سے متعلق درمیانی طبقے کا مطالعہ کیا۔ اس دور میں قابل کاشت زمین کی ایک بڑی مقدار زراعت کے لیے استعمال میں نہیں تھی۔ دوآب کے علاقے میں دو فصلیں اگانے کا رواج تھا۔ مصنوعی آبپاشی کا بنیادی ذریعہ نہریں تھیں۔ دیہات کو زمین کے اعلیٰ حکام (کھوت، مقدم اور چودھری) اور عام کسانوں (رعیت) کی مختلف سطحوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

2.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

پٹواری	:	پٹواری گاؤں کا ایک ملازم تھا جو کتابیں اور حسابات رکھتا تھا۔
بلاہار	:	(*balahar*) گاؤں میں سب سے نچلی سطح پر تھا جو زمین کے چھوٹے ٹکڑے کا مالک تھا۔
نقد فصلیں	:	وہ فصلیں جو بنیادی طور پر بازار میں فروخت کے مقصد سے اگائی جاتی تھیں، جیسے گنا، کپاس اور نیل وغیرہ۔
کشید	:	وہ عمل جس میں گرم کر کے بھاپ کو پیدا کیا جاتا ہے اور اس بھاپ کو ٹھنڈا کر کے مائع حاصل کیا جاتا ہے۔
کوروہ	:	(*kuroh*) فاصلے کی پیمائش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، 1 کوروہ=2.5 میل
خریف اور ربیع	:	خریف، خزاں کی فصل اور ربیع موسم سرما کی فصل کو کہتے ہیں۔
کھرک	:	(*kharak*) مویشیوں کا باڑا
رعیت	:	عام کسان

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سلطنت کے دور میں دوآب میں ایک سال میں کتنی فصلیں کاشت کی جاتی تھیں؟
2. ریشم کے کیڑے کس صدی سے ہندوستانی کسانوں نے پالنے شروع کیے؟
3. پٹواری کسے کہتے تھے؟
4. بلاہار کون تھے؟
5. نقد فصلوں سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
6. کشید کا عمل کیا ہوتا ہے؟
7. کوروہ کتنے میل کا ہوتا ہے؟

8. خریف کی ایک فصل کا نام بتائیے؟
9. کھرک سے کیا مراد ہے؟
10. رعیت کسے کہا جاتا تھا؟

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. عہد سلطنت میں کاشتکار طبقہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. سلطنت دور میں فصلوں اور پیداوار پر نوٹ لکھیے۔
3. آبپاشی نظام پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. کپڑے اور ریشم کی تکنیک پر نوٹ لکھیے۔
5. دیہی درمیانی طبقے پر پر نوٹ لکھیے۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سلطنت دور میں دیہی ساخت پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. دہلی سلطنت میں زرعی پیداوار کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔
3. سلطنت دور میں صنعتی اور تکنیکی ارتقا کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

2.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Deloche Jean, *Military Technology in Hoysaḷa Sculpture*: *Twelfth and Thirteenth Century*, Sitaram Bhartia Institute of Scientific Research, New Delhi, 1989.
2. Habib, Irfan, *Economic History of India A.D. 1206–1526*, Tulika Books, Delhi, 2016.
3. Habib, Irfan, *Economic History of Medieval India*, *1200–1500*, History of Science Philosophy and Culture, D.P. Chattopadhyay Series, Longman/Pearson, Delhi, 2011.
4. Habib, Irfan, *Medieval Technology Exchanges Between India and the Islamic World*, *Viveka Publications*, Aligarh, 1985.
5. Khan, Iqtidar Alam, *Gunpowder and Firearms*: *Warfare in Medieval India*, Oxford University Press, Delhi, 2004.
6. Kosambi, D.D., *An Introduction to the Study of Indian History*, Bombay, 1956.
7. Needham, Joseph, *Science and Civilisation in China*, Volume IV, *Physics and Physical Technology*. Part 1, Physics, Cambridge University Press, New York, 1962.
8. Raychaudhuri, Tapan and Irfan Habib, *The Cambridge Economic History of India*, Part 1 Cambridge University Press, Delhi, 1982.
9. عرفان، حبیب، عہد وسطی کا ہندوستان: ایک تہذیب کا مطالعہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،

اکائی 3۔زرعی محصول اور طریقۂ تشخیص وادائیگی

(Agrarian Taxation and Mode of Assessment and Payment)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 مالیاتی وسائل کی تقسیم

3.2.1 خالصہ اور اس کی معاشی افادیت

3.2.2 اقطاع کی ابتداء اور اس کے مضمرات

3.3 زمینی محصول اور اس کی وصولیابی

3.3.1 علاوالدین خلجی کے زرعی اقدامات اور اس کی اہمیت

3.3.2 محمد بن تغلق کے زرعی اقدامات اور اس کے نتائج

3.4 زرعی نظام محصول کا ڈھانچہ

3.5 محصول کی ادائیگی کا طریقہ

3.6 اکتسابی نتائج

3.7 کلیدی الفاظ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید (Introduction)

غوریوں کے ذریعے شمالی ہندوستان کی فتح اور دہلی سلطنت کے قیام نے نہ صرف موجودہ سیاسی ڈھانچے کو تبدیل کیا بلکہ معاشی معاملات میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ فاتحین جامع تصورات کے ساتھ آئے تھے جس میں ٹیکس یا محصلات اور سکوں کا نظام وغیرہ سرفہرست ہے۔ وہ لوگ اس بات کو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ پرانے اور موجودہ نظم وضبط مکمل طور پر فوراً تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے اور انہوں نے ابتدائی دور میں پرانے نظام محصول کو کچھ ترمیم کے ساتھ آگے بڑھایا، تبدیلی کا یہ سلسلہ پندرہویں صدی کے اختتام تک دیکھنے کو ملتا ہے۔ محمد حبیب کے مطابق دہلی سلطنت کی قیام کے نتیجے میں واقع ہونے والی معاشی تبدیلیوں نے ایک ایسے نظام کو جنم دیا جو موجودہ نظام سے کافی بہتر تھا۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ تبدیلیاں اتنی نمایاں اور واضح تھیں کہ دہلی سلطنت کے قیام کو 'شہری انقلاب' اور 'دیہاتی انقلاب' کہنا غلط نہیں ہوگا۔ ڈی. ڈی. کوسامبی کا ماننا ہے کہ نئی تکنیکوں کے استعمال اور منتقلی سے روایتی رسم ورواج کو 'اسلامی حملہ آوروں' نے تباہ وبرباد کر دیا۔ لیکن انہوں نے تبدیلیوں کو ہندستانی 'جاگیرداری' میں پہلے سے موجود عناصر کو تقویت بخشنے والے عنصر قرار دیا۔

سلطنت کی علاقائی توسیع اور استحکام کے لیے مضبوط انتظامی اور محصولاتی نظام کے قیام کی ضرورت تھی۔ زرعی ٹیکس یا محصول دہلی سلطنت کے لیے آمدنی کا بنیادی ذریعہ تھا۔ ہندوستانی معاشرے کی زرعی نوعیت جہاں زرعی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی، وہاں زرعی پیداوار پر ٹیکس ریاست کی آمدنی کا ایک مستحکم اور قابل اعتماد ذریعہ تھا۔ تیرہویں صدی کے دوران سلاطین دہلی نے بہت سے علاقوں کو فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔ نئے مفتوحہ شدہ علاقوں کو ابتدائی طور پر مختلف کمانڈروں میں تقسیم کر دیا گیا، جو خود کے لیے اور اپنے فوجی اخراجات کو چلانے کے لئے لوٹ مار کر یا مغلوب دیہاتی اشرافیوں سے خراج وصول کرتے تھے۔ پچھلے حکمرانوں کے برعکس، سپاہیوں کو نقد میں ان کی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ وہ علاقے جو محصول یا خراج ادا نہیں کرتے تھے، اُنہیں "مواس" کہا جاتا تھا اور ان سے محصول حاصل کرنے کے لئے ان پر فوجی کارروائی کے ذریعے ادائیگی کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ایک طریقہ کار بیک وقت محصولات کی وصولی اور تقسیم کو متعارف کرانا بہت ضروری تھا۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کا نظام محصول، بالخصوص زرعی محصول سے متعارف ہونگے۔
- زرعی محصولات کی تخمینہ کاری کے طریقوں کو سمجھ پائیں گے۔
- سلاطین دہلی کے زمینی محصولات کے نظام کی نوعیت اور اس کے خرچ سے متعارف ہوں گے۔
- سلاطین دہلی کے تحت محصولات کے وسائل اور اس کی تقسیم کے طریقہ کار کے متعلق جان سکیں گے۔

3.2 مالیاتی وسائل کی تقسیم (Allocation of Financial Resources)

آمدنی کے وسائل کی تقسیم سے مراد حکومت کے مختلف ذرائع سے پیدا ہونے والی آمدنی کی تقسیم اور انتظام ہے۔ اس عمل میں اس بات کا تعین کرنا شامل ہے کہ مخصوص مقاصد یا اہداف کے حصول کے لیے مختلف شعبوں، منصوبوں، یا اخراجات میں آمدنی کو کس طرح تقسیم کیا جانا چاہیے تاکہ مخصوص مقاصد حاصل ہو سکیں۔

3.2.1 خالصہ اور اس کی معاشی افادیت (Khalsa and Its Economic Utility)

خالصہ زمین سے مراد براہ راست سلطان کی ملکیت والی زمین ہے۔ ان زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کو شہنشاہ کے ذاتی خزانے میں جمع کیا جاتا تھا۔ آمدنی شاہی دربار اور خاندان کے مختلف خرچوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ زرخیز اور آسانی سے زیر انتظام علاقے عموماً خالصہ میں شامل کئے جاتے تھے۔ علاوالدین خلجی کے دور میں ان کا رقبہ کافی حد تک بڑھ گیا۔ لیکن اس بات کے بہت زیادہ امکانات ہیں کہ دہلی اور اس کے ارد گرد کے مضافات سمیت دوآب بھی خالصہ میں شامل تھا۔ التمش کے زمانے میں، تبرہندہ (بھٹینڈا) بھی خالصہ میں شامل کیا گیا تھا۔ علاوالدین خلجی کے دور حکومت میں خالصہ وسطی دوآب کے ساتھ ساتھ روہیل کھنڈ کے کچھ علاقے بھی شامل کے گئے تھے۔ مگر فیروز شاہ تغلق کے دور میں، خالصہ غالباً رقبہ کے لحاظ سے کم ہو گیا تھا۔

3.2.2 اقطاع کی ابتداء اور اس کے مضمرات (Origin of *Iqta* and its implications)

اقطاع عربی زبان کا لفظ ہے جو ایک انتظامی علاقائی اکائی کو ظاہر کرتا ہے، جو ایک صوبہ کے مترادف ہوتا ہے۔ یہ زمین کی عطیہ یا بخشش کے حوالے سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اقطاع نظام ابتدائی طور پر محمد غوری نے شروع کیا تھا، لیکن ہندوستان میں اسے پہلی بار سلطان التمش نے مؤثر طور پر قائم کیا۔ اس نظام میں دہلی سلطنت کے زیر اہتمام زمین کو مختلف بڑے اور چھوٹے علاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا جو اقطاع کہلاتے تھے۔ اقطاع ایک علاقائی تفویض تھا اور عطیہ پانے والے کو مکتی یا ولی کہا جاتا تھا۔ اقطاع نظام کی بہترین تعریف گیارہویں صدی کے ایک سلجوقی سیاستدان نظام الملک طوسی نے کی ہے۔ طوسی کی تعریف کے مطابق، اقطاع ایک محصول کی تفویض تھی جو سلطان کی خوشنودی پر مقتی کو دیا جاتا تھا۔ یہ اقطاع سپاہیوں، افسران وغیرہ کو تنخواہ کی ادائیگی کے طور پر تفویض کیا جاتا تھا۔ اقطاعدار تفویض کا حامل ہوتا تھا اور اس کی ذمہ داریوں میں اپنے زیر اہتمام علاقوں میں امن قائم کرنا، اور ریاست کے محصولات جمع کرنے کے ساتھ ساتھ فوجی ٹکڑیوں کو ہمیشہ تیار رکھنا شامل تھی۔ اقطاعدار کو اقطاع ہمیشہ وراثت میں نہیں ملتی تھی اور سلطان جب چاہتا تھا، اقطاع کو واپس لے سکتا تھا۔ اقطاعدار کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بھی منتقل کیا جاتا تھا۔

سلطان بلبن (86-1266) نے کچھ ترامیم متعارف کرانے کی کوشش کی۔ اقطاع داروں کے اختیارات کو محدود کر دیا اور ہر ایک مقتی کے ساتھ ایک خواجہ (حساب دار) کی تقرر کو یقینی بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ سلطنت اب اقطاء اور مقتی کے اخراجات کی اصل آمدنی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اقطاع انتظامیہ میں اصل مداخلت علاوالدین خلجی کے دور میں ہوئی۔ مرکزی مالیاتی محکمہ (دیوانِ وزارات)

نے ہر ایک اقطاع سے آمدنی کا تخمینہ تیار کروایا۔ مالیاتی جانچ پڑتال بہت سخت تھی، سزائیں سنگین تھیں، منتقلی باقاعدگی سے ہوتی تھیں، اور مختلف طریقوں سے اقطاع کی آمدنی میں اضافہ (توفیر) عموماً کیا جاتا تھا۔ غیاث الدین تغلق (25-1320) نے کچھ اعتدال متعارف کرایا۔ مرکزی وزارت خزانہ کی اوسطاً آمدنی میں اضافہ سالانہ دس یا گیارویں حصے سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ مقطعدار کو ان کی منظور شدہ تنخواہوں کے ساتھ ساتھ اقطاع سے آنے والے کل آمدنی کا دسواں یا بیسواں حصہ رکھنے کی اجازت تھی۔

مرکزی مداخلت کی کوشش محمد بن تغلق (51-1325) کے دور میں اپنے عروج کو پہنچی۔ کئی صورتوں میں ایک ولی اور ایک امیر کو ایک ہی علاقہ کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ ولی کو مالی یا مالگزاری اکٹھا کرنا ہوتا تھا اور اس میں سے اپنی تنخواہ کی کٹوتی کرنے کے بعد باقی مرکزی حکومت کے خزانے میں بھیجنا ہوتا تھا۔ امیر یا کمانڈر کا محصول کی وصولی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اُنہیں اور اُن کے فوج کی تنخواہ نقد میں دی جاتی تھی۔ لیکن اس اقدام سے محمد بن تغلق کے کمانڈر مشتعل ہو گئے اور محمد بن تغلق کے لیے سیاسی مسائل پیدا کر دیے۔ اس لیے فیروز شاہ تغلق نے مراعات دینے کا فیصلہ کیا اور تفویضات کو وراثتی بنا دیا۔ امرا کی نقد تنخواہوں میں اضافہ کیا اور محصول کے نئے تخمینے (محصل) تیار کیے جس کو جمع کا نام دیا گیا۔

3.3 زمینی محصول اور اس کی وصولیابی (The Land Revenue and Its Collection)

زمینی محصول جس سے ہندوستان کے نئے حکمران واقف تھے وہ خراج تھا۔ خراج بنیادی طور پر زمین کی پیداوار میں بادشاہ کا حصہ ہوا کرتا تھا نہ کہ زمین پر کرایہ۔ یہ خراج یکمشت کاشتکاروں کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف، وہ باغی علاقے (مواس) جہاں ایسے انتظامات ممکن نہیں ہوتے تھے، خراج کو فوجی چھاپے ماری کے ذریعے سے وصول کیا جاتا تھا۔ دہلی سلطنت سے جڑے ہوئے ماخذ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ علاوالدین خلجی (1316-1296) کے دور سے پہلے خراج کی تشخیص اور وصولی کو منظم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔

3.3.1 علاؤالدین خلجی کے زرعی اقدامات اور اس کی اہمیت

(Alauddin Khilji's Agricultural Initiatives and Their Significance)

علاؤالدین خلجی کی کوشش تھی کہ محصولات کی وصولی کو بڑھایا جائے اور محصولات کو براہ راست جمع کیا جائے اور بچولیوں کو دیے جانے والے عنایت کو کم کیا جائے۔ محصول زرعی پیداوار کو ذہن میں رکھ کر طے کیا جاتا تھا لیکن اس کی وصولیابی نقدی کی جاتی تھی۔ برنی نے لکھا ہے کہ ریاستی وصول کار محصول کا مطالبہ اتنی سختی سے کرتے تھے کہ کسانوں کو مجبور ہو کر اپنی زرعی پیداوار کو فوراً خیابان کے کنارے فروخت کرنا پڑتا تھا۔ ایک اور جگہ برنی کہتے ہیں کہ علاؤالدین خلجی نے دوآب کو خالصہ میں لایا اور وہاں سے حاصل ہونے والا ٹیکس (محصول) سپاہیوں کی نقد تنخواہوں کی ادائیگی پر خرچ کیا۔ برنی کا ایک متضاد بیان بھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ سلطان نے حکم دیا کہ کسانوں سے محصول کو جنس میں وصول کیا جائے نہ کہ نقدی میں۔ بقول عرفان حبیب، ایسا لگتا ہے کہ دوآب میں کچھ ہی حصے تھے جو خالصہ میں آتے تھے۔ وہاں

سے سلطان اپنے ملک کے لیے اناج حاصل کرنا چاہتا تھا اور بصورت دیگر وصولی عام طور پر نقد میں ادا کی جاتی تھی۔

'پیمائش' ایک پرانا نظام تھا، لیکن بظاہر شمالی ہندوستان میں اس کا استعمال بتدریج کم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ علاقوں میں پہلے کے حکمرانوں، جیسے غیاث الدین بلبن نے دوبارہ نافذ کیا ہو، کیونکہ برنی اسے مکمل طور پر نامعلوم نظام کے طور پر نہیں دیکھتا ہے۔ تاہم، وسیع علاقے پر اس کا منظم اطلاق علاؤالدین کا ایک اہم قدم تھا۔ دوآب کو خالصہ کے تحت لانے، اور کاشتکاروں کے ساتھ براہ راست تعلقات قائم کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تمام بچولیوں کو ہٹا دیا گیا تھا۔ طویل عرصے سے دیہی علاقوں میں ثالثوں کی ایک درجہ بندی تھی، جس میں رائے، رانا، راوت سر فہرست تھے۔ یہ سبھی سردار کہلاتے تھے۔ ایک سردار بعض اوقات زمین کے کافی حصے کو کنٹرول کرتا تھا جو اس کے قبیلے اور دوسرے حامیوں کو زمین کی آمدنی جمع کرنے کے لئے تقسیم کیا جاتا تھا۔ گاؤں کی سطح پر گاؤں کا سربراہ ہوتا تھا جسے چوہدری یا مقدم کہا جاتا تھا۔ جیسے جیسے ترک سلطنت نے دوآب میں خود کو مضبوط کیا، رئیس اور رانوں کی طاقت اور اختیارات کم ہوتے گئے۔ اس عمل میں ایک نئے بچولیہ کا اضافہ ہوا جو پرگنہ یا شک (ضلع) کی سطح پر کام کرتے تھے۔ بظاہر یہ وہ لوگ تھے جنہیں برنی نے خود کہا اور جن کے لیے زمیندار کا لفظ پہلی بار امیر خسرو نے استعمال کیا۔ زمیندار کا لفظ بعد میں ہر قسم کے بچولیوں کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال ہونے لگا۔ خالصہ کے تحت لائے گئے علاقوں میں علاؤالدین نے خوت، مقدم اور چوہدریوں کے مراعات کو روکنے کی کوشش کی۔ ان طبقات نے دیہی اشرافیہ کی تشکیل کی اور برنی کے مطابق یہ لوگ عربی اور عراقی گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے، اور عمدہ لباس پہنتے، شراب پیتے اور شاندار ضیافت کا بھی اہتمام کرتے تھے۔

ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ علاؤالدین کی زرعی اصلاحات کا دیہی معاشرے کے مختلف طبقوں پر کیا اثر پڑا۔ علاؤالدین نے نہ صرف خوت، مقدم اور چودھریوں کو دوسروں کی طرح چرائی اور گھری (ہاؤس ٹیکس) ادا کرنے پر مجبور کیا، بلکہ پیمائش کے نظام کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا کہ وہ اپنے زمینی محصول کا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر نہ ڈال سکیں۔ انہیں زمینی محصولات کی وصولی کے لیے جو خوتی ملتی تھی اس سے بھی محروم کر دیا۔ زرعی نظام کی اصلاح کے دوران، علاؤالدین نے موثر اور دیانتدارانہ نظام کو یقینی بنانے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ خالصہ کی توسیع کے ساتھ ہی بڑی تعداد میں اکاؤنٹنٹ (مستوفی)، جمع کرنے والے (عمیل) اور ایجنٹوں (گماشتہ) کو مقرر کرنا پڑا۔ یہ نسبتاً کم مدت میں کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئے حکمران چھوٹے قصبوں تک کیسے پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ علاؤالدین نے زرعی نظام سے منسلک تمام ریاستی اہلکاروں کے کھاتوں کا سختی سے جانچ پڑتال کروایا تھا۔

علاؤالدین کے نظامِ پیمائش، مقامی مراعات یافتہ طبقوں کی وصولی کو محدود کرنے کی کوشش کی اور گاؤں کے پٹواریوں کی بہیوں کی مدد سے مقامی مالگزاری حکام کے کھاتوں کا جائزہ لینے کا ایک معیار متعین کیا جسے ان کے کچھ جانشینوں جیسے شیر شاہ اور اکبر نے تقلید کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مراعات یافتہ طبقوں کی اجرتوں کو محدود کرنے کی اس کی کوشش صرف جزوی طور پر کامیاب رہی۔ یہ طبقہ بہت زیادہ بااثر تھا اور علاؤالدین کے جانشین مبارک شاہ کے دور حکومت میں خوت اور مقدم کی مراعات بحال ہو گئیں اور علاؤالدین کے بہت سے محصولات کو ترک کر دیا گیا۔ غالباً علاؤالدین کی زرعی اصلاحات کا ایک اہم مقصد دیہی معیشت کو مزید بہتر بنانا تھا، اور شہر و گاؤں کے درمیان ایک مزید

مربوط رشتہ قائم کرنا تھا۔

3.3.2 محمد بن تغلق کے زرعی اقدامات (Agricultural Initiatives of Muhammad Bin Tughluq)

محمد بن تغلق جب تخت نشین ہوا تو اس نے سب سے پہلے علاؤالدین خلجی کے محصولات کی وصولی کے نظام کو گجرات، مالوا، دکن، جنوبی ہند اور بنگال تک توسیع کر دی۔ بعد کے مرحلے میں، زرعی ٹیکس (محصول) کے پیمانے میں کافی اضافہ کیا گیا۔ برنی لکھتا ہے کہ محمد بن تغلق نے محصول کو دس یا بیس گنا بڑھا دیا جو کہ بلاشبہ مبالغہ آرائی ہے لیکن اس سے محصول کے زیادہ ہونے کا تاثر ضرور ملتا ہے۔ برنی مزید لکھتا ہے کہ اضافی محصول (جنہیں ابوب کہتے ہیں) بھی نافظ کیے گئے۔ دیگر ٹیکس مثلاً خراج، چرائی اور گھری وغیرہ بہت سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ یحییٰ بن احمد سرہندی کے مطابق، مویشیوں کو نشان زد (داغنا) کیا جاتا تھا اور کسی بھی قسم کے محصول سے بچنے کے لیے دیہی گھروں کی گنتی بھی کی جاتی تھی۔ لیکن ان اقدامات سے زیادہ اہم یہ حقیقت تھی کہ خراج کی تشخیص کے لیے وفافرمانی (سرکاری طور پر مقررہ پیداوار) اور نرخ فرفانی (سرکاری طور پر مقرر کردہ قیمتیں) استعمال کی گئیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آمدنی کا حساب لگانے کے لیے پیداوار اور قیمتیں حقیقی نہیں تھیں۔ ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مقرر کردہ پیداوار اور قیمتیں یقینی طور پر زیادہ تھیں۔ اصل کی بجائے بڑھائی ہوئی پیداوار اور قیمتیں اس سے کہیں زیادہ تھیں جو کہ مروجہ تھیں۔ محصول کی طلب میں زبردست اضافے کے نتیجے میں زرعی اراضی کا رقبہ کم ہو گیا، کسان زمین چھوڑ کر فرار ہو گئے، دوآب اور دہلی کے آس پاس کے کسانوں نے بغاوت کی۔ اس کی وجہ سے دار لحکومت دہلی کو اناج کی فراہمی ممکن نہ ہو سکی اور غلّے کے فقدان کے نتیجے میں قحط سالی آگئی جو 42 -1334 تک تقریباً سات سال تک جاری رہا، جس سے کافی لوگ انتقال کر گئے۔ ملک کی معاشی حالت بھی خراب ہو گئی۔

ان مسائل کا سامنا کرتے ہوئے، محمد بن تغلق پہلا سلطان تھا جس نے زراعت کو فروغ دینے کے لیے منظم زرعی پالیسی بنانے کی کوشش کی۔ اس نے زرعی اراضی کا رقبہ بڑھانے اور آبپاشی کے لیے کنویں کھودنے کے لیے سوندھر (Sondhar) کے نام سے زرعی قرضے دینے کا رواج متعارف کرایا۔ برنی کہتے ہیں کہ سوندھر میں ستر لاکھ ٹنکے (عفیف کے مطابق دو کروڑ ٹنکے) شاہی خزانے سے جاری کیے گئے لیکن بد قسمتی سے شاید ہی کوئی رقم کسانوں تک پہنچی۔ زراعت کے فروغ کے لیے 'دیوان امیر کوہی' کے نام سے ایک نئی وزارت قائم کی گئی۔ اس کے دو اہم مقاصد تھے؛ زیر کاشت رقبہ کو بڑھانا اور کاشت سے باہر زمین (اُسر) کو زیر کاشت لانا اور فصل کا طریقہ بہتر بنانا تھا۔ برنی کہتے ہیں کہ حکم نامہ جاری کیا گیا کہ گندم کی جگہ گنے اور گنے کی جگہ انگور اور کھجور لگائے جائیں۔ اس منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے ایک سو شقدار مقرر کیے گئے تھے۔ سلطان اپنے زرعی بہتری کے منصوبے کو متعارف کرانے کے لیے اس قدر پر عزم تھا کہ جب ایک عالم دین نے کہا کہ نقد قرض دینا اور اناج کا سود وصول کرنا گناہ ہے تو بادشاہ نے اسے پھانسی کا حکم سنا دیا۔

تاہم برنی کا کہنا ہے کہ یہ تمام اقدامات تقریباً مکمل طور پر ناکام رہے کیونکہ اس منصوبے کے لیے منتخب شدہ اشخاص نااہل تھے۔ ستیش چندر کا کہنا ہے کہ ان تمام ناکامیوں اور کمیوں کے باوجود اس اسکیم کو مکمل ناکامی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ زرعی قرضوں کی مدد سے کاشت اور

زرعی پیداوار کو بڑھانے اور بہتر بنانے کا خیال بعد کے سلطانوں نے بھی عملی طور پر اختیار کیا جو بعد میں مغلوں کی زرعی منصوبوں کا اہم حصہ بن گیا۔ اس طرح، علاؤالدین خلجی اور محمد بن تغلق دونوں نے ایک ایسی زرعی پالیسی کے ارتقا میں مدد کی جو مغلوں کے دور میں مکمل طور پر پروان چڑھی۔ فیروز شاہ تغلق (88-1351) نے ان منصوبوں کو ترک کر دیا، زائد زرعی محصول کو ختم کر دیا، گھری اور چرائی ٹیکس عائد کرنے پر پابندی عائد کی۔ لیکن بتایا جاتا ہے کہ اس نے کسانوں پر ایک الگ ٹیکس جسے جزیہ کہتے ہیں نافذ کیا جو کہ خراج (زمینی ٹیکس) سے الگ کیا گیا تھا اور الگ سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس نے دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں آبپاشی کے لیے نہریں کھودوائیں اور کسانوں پر ایک نیا آبپاشی ٹیکس (حق شرب) نافذ کیا جو کہ دس فیصد کے حساب سے لگایا جاتا تھا۔ اس کے بعد کے دور کے متعلق ہمارے پاس بہت کم معلومات ہیں لیکن ابراہیم لودی (26-1517) کے دور تک زمین کا محصول زیادہ تر نقدی میں وصول کیا جاتا تھا۔ کرنسی کی کمی اور اناج کے سستے ہونے کی وجہ سے، ابراہیم لودی نے زمینی محصول اناج کی صورت میں وصول کرنے کا حکم دیا تھا۔

3.4 زرعی نظامِ محصول کا ڈھانچہ (Structure of the Land Revenue System)

تیرہویں صدی کے دوران محصولات کے نظام سے متعلق ہمیں واضح تصویر نہیں ملتی ہے۔ یہاں تک کہ اِلبری عہدِ حکومت میں محصول کا مطالبہ غیر یقینی تھی۔ شاید پرانا زرعی نظام کچھ تبدیلیوں کے ساتھ چلتا رہا۔ مرکز میں زائد پیداوار کے اعلیٰ ترین اختصاص کی حکمت عملی تبدیل ہو گئی تھی، یعنی تُرک حکمران طبقہ کا وضع کردہ زمینی محصول وصول کرنے کا نظام لاگو ہو گیا، تاہم، سلطانوں کے ذریعہ متعارف کردہ زرعی نظام خاص طور سے علاؤالدین خلجی کے ابتدائی دورِ حکومت میں موجودہ صورتحال کے پس منظر میں جاری رہا۔ دیہی اشرافیہ کے تین گروہوں خوت، مقدم اور چودھری تھے جو ریاست کی جانب سے کسانوں سے زمینی محصول (خراج) وصول کرتے تھے، اور دیوانِ وزارت کے حکام کے پاس جمع کراتے تھے۔ اس خدمت کے لیے، انہیں ریاست کی طرف سے معاوضے کے طور پر 'حق خوتی' کی اجازت دی گئی تھی جس میں ان کے پاس موجود زمین کے ایک حصے کے محصول سے مستثنیٰ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ کسانوں سے اُن کی پیداوار میں سے کچھ حصہ لیتے تھے جس کو برنی نے 'قسمتِ حوتی' کہا ہے۔ زمینی محصول (خراج) کے علاوہ، ہر کاشت کار کو محصول رہایش گاہ (گھری) اور مویشی یا محصول چرائی (چرائی) ادا کرنا پڑتا تھا۔ اتفاق سے چوہدری براہ راست محصولات کی وصولی میں ملوث نہیں ہوتے تھے کیونکہ ابن بطوطہ کے مطابق وہ "سودیہات" (پرگنہ) کا سربراہ تھا: اس نتیجے کو اس حقیقت سے تقویت ملتی ہے کہ برنی نے ہمیشہ الفاظ جیسے 'حق خوتی' یا 'حق مقدمی' استعمال کیا ہے لیکن کبھی حق چوہدری کا تذکرہ نہیں ملتا۔ تاہم ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ تینوں گروہوں کے لیے بچولیہ (Intermediaries) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

شمس سراج عفیف کے مطابق ایک گاؤں دو سو سے تین سو ممبران پر مشتمل ہوتا تھا اور برنی کہتا ہے کہ ہر گاؤں میں حساب رکھنے کے لیے ایک پٹواری ہوتا تھا۔ اس کی بہی (اکاؤنٹ رجسٹر) کی چھان بین کی جاتی تھی تاکہ کسانوں کی طرف سے مالگزاری حکام کو کی جانے والی ہر ادائیگی کا پتہ لگایا جا سکے۔ پٹواری کوئی سرکاری نمائندہ نہیں بلکہ گاؤں کا ایک اہلکار ہوا کرتا تھا۔ پٹواری یقینی طور پر دہلی سلطنت کی تخلیق نہیں

تھی۔ کھاتوں کو برقرار رکھنے کے لیے گاؤں کے محرر کی موجودگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاؤں سلطنت کے انتظامی نظام سے باہر ایک انتظامی اکائی تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ گاؤں اجتماعی طور پر محصول ادا کرنے والا ایک اکائی تھا ورنہ گاؤں کے حساب و کتاب رکھنے کے لے محرر کی ضرورت کیوں پڑتی۔ پٹواری کی موجودگی اور اس کے فرائض کی نوعیت اس طرح دیہی طبقہ (Village Community) کے وجود کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کی انفرادی کسانوں پر محصول کا اندازہ لگانے کی کوششوں کے باوجود، عملی طور پر گاؤں زمینی محصول کی ادائیگی کی اکائی بنا رہا۔ برنی کا بیانیہ 'امیروں کا بوجھ غریبوں پر پڑنے' کے بارے میں شکایات مزید اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ گاؤں کی کمیونٹی ایک مثالی ادارہ نہیں تھا بلکہ خود استحصال کا ایک آلہ تھا۔ سخت اقدامات کو متعارف کرانے میں علاؤالدین خلجی کو کس چیز نے متحرک کیا اس کی تفصیل برنی نے بیان کی ہے۔ مختصراً یہ کہ بچولیے (Intermediaries) ایک ناقابل اعتبار طبقہ بن چکا تھا جو ہمیشہ بغاوت کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ سلطان نے ان پر مندرجہ ذیل بنیادی الزامات لگائے:

1. انہوں نے اپنی زمین کے اُس حصے پر محصول ادا نہیں کیا جو تشخیص سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ بلکہ انہوں نے اپنا 'بوجھ' عام کسانوں پر ڈال دیا، یعنی انہوں نے کسانوں سے ریاست کے مقررہ مطالبے کے علاوہ اضافی محصول وصول کیا تاکہ وہ خود اپنے واجبات ادا کر سکیں۔
2. انہوں نے چرائی محصول ادا نہیں کیا۔
3. ناجائز کی کمائی نے انہیں اتنا مغرور بنا دیا تھا کہ یہ مالگزاری حکام کے احکام کی دھجیاں اڑاتے تھے۔ اور جب ان کو مالگزاری آفس میں حساب کتاب کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا تو اس کی بھی وہ حکم عدولی کرتے تھے۔

سلطان نے معاشی اور سیاسی وجوہات کی بنا پر ان ثالثیوں (Intermediaries) کے وسائلوں کو نشانہ بنایا۔ ان سب معملات پر قابو پانے کے لئے سلطان نے درج ذیل اقدامات اٹھائے تھے:

1) ریاست نے زمینی محصول کا مطالبہ زمین کی پیداوار کے نصف پر رکھا a۔ زمین کی پیائش کی جاتی تھی، اور زمین کا محصول، علاقے کے ہر اکائی کی پیداوار کے حساب سے مقرر ہوتا تھا۔ استعمال شدہ اصطلاح 'وفا بسوا' تھی (وفا = پیداوار؛ بسوا = ایک بیگھہ کا بیسواں حصہ)۔ غالباً، یہ ہر ایک کاشتکار کے زیر قبضہ زمین پر الگ سے لگایا جاتا تھا۔
2) بچولیوں اور کسانوں سے یکساں محصول مطالبہ کیا جاتا تھا جو کہ پیداوار کا نصف بغیر کسی امتیاز کے ادا کرنا تھا، خواہ وہ بچولیہ ہوں یا عام کسان (بلاہر)۔
3) بچولیوں کو مراعات کی اجازت نہیں دی گئی۔
4) ان بچولیوں سے دو قسم کے ٹیکس چرائی اور گھری بڑی سختی سے وصول کیے جانے لگے۔

یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ان اقدامات کا مقصد کسانوں کو بچولیوں کی غیر قانونی وصولیابی سے بچانا تھا۔ برنی کا بھی یہی کہنا ہے کہ ''سلطان کی پالیسی یہ تھی کہ 'مضبوط' (عقویہ) کا محصولاتی 'بوجھ' (بار) 'کمزور' (زواجہ) پر نہیں پڑنا چاہیے''، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ پچاس فیصد مانگ ہندوستان کی زرعی تاریخ میں سب سے زیادہ تھی۔ دوسری طرف، اگرچہ کسانوں کو اب بچولیوں کے معاشی استحصال سے محفوظ کیا گیا تھا، لیکن

اب ان بچولیوں کو پہلے کی نسبت زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح ریاست نے بچولیوں کے اوپر قابو حاصل کر لیا، اور کسانوں کو کسی حد تک ان کے ظلم و زیادتی سے کچھ حد تک چھٹکارا مل گیا۔ یہ درست ہے کہ بچولیوں کو براہ راست لگان کی وصولیابی سے محروم کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ دیہی علاقوں میں امن و امان برقرار رکھیں، اور بغیر کسی معاوضے یا مراعات کے مالگزاری اہلکاروں کی محصول کی وصولیابی میں مدد کریں۔ کسانوں کے ساتھ ریاست کے براہ راست تعلقات کے نتیجے میں مالگزاری اہلکاروں کی توسیع ہوئی جنہیں مختلف ناموں سے جانا جانے لگا مثلاً عامل مطصریف، مشرف، محاسلان، نویسندگان وغیرہ۔ جلد ہی، مالگزاری اہلکاروں کے درمیان بڑے پیمانے پر بدعنوانی اور خورد بُرد کے معاملے سامنے آئے جس کے لیے انہیں نائب وزیر شریف قیانی کی طرف سے سخت سزا دی گئی اور تقریباً آٹھ سے دس ہزار اہلکاروں کو قید کیا گیا۔ دھوکہ دہی کا پتہ لگانے کے لئے گاؤں کے پٹواری کی بہی یا لیجر کی باریک بینی سے جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ بہی میں مالگزاری جمع کرنے والوں کو کی جانے والی ہر ادائیگی، قانونی یا غیر قانونی درج ہوتی تھی، اور پھر ان ادائیگیوں کا موازنہ رسیدوں سے کیا جاتا تھا۔ حالانکہ علاؤالدین خلجی نے محصول وصول کرنے والوں کی تنخواہیں بڑھادی تھی لیکن اس کے باوجود بدعنوانی کا خاتمہ اور ازالہ پوری طرح سے نہ ہو سکا۔ برنی نے اُن علاقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں یہ اقدامات نافذ تھے اور لکھا ہے: یہ کافی بڑا علاقہ تھا، جو اس کی سلطنت کے قلب پر محیط تھا۔ لیکن بہار، اودھ، گجرات، مالوا اور راجپوتانہ کے کچھ حصوں کا ذکر نہیں ہے۔ بہر حال، یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ اقدامات زیادہ تر خالصہ کے لیے بروئے کار لائے گئے تھے۔ جس کو آپ نیچے دئے گئے نقشہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

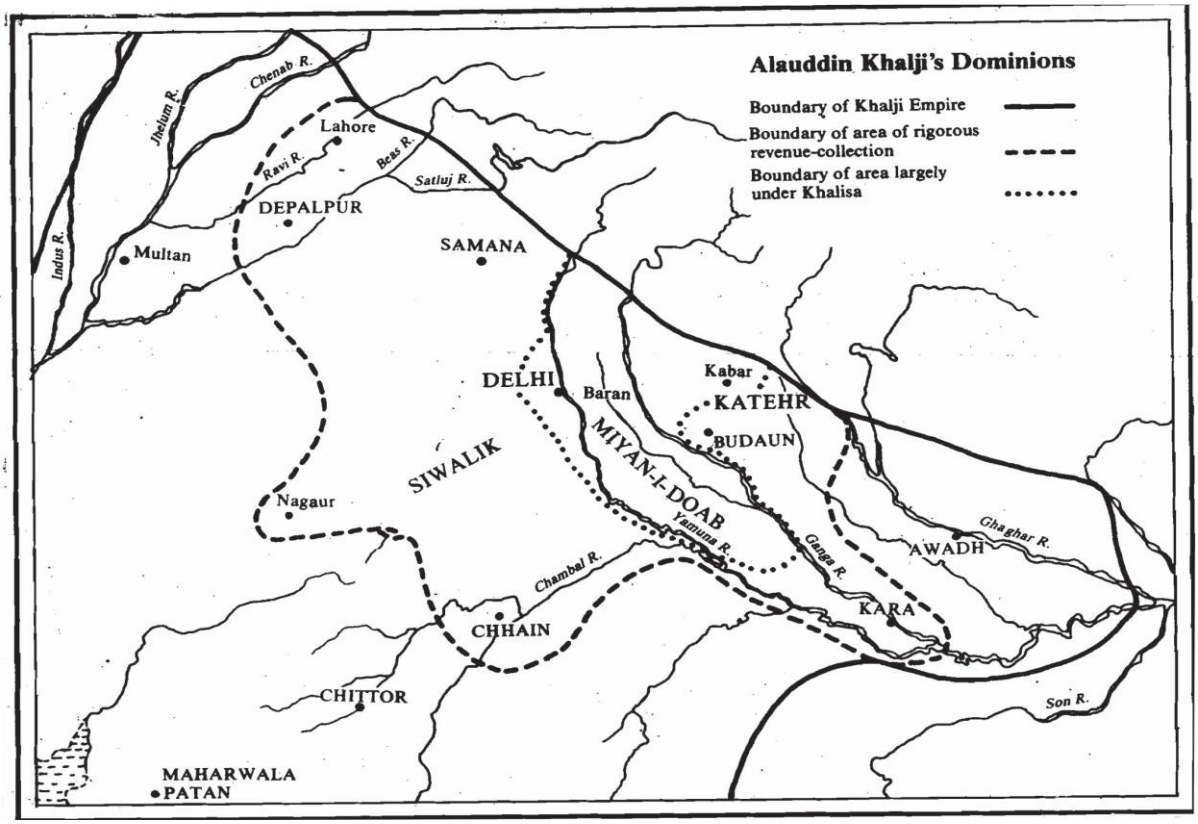

Rigorous Revenue Collection Area under Alauddin Khalji's Dominion

Courtesy: Faiz Habib, Centre of Advanced Study in History, Aligarh Muslim University, Aligarh

3.5 محصول کی ادائیگی کا طریقہ (Mode of Payment for the Revenue)

جہاں تک ادائیگی کے طریقہ کار کا تعلق ہے، مورلینڈ کا خیال ہے کہ تیرہویں صدی کے دوران عام طور پر نقد ادائیگی کا رواج تھا، اور یہ چودھویں صدی تک کافی وسیع پیمانے پر رائج ہو چکا تھا۔ تاہم علاؤالدین نے خود اناج کے ذریعے سے محصول جمع کرنے کو ترجیح دی۔ اس نے حکم دیا کہ دوآب میں خالصہ سے حاصل ہونے والی پوری آمدنی کی وصولی جنس میں کی جانی چاہئے، اور دہلی اور اس کے مضافات سے صرف نصف آمدنی نقد میں وصول کی جانی چاہئے۔ اناج جمع کرنے کے لیے اس کی ترجیح، کی وجہ نہ صرف یہ تھی کہ دہلی اور دیگر علاقوں میں ہنگامی حالات جیسے خشک سالی یا دیگر عوامل کی وجہ سے قلت کے لیے اناج کا ایک بڑا ذخیرہ رکھنا تھا، بلکہ اناج کے ذخیرہ کو اناج کی منڈی میں قیمتوں کو اعتدال پر رکھنے کے ایک ذریعہ کے طور پر بھی استعمال کیا۔ غیاث الدین تغلق نے درجہ ذیل دو اہم تبدیلیاں متعارف کروائی تھیں:

1. بچولیوں کو ان کی حق خوتی جمع کرنے کا حکم دیا گیا لیکن قسمت خوتی نہیں۔ انہیں گھروں اور مویشیوں پر محصول سے بھی چھوٹ دے دی گئی۔
2. پیمائش کا طریقہ کار (مشاہت) کے ساتھ ساتھ مشاہدے یا "حقیقی پیداوار" (بر حکم حاصل) کو بھی جاری رکھنے کا حکم دیا گیا۔

جہاں تک محمد بن تغلق کا تعلق ہے، اس نے زرعی محصول کی شرح کو پچاس فیصد سے زیادہ بڑھا دیا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کی موت کے بعد خلجی حکمرانوں نے اس شرح کو کم کیا تھا جسے بعد میں محمد بن تغلق نے کسی حد تک بڑھا دیا تھا۔ یہ دونوں نظریات غلط ہیں کیونکہ علاؤالدین کے مقرر کردہ شرح میں کبھی بھی چھیڑ چھاڑ کی کوشش نہیں کی گئی۔ اصل میں محمد بن تغلق نے نئے محصول جنہیں ابوب کہتے ہیں لگائے اور اس کے ساتھ ساتھ پرانے محصول کو دوبارہ متعارف کروایا جس میں بچولیوں پر چرائی اور گھری جیسے محصولات نافذ کیے۔ اس کے علاوہ، ایسا لگتا ہے کہ صرف پیمائش کو تشخیص کے مقصد کے لیے برقرار رکھا گیا تھا۔ لیکن معاملہ اس وقت اور بڑھ گیا جب اجناس (اناج) کی تشخیص 'حقیقی پیداوار' (actual yield) کے اصول پر نہیں کی گئی بلکہ ناپے گئے رقبے کی ہر اکائی کے لیے سرکاری طور پر طے شدہ پیداوار (وفاء فرمانی) پر کی گئی۔ ایک بار پھر، نقد ادائیگی کے لیے، تبدیلی بازار میں رائج قیمتوں کے مطابق نہیں کی گئی بلکہ سلطان کے حکم یعنی 'نرخ فرمانی' کے مطابق کی گئی تھی۔ اور پھر، جیسا کہ برنی کہتے ہیں، ان تمام محصولات کی وصولیابی بڑی سختی سے کی جاتی تھی۔

ان ضوابط کے تحت دوآب میں خالصہ اراضی کو حکومت نے اپنے تحویل میں لے لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے بغاوت شروع کر دی، جس کی قیادت بچولیوں نے کی جس کے نتیجے میں پر تشدد تصادم ہوئے۔ حالات کو قابو کرنے کے لئے فیروز شاہ نے چرائی اور گھری سمیت مختلف قسم کے محصولات کو ختم کرنے کا اعلان کیا۔ ایک اور پیش رفت جو خاص طور پر تغلق عہد میں ہوئی، وہ اجارہ داری کا رواج (Revenue Farming) تھا۔ 'اِجارہ' یا 'اِجارہ داری' سے مراد زرعی محصولات کے تعین کا ایسا طریقہ ہے جس کے تحت کوئی گاؤں یا جاگیر یا کوئی خاص علاقہ کسی فرد (اجارہ دار) کو ایک مخصوص محصول کے عوض متعینہ مدت کے لیے دیا جائے اور اجارہ دار کو اس علاقے کے کاشتکاروں سے تشخیص شدہ شرح کے مطابق محصولات کی وصولی کا اختیار تفویض کر دیا جائے۔ فیروز شاہ کے دور میں، "آبی محصول" (حقِ

شرب)اُن کاشتکاروں سے لیا جاتا تھا جو ریاست کی طرف سے تعمیر کردہ نہروں سے فراہم کردہ پانی سے اپنی زمین کو سیر اب کرتے تھے۔ یہ بتانا بھی یہاں پر ضروری ہے کہ فصل خراب ہونے کی صورت میں، ریاست نے زمینی محصول کو کم کرنے کی کوشش کی، اور محمد بن تغلق کے دور حکومت میں سوندھر یعنی زرعی قرضہ کسانوں کو فراہم کیا جاتا تھا تاکہ وہ از سر نو زراعت کو فروغ دے سکیں۔ دہلی سلطنت کے کسی بھی دور میں کل آمدنی کا تخمینہ نہیں لگایا جاتا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کی حکومت سے پہلے ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی جس سے دہلی سلطنت کی کل آمدنی کا اندازہ لگایا جا سکے۔ عفیف کا کہنا ہے کہ فیروز شاہ کے حکم پر خواجہ حسام الدین جنید نے مملکت کے 'جمع' (تخمینہ محصول) کا تعین 'حکمِ معائنہ' (بر حکم مشاہدہ) کے مطابق کیا۔ اس کام کو مکمل کرنے میں چھ سال لگے اور یہ تعداد چھ کروڑ پچھتر لاکھ ٹنکہ (ایک چاندی کا سکہ) تک پہنچی جو سلطان کے پورے دورِ حکومت میں جاری وساری رہا۔

3.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

زمینی محصول ریاست کی آمدنی کا بنیادی ذریعہ تھا۔ اس اکائی میں، آپ نے ہندوستانی معیشت پر دہلی سلطنت کے اثرات کا مطالعہ کیا ہے۔ ہم نے اس بات کو بھی جانا کہ کس طرح دھیرے دھیرے پہلے سے موجودہ محصولات کی وصولی اور تقسیم کاری کے نظام میں تبدیلی آئی، نقدی لین دین میں کافی اضافہ ہوا اور خالص چاندی کی کرنسی متعارف ہوئی۔ موجودہ اکائی میں ہم نے دہلی سلطنت کے زرعی ڈھانچے—زرعی پیداوار، آبپاشی کے ذرائع، کسانوں اور دیہی بچولیوں پر توجہ مرکوز کی ہے۔ اس عرصے کے دوران بڑے پیمانے پر قابل کاشت زمین کو زیر کاشت لائے جانے کی بھرپور کوشش کی گی۔ دوآب میں دوہری فصل کا رواج عام ہوا۔ نہریں مصنوعی آبپاشی کا بہت بڑا ذریعہ بن گی۔ دیہاتی سطح پر اعلیٰ عہدداروں (خوت، مقدم اور چودھری) اور عام کسانوں (رعیّت) کے درمیان تفریق (درجہ بندی) موجود تھی۔

3.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

زرعی محصول	:	زرعی پیداوار پر نافذ العمل شرح محصول
تشخیص	:	تخمینہ کاری، محصول کی مقدار کی جانچ پڑتال
محصول	:	تخمینہ آمدنی
ٹنکہ	:	چاندی کا سکہ
مشاہت	:	پیمائش کا طریقہ کار
خراج	:	زمینی محصول
گھری	:	رہایش گاہوں پر لگایا جانے والا محصول
جمع	:	تشخیص شدہ کل محصول

3.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. زرعی قرض سوندھر کس سلطان نے شروع کیا تھا؟
2. خالصہ سے کیا مراد ہے؟
3. وہ علاقے جو فوجی طاقت کے استعمال کے بغیر خراج ادا نہیں کرتے تھے انہیں کس نام سے جانا جاتا تھا؟
4. کس تاریخ دان نے دہلی سلطنت کی قیام کی وجہ سے آنے والی تبدیلیوں کو 'شہری انقلاب' اور 'دیہاتی انقلاب' کہا ہے؟
5. دہلی سلطنت میں "زرعی قرضے" دینے کا رواج کس سلطان نے شروع کیا؟
6. دہلی سلطنت کا وہ کون سا سلطان تھا جس نے آبپاشی کے لیے نہریں بنائی تھیں؟
7. 'حقِ شرب' نامی آبی محصول کس بادشاہ نے نافذ کیا تھا؟
8. 'ابوب' سے کیا مراد ہے؟
9. فیروز شاہ کے دور میں کس کو تخمینہ محصول کا تعین کرنے کے لئے منتخب کیا گیا تھا؟
10. کس سلطان کے دور میں کسانوں نے زرعی محصول کے خلاف احتجاج کیا تھا؟

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دیوان امیر کوہی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. اقطاع کی ابتداء کی خصوصیت پر روشنی ڈالیے۔
3. دہلی سلطنت میں 'دیہی بچولیوں' پر نوٹ لکھیے۔
4. زرعی محصولات کے مقدار اور ادائیگی کے طریقے پر تبصرہ کیجیے۔
5. خالصہ کے نظام اور اس کی معاشی اہمیت پر مفصل نوٹ لکھیے۔

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بچولیوں (Intermediaries) کے خاتمے کے لیے علاؤالدین خلجی کے اقدامات پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔
2. علاؤالدین خلجی کی جانب سے قیمتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے کیے گئے اقدامات پر تبادلہ خیال کریں۔
3. محمد بن تغلق کے دور میں کئے گئے زرعی اقدامات کا جائزہ لیجیے۔

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ahmed, Fouzia Farooq, *Muslim Rule in Medieval India*: *Power and Religion in the Delhi Sultanate*, Bloomsbury, New Delhi, 2022.
2. Ashraf, K.M., *Life and Conditions of the People of Hindustan*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1970.
3. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
4. Habib, Irfan, *Economic History of India AD 1206–1526*, Tulika Books, Delhi, 2016.
5. Habibullah, A.B.M., *The Foundation of Muslim Rule in India*, Central Publishing House, Allahabad, 1999 (first pub. in 1945).
6. Kumar, Sunil, *The Emergence of the Delhi Sultanate*, *1192–1286*, Permanent Black, Ranikhet, 2007.
7. Lane-Poole, Stanley, *Medieval India under Mohammedan Rule*, Low Price Publications, Delhi, 1990 (first pub. in 1903).
8. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*: *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers, New Delhi,1995 (first pub. in 1983).
9. Mujeeb, M., *The Indian Muslims*, Munshiram Manoharlal, New Delhi, 2003 (first pub. in 1967).
10. Nizami K.A. ed., *Politics and Society during the Early Medieval Period, Collected Works of Professor Muhammad Habib*, Vol. I, Centre of Advanced Study, Department of History, Aligarh Muslim University, People's Publishing House, 1974.
11. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That Was India*, part-II, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first pub. in 1987).
12. Raychaudhuri, Tapan and Irfan Habib, *The Cambridge Economic History of India*, Vol. I Cambridge University Press, Delhi, 1982.
13. Moreland, W.H., *The Agrarian System of Moslem India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2011.
14. Shrimali, Krishna Mohan, *Land, Agriculture and Money in Central India and Beyond* (*c. 100 to c. 1300 A.D.*): *A Feudal Order Revisited*, Aakar, Delhi, 2024.
15. Sharma, R.S., *Indian Feudalism*, *c. AD 300–1200*, Macmillan, Delhi, 2013 (first pub. in 1965).

اکائی 4۔مالگزاری کی تفویضات اور عطیات

(Revenue Assignments and Grants)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 اقطاع نظام

4.2.1 اقطاع کا معنی اور اس کا پس منظر

4.3 دہلی سلطنت میں اقطاع کی روایت

4.3.1 تنخواہ

4.3.2 اقطاع نظام کے نفاذ کے مقصد

4.3.3 اقطاع کا رواج

4.3.4 اقطاع کی علاقائی تقسیم

4.3.5 منصب اقطاع کی مدت کار

4.3.6 مقطع کے فرائض اور اخراجات

4.3.7 مقطعوں کی طاقت

4.4 اقطاع نظام کی نوعیت

4.4.1 اقطاع اور خالصہ

4.4.2 اقطاع اور شق

4.5 دیگر عطیات

4.6 اکتسابی نتائج

4.7 کلیدی الفاظ

4.8 نمونہ امتحانی سوالات

4.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کا سیاسی نظام اپنی پیشرو راجپوت جاگیر دار ریاستوں سے مختلف تھا۔ بنیادی طور پر یہ فرق ان کے مالگزاری نظام اور صوبوں پر کنٹرول میں نظر آتا ہے۔ ان لوگوں نے نئے مفتوحہ علاقوں کو منظم کرنے اور مرکز سے جوڑ کر رکھنے کے لیے اقطاع کا نظام نافذ کیا۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور میں ہندوستان میں ترک حکمرانی کی سیاست دو بنیادی عناصر پر مبنی تھی۔ ان میں سے پہلا 'اقطاع'(*Iqta*) یعنی 'قابل منتقلی مالگزاری کی تفویض' (Transferable Revenue Assignment) اور دوسرا 'خراج'(*Kharaj*) یعنی غیر مسلم لوگوں پر عائد زمینی ٹیکس تھا جو عام طور پر تمام کاشتکاروں سے لیا جاتا تھا خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ حالانکہ مسلم قانون کے نقطہ نظر سے مسلمانوں سے صرف 'عشر' یعنی کل پیداوار کا 10 فیصد اور غیر مسلم سے پیداوار کا 20 فیصد بطور 'خراج' لیا جانا تھا، لیکن دہلی سلطنت میں سبھی سے یکساں محصول لیا جاتا تھا جو ایک تہائی اور کہیں کہیں تو کل پیداوار کے نصف تک پہنچ جاتا تھا۔ اقطاع کے انتظامی ڈھانچے کے تحت کسی بھی علاقے سے مستقل تعلق نہ ہونے کے باوجود وہاں سے حکمران طبقے کے لیے آمدنی کا انتظام ہو جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ نظام حکمران طبقے کی سماجی حیثیت اور ان کے سیاسی اثر ورسوخ کے تعین کی بنیاد بھی بنا رہتا تھا۔ مالگزاری کی تفویض کا دوسرا میدان ایسے عطیات (Grants) تھے جن کے مالک پر کسی طرح کی سیاسی اور انتظامی ذمہ داریاں عائد نہیں کی جاتیں اور جنہیں ہمعصر دور میں عمومی طور پر وجہ معاش عطیات کہا گیا ہے۔ ان میں ملک، انعام، وقف وغیرہ شامل ہیں جو اکثر مذہبی اور علماء طبقے کو ان کی کفالت کے لیے دیں جاتی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ موروثی ہوتے چلے گئے جن کی روک تھام کے لیے علاؤالدین خلجی جیسے مرکزیت پسند سلطان نے اقدامات کیے، مگر اس کے بعد کے حکمرانوں نے انہیں پلٹ کر پھر سے قدیم نظام ہی جاری رکھا۔ ان سبھی تبدیلیوں اور مالگزاری تفویضات اور عطیات کی بدلتی ہوئی صورتوں اور نوعیتوں کے بارے میں آپ اس اکائی میں پڑھیں گے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مالگزاری تفویضات کے نظام اور اس کی مختلف شکلوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کی انتظامیہ میں اقطاع نظام کی اہمیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- اقطاع نظام کی مختلف شکلوں، مقطع کے فرائض اور اختیارات جان سکیں گے۔
- اقطاع نظام کے نفاذ کے مقصد، اس کے رواج اور اس کی علاقائی تقسیم پر تبصرہ کر سکیں گے۔
- اقطاع نظام کی نوعیت اور اقطاع، خالصہ اور شق میں فرق واضح کر سکیں گے۔
- دیگر عطیات جیسے ملک، انعام، وقف اور وجہ معاش کے بارے میں جان سکیں گے۔

4.2 اقطاع نظام (*Iqta* System)

4.2.1 اقطاع کا معنی اور اس کا پس منظر (Meaning of *Iqta* and its background)

'اقطاع' ایک عربی لفظ ہے جسے ایک طرح کے انتظامی اختیار دینے کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اکثر گمراہ کن ترجمے کی وجہ سے یہ لفظ یورپ میں رائج لفظ فیف (Fief) یعنی 'جاگیر' کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مسلم ریاستوں کے وجود میں آنے کے بعد پہلی چند صدیوں میں ریاست کے ماتحت مختلف علاقوں کو مخصوص حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس مخصوص حصے کو قطعہ کہا جاتا تھا۔ ریاست کی زمینیں دراصل نیم ملکیتی عشر (دسواں حصہ) کی ادائیگی کی شرائط پر دی گئی تھیں۔ مسلم دنیا کی توسیع کے ساتھ ساتھ ریاست کی عسکری ذمہ داری بھی بڑھ گئی۔ ایک طاقتور فوج کو برقرار رکھنے کے لیے زیادہ سے زیادہ زمین کی ضرورت تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک نیا نظام وجود میں آیا جسے اقطاع کہا گیا۔ دانشوروں کا خیال ہے کہ لفظ اقطاع اسی عربی لفظ قطعہ سے نکلا ہے۔ چنانچہ اسلام کے آغاز سے ہی ریاست کی خدمت کے صلے میں اقطاع دینے کا رواج تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عباسی خلافت (754–861) کے تحت معاشی اور سماجی تبدیلیوں نے وہ پس منظر فراہم کیا جس سے دسویں صدی میں مسلم دنیا میں زمین تفویض کرنے کا عمل شروع ہوا۔ خلیفہ نے ریاست کے سول اہلکاروں کو تنخواہیں دینے اور اپنی فوجی مہمات کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اقطاع نظام کو فروغ دیا۔ خلیفہ المامون (813–833) کے دور میں جرنیلوں کو ان کی تنخواہوں کے بدلے میں زمین کے مخصوص ٹکڑوں کی مالگزاری دی جانے لگی۔ افسروں اور فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے رقم کے حصول کی مشکلات اس قدر بڑھ گئیں کہ بالآخر انتظامی ڈھانچہ ہی لڑکھڑانے لگا۔ اس مالی مشکل کو دور کرنے کے لیے زمین کے ٹکڑے جو اقطاع کہلاتے تھے، فوجیوں اور فوجی افسران میں تقسیم کیے جانے لگے۔ اقطاع حاصل کرنے والے افراد مذکورہ زمینوں کے مالک نہیں تھے، وہ صرف اس کی آمدنی استعمال کر سکتے تھے۔ نتیجے کے طور پر، بعد میں محصول گزاری کو ٹھیکے پر دینے (tax farming) کا رواج بھی چلن میں آیا۔ کسی جرنیل کو بڑے علاقے سے مالگزاری کا حق ملنے پر اسے بہت آسانی سے اپنے آپ کو نیم خود مختار بننے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے مالگزاری کی وصولی میں بے قاعدگی ہونے پر زمین سے متعلق حقوق ہی انہیں دیے جانے لگے۔ دوسرے لفظوں میں محصولات میں سے حصہ دیے جانے کا رواج اتنا عام ہو گیا کہ مالگزاری نظام میں یہی واحد عملی روایت بن گیا۔ فوجیوں کو (زمین سے متعلق) خصوصی عطیہ دینے کا یہ رواج اقطاع کے نام سے مشہور ہوا۔ بویہی ریاست (Buyids, 945–1055) کے تحت نہ صرف عراق اور اس کے نزدیک کے علاقوں میں ریاست کو عسکری شکل دی گئی بلکہ مشرق میں سامانی ریاست (Samanids, 874–999) اور خاص طور پر غزنوی سلطنت (Ghaznavids, 999–1040) کے حکمرانوں نے اسے اور بھی مضبوط کیا۔

بویہیوں کے زمانے میں جس شخص کو فوجی اقطاع دی جاتی تھی وہ اپنے تفویض کردہ علاقے میں نہیں رہتا تھا، بلکہ وہ ٹیکس وصول کرنے کے لیے اپنے نمائندوں کو بھیجتا تھا۔ نظریاتی طور پر یہ اقطاع نظام موروثی نظام نہیں تھا۔ وقتاً فوقتاً ان اقطاعات کو دوبارہ تقسیم کیا جاتا تھا اور افسران کو فوجی خدمات کے لیے حاضر رہنا پڑتا تھا۔ نظریاتی طور پر، اسے کافی سارے قواعد پر عمل کرنا ضروری تھا اور اس کی نگرانی بھی کی جاتی تھی۔ اقطاع کے افسر یا 'امیر' (*Amir*) سپاہیوں کو تنخواہ دینے کی ذمہ داری سے آزاد تھے، کیونکہ ان سپاہیوں کو اپنی تنخواہ یا 'اقطاع' ریاست

ہی سے ملتی تھی۔ قانون کے مطابق اقطاع یافتہ افسر یعنی 'مقطع' (*Muqta*) کو اقطاع کے باشندوں کے سلسلے میں عدالتی اختیار نہیں ملتا تھا لیکن بویہیوں کے تحت، عملی طور پر ہر کسی نے اس اختیار کو حاصل کر لیا تھا۔ صوبائی حکمرانی، فوج کی سربراہی، مالگزاری وصول کرنے اور اس سے حصہ لینے جیسے مختلف کاموں اور اقطاع ایک فرد کے سپرد ہونے کی وجہ سے، حکومت سے تقریباً آزاد ایک بڑا زمیندار طبقہ ابھر کر سامنے آیا۔ اپنے ہی صوبے کے کسی علاقے میں اقطاع ملنے سے بھی مقطعوں کو حقیقی اختیارات کو بڑھانے میں مدد ملی۔ جہاں کہیں بھی ایسی صورت حال ہوتی تھی وہاں مقطع کے معاشی حقوق اور صوبائی حکومت کا اختیار ایک ہی فرد میں مرکوز ہو جاتا تھا اور یہ حکمران عملاً پورے صوبے میں دونوں طرح کے اختیارات استعمال کرتے تھے۔ بویہیوں کے ہی زمانے میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ 'مقطع' کو ان کے خصوصی عہدے کے علاوہ صوبائی گورنر کے انتظامی کام اور ذمہ داریاں بھی سونپی گئیں۔ لیکن ایسے اقطاع صرف بویہیوں کے ہی زمانے میں استثنا کے طور پر پائے جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلجوقی دور سے پہلے اس کا وسیع پیمانے پر رواج نہیں تھا۔

سلجوقی سلطنت (Seljuq Empire, 1037–1157) میں اس نظام میں کافی عملی تغیر کے ساتھ ساتھ اس کے لیے استعمال کی جانے والی اصطلاحات بھی مختلف تھیں۔ یہاں اصل مآخذ میں بھی مختلف قسم کے عطیات کے لیے لفظ 'اقطاع' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ مندرجہ ذیل معانی میں استعمال ہوا ہے، جیسے:

1. مالگزاری کی تفویض یا زمین کا عطیہ جو (الف) فوجی خدمات اور (ب) تنخواہ کے بدلے دیا گیا ہو۔
2. کسی خاص علاقے کا عطیہ جس پر عطیہ یافتہ کو مکمل حقوق حاصل تھے۔ اس طرح اس شخص کو پورا صوبہ ہی حاصل ہو جاتا تھا۔
3. مالگزاری میں حصہ داری (مقطع)
4. (الف) ذاتی زمینی ملکیت (ب) وظائف (allowances) یا پنشن سے متعلق عطیہ دیا جانا۔

سلجوقی دور میں، 'فوجی' (military) اور 'انتظامی' (administrative) اختیارات کے درمیان واضح طور پر فرق کرنا مشکل تھا۔ ایران میں سلجوقیوں کے زمانے میں اقطاع کے عام رواج کے شواہد موجود ہیں۔ سلجوقیوں نے پچھلے دور کے مقابلے اپنے زمانے میں وسیع پیمانے پر اقطاع کو رواج دیا۔ اقطاع پانے والا افسر، حاصل شدہ علاقے کی پوری آمدنی اپنے استعمال کے لیے رکھتا تھا اور مرکزی حکومت کے لیے اس کی واحد ذمے داری، فوج میں اپنی ذاتی خدمات فراہم کرنا تھا۔ اقطاع سے متعلق تقرری اگر اہم ہوتی تو اسے سپاہیوں کا ایک دستہ بھی رکھنا پڑتا تھا۔ سلجوقیوں کی اندرونی کشمکش کے دوران (جیسا کہ اس خاندان کے آخری دور میں ہوا) اقطاع حاصل کرنے والے اہلکاروں کی تعداد اور ان کے علاقے میں ضرور اضافہ ہوا ہوگا۔ ان کی مدت کار طویل ہونے سے، موروثی جانشینی کا رجحان بھی بڑھتا گیا اور موروثی اقطاع ایک عام رواج بن گیا۔ یہاں تک کہ پہلے چھ ایلخان (*Ilkhanate*) حکمرانوں کے دور میں بھی فوجیوں کو اقطاع زمین دی گئی، لیکن یہ عام فوجیوں کو نہیں دی گئی تھی بلکہ بنیادی طور پر صرف اعلیٰ حکام کو دی جاتی تھی۔ عام سپاہی طبقے (جو زیادہ تر خانہ بدوش ہوتے تھے) کو تنخواہ کے طور پر صرف اناج دیا جاتا تھا اور کچھ نقد رقم بھی ملتی تھی جسے 'جامگی' کہا جاتا تھا۔ غازان خان کے دور میں اعلیٰ حکام کے درمیان موروثی اقطاع ایک قانونی طور پر منظور شدہ روایت بن چکا تھا۔ اس کے دور حکومت میں، تمام عام طور پر بھرتی کیے گئے جنگجو منگولوں کو اقطاعیں دی گئیں اور رشید الدین کے

مطابق، 'ہر ولایت' کا پورا علاقہ اقطاعات سے بھر گیا۔ اس طرح سلجوقیوں کے دور میں جو اقطاع نظام ترکوں کے تسلط کو وسعت دینے کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا تھا، تیرھویں صدی کے بعد منگول ترک خانہ بدوش سپاہیوں کی اشرافیہ نے بھی اپنے تسلط کو بڑھانے کے لیے اس نظام کو استعمال کیا۔ مسلم حکومتوں کی جغرافیائی توسیع کی بنیاد پر اقطاع نظام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ مغربی اور مشرقی اقطاع نظام کے طریقوں میں واضح فرق ہے۔ 1۔ مغربی اقطاع نظام 2۔ مشرقی اقطاع نظام

مغربی اقطاع نظام: مغربی اقطاع نظام (Western *Iqta* System) اسے کہتے ہیں جو بویہیوں، ہمدانیوں، شمالی شامیوں اور سلجوقوں میں رائج تھا۔ مغربی نظام میں فوجی حکومت کی بنیاد ہر سپاہی کو دیا جانے والا مالگزاری عطیہ تھا، جو نظریاتی طور پر صرف اس کی زندگی تک محدود ہوتا تھا۔ اس کی وصولی نمائندوں کے ذریعے کی جاتی تھی کیونکہ اقطاع یافتہ افسران خود اس علاقے میں نہیں رہتے تھے۔ سلجوقیوں نے اس اقطاع نظام کو مغربی ایران کے علاقوں میں بغیر کسی تبدیلی کے نافذ کیا۔ یہی وہ نظام ہے جس کی وضاحت نظام الملک ابو علی حسن بن علی طوسی (1017–1092) نے 'سیاست نامہ' (مرأۃ الملوک) میں کی ہے۔ اس کتاب میں طوسی کا بنیادی مقصد مقطع کے غیر مناسب کاموں کے خلاف لوگوں کو آگاہ کرنا اور ایک ایسا نظام پیش کرنا تھا جس کے اقطاع کے طور پر منتقل کی گئی زمین ریاست کے کنٹرول سے باہر نہ جا سکے۔ نتیجے کے طور پر، اس نے تمام زمین پر سلطان کے بنیادی اختیار کی بھرپور حمایت کی۔ غالباً حکمران کی طرف سے اپنی ریاست پر مکمل ملکیت کا سامانی نظریہ اس کی بنیاد رہا ہو یا مصنف کا مقصد کسانوں پر سلطان کے اختیارات کو بڑھانا بھی ہو سکتا ہے تاکہ کسانوں کے ساتھ مقطعوں کے من مانے رویے کو حکمرانوں کے ذریعہ روکا جا سکے۔ نظام الدین طوسی نے اسی طرح کے تحفظ کے دیگر اقدامات بھی بتائے ہیں، جیسے شاہی دربار میں کسانوں کی حاضری بلا رکاوٹ ہونی چاہیے، مقطع کو مقررہ رقم سے زیادہ محصول نہیں جمع کرنا چاہیے اور وصولی پیداوار کے مطابق مناسب وقت پر ہونی چاہیے۔ نیز، غیر منصفانہ طرز عمل کو روکنے کے لیے، ہر تین سال بعد مقطعوں کی تقرری میں تبدیلی کی جانی چاہیے۔

مشرقی اقطاع نظام: سامانیوں اور غزنویوں کے تحت خراسان، اترک، مرغاب اور بالائی آمو دریا کے علاقے میں رائج طرز کو مشرقی اقطاع نظام (Western *Iqta* System) کہا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں رائج اقطاع کا نظام کافی مختلف تھا۔ نظام الدین طوسی نے خاص طور پر واضح کیا ہے کہ سامانیوں اور غزنویوں نے عموماً اپنے سپاہیوں کو زمین نہیں دی تھی کیونکہ خراسان کی معاشی خوشحالی کی وجہ سے خراسانی سلاطین نقد تنخواہیں دینے کے قابل تھے۔ مزید برآں، خراسان، سرسبز و شاداب اور زرخیز ہندوستانی علاقے کے قریب واقع تھا، جس کے معاشی وسائل کو وہ سال کی مخصوص مدت میں اپنے فوجیوں کو نقد رقم یا جنس کی ادائیگی کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ خراسان میں ترک نسل کے چرواہوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ ان کا بویہیوں کے ناقابل تبدیل زمینی عطیات کے نظام کے ساتھ تال میل بٹھانا ممکن نہیں تھا۔ آرام طلب تاجک لوگوں میں اس نظام کے پھیلاؤ کی وجہ سے مرکزی مالیاتی نظام کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ غزنویوں کے زمانے سے ہی، زمین کے عطیہ کے بجائے، ان علاقوں میں چرواہوں کو اجتماعی طور پر جانور چرانے کا حق دیا گیا تھا۔ سلجوقی دور میں ان حقوق کی بدولت ہی ترکوں کی گزر بسر اور رزق ملنا ممکن ہوا۔ خراسان اور بالائی آمو دریا کے علاقے فوجی اہمیت کے حامل مقامات تھے، اسی لیے ان علاقوں کی زمینوں کو عام طور پر صرف سلجوق خاندان کے لوگوں کو دیا جاتا تھا۔ ہر نئی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی ان کے علاقوں کے گورنر نئے سرے

سے متعین ہوتے تھے۔ لیکن انتظامی تسلسل اور نظام انتظار کے استحکام کو مد نظر رکھتے ہوئے انتظامی تبدیلیوں سے دور رہنے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی تھی۔ مذکورہ بالا حالات حکومتی عہدوں کو موروثی بنانے میں کافی مددگار ثابت ہوئے۔ اس سے متعلق زیادہ تر ذرائع میں، جو کہ ہم عصر نہیں ہیں، شہزادوں کے اخراجات کے لیے دی گئی زمین 'اپانج' (appanages) کو اکثر اقطاع کہا گیا لیکن اس قسم کی تشریح بہت گمراہ کن ہے، کیونکہ گیارہویں صدی کے نصف آخر میں مغربی دنیا کا زمینی نظام مشرقی دنیا سے بالکل مختلف تھا۔

آہستہ آہستہ اقطاع کی روایت کا نظریہ اور اس سے متعلقہ نظام میں تبدیلی آنے لگی۔ عام طور پر، اس روایت کی خصوصیت سلطان کا مقطع پر بڑی حد تک انتظامی اور معاشی اختیار تھا، جن کی کوئی حقیقی آزاد حیثیت نہیں تھی اور جو مختصراً خدمت کے عوض تنخواہ پاتے تھے۔ اعلیٰ افسروں کو فراہم کردہ اقطاع کے بدلے میں، انہیں اپنی کمان میں ایک فوجی دستہ رکھنا پڑتا تھا جس کا انتظام وہ اقطاع سے حاصل ہونے والی آمدنی سے کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بنیادی مآخذ میں 'بیس کی اقطاع'، 'سو کی اقطاع' وغیرہ کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن سلطان کے ماتحت فوج کے جتنے بڑے فوجی دستوں کی وہ کمان سنبھالتا تھا اس کے مقابلے اس کی اپنی فوجی ٹکڑی چھوٹی ہوتی تھی۔ فوجی ذمہ داریاں کی تکمیل کروانے کے لیے بہت سخت نظم وضبط کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طرح ریاست کی طرف سے کسی، مخصوص شخص کو دی جانے والی اراضی کو اقطاع کہا جاتا تھا۔ عام طور پر اسے زمین کی تفویض کے طور پر سمجھا جانے لگا۔ درحقیقت یہ زمین سے حاصل ہونے والی زمینی آمدنی کا عطیہ تھا۔ مسلم ریاستوں میں لفظ اقطاع اسی مخصوص معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

4.3 دہلی سلطنت میں اقطاع کی روایت (The Tradition of *Iqta* in Delhi Sultanate)

ہند-فارسی متن میں اقطاع کی تعریف مستقبل میں خدمت کی شرائط پر محصول کی منتقلی کے طور پر کی گئی ہے۔ دوبارہ تبادلے کے اصول پر مبنی مالگزاری سے متعلق تقرری کی اس روایت کی دہلی سلطنت کے سیاسی نظام میں بڑی احتیاط سے پیروی کی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ منہاج نے 'ایالت' (*Ayalat*) لفظ کا استعمال اقطاع کے معنی میں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقطاع نظام جس شکل میں ہندوستان میں پہنچا اس کا ابتدائی ڈھانچہ سب سے پہلے خلیفہ مقتدر نے اس طرح تشکیل دیا تھا کہ اپنی خلافت (ریاست) کے مختلف علاقوں میں مقرر کردہ مقطعوں سے باقاعدگی سے محصول حاصل ہوتا رہے۔ یہ مقطع لوگ اپنے صوبے کا سارا محصول جمع کرتے اور انتظامیہ اور سپاہیوں کی تنخواہوں سے متعلق اخراجات کے بعد بچ جانے والی رقم یعنی فواضل (*Fawazil*) میں سے ایک مقررہ رقم انہیں بغداد کے دربار میں بھیجنی ہوتی تھی۔ ہندوستان میں مالگزاری تفویض کی یہ بنیادی خصوصیات، سلطنت کے آغاز سے آخر تک جاری رہیں۔ اقطاع کی مختلف شکلیں درج ذیل تھیں۔

- صوبائی حکمران کو اقطاع کی صورت میں پورا صوبہ دینا اور اس سے عشر، خراج یا لگان (خراجِ عزرہ) یا شخصی محصول (Poll tax) جو بعد میں خراج میں تبدیل ہو گئے، سے حاصل شدہ منافع کے بدلے کچھ زرعی زمین کا عطیہ۔
- تنخواہ یا وظیفے کے ذریعے کسی علاقے کی آمدنی کی منتقلی۔ تاہم، یہاں اقطاع کے نظریاتی دائرہ کو وسعت دی گئی۔ اس میں سرحدوں، دریاؤں اور نہروں سے حاصل شدہ چنگیوں اور محصولات سے متعلق مالگزاری کی ٹھیکیداری (farming of taxes) کو بھی

شامل کیا جانے لگا۔

اقطاعوں کی مذکورہ تمام اقسام میں سب سے زیادہ اہمیت 'انتظامی اقطاع' کو حاصل تھی۔ بلاشبہ یہ ایک فوجی عطیہ تھی لیکن اس کے ساتھ کچھ انتظامی ذمہ داریاں بھی وابستہ تھیں۔ ہندوستان میں دو اقطاع سب سے زیادہ مقبول تھے جنہیں ماوردی نے کچھ اس طرح بتایا ہے۔

- اقطاع تملیک (*Iqta–i–Tamlik*) یعنی بذریعہ تقرری، منتقل شدہ اقطاع۔
- اقطاع استغلال (*Iqta–i–Istighlal*) یعنی ذاتی استعمال کے حق والی اقطاع۔

ان میں سے پہلے یعنی تملیک کا تعلق زمین سے تھا اور دوسرے یعنی استغلال کا تعلق وظیفے یا تنخواہ سے تھا۔ اس اکائی میں ہمارے مطالعے کا اصل موضوع اقطاع تملیک ہی ہے۔ اقطاع حاصل کرنے والے اہلکاروں کو 'مقطع'، 'امیر' اور کبھی کبھی 'ملک' بھی کہا جاتا تھا۔

4.3.1 تنخواہ (Salary)

زر کی قدر (currency value) کو بنیاد مان کر، تنخواہ کے بقدر اقطاع کی مالگزاری تفویض کی جاتی تھی۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد محکمہ مالیات کی ثالثی کے بغیر براہ راست آمدنی کے ذرائع سے تنخواہیں وصول کرنا تھا۔ اگرچہ مقطع کے محنتانے (مواجب) کے بارے میں کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے، لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اسے کچھ حصہ ضرور ملتا ہوگا۔ خانوں، ملکوں اور امیروں کو مرکزی خدمات سے تنخواہیں نہیں دی جاتی تھیں، بلکہ انہیں ان کے عہدے کے تناسب سے زمینی محصولات ہی عطیہ کے طور پر دیے جاتے تھے۔ ہمیں مسالک الابصار کے مصنف سے معلوم ہوتا ہے کہ خان، ملک، امیر اور سپہ سالار محکمہ مالیات کے ذریعے سے عطا کردہ زمین سے مالگزاری حاصل کرتے تھے اور اگر اس میں اضافہ نہیں ہوتا تھا تو کبھی کسی طرح کی کمی بھی نہیں ہوتی تھی۔ عام طور پر انہیں اس تخمینہ شدہ آمدنی سے کہیں زیادہ رقم مل جاتی تھی۔ '**خان**' کو تنخواہ کے طور پر دو لاکھ ٹنکوں کی زمینی مالگزاری تنخواہ کے طور پر ملتی تھی۔ ہر ٹنکے کی قیمت آٹھ درہم کے برابر تھی۔ یہ اس کی ذاتی آمدنی تھی جسے اس کو اپنی کمان میں لڑنے والے سپاہیوں کو دینا ضروری نہیں تھا۔ ایک '**ملک**' کو ملنے والی رقم پچاس سے ساٹھ ہزار ٹنکوں تک ہوتی تھی۔ '**امیر**' کو تیس سے چالیس ہزار ٹنکے اور سپہ سالار کو بیس ہزار ٹنکے یا ان کی قیمت کے برابر مالگزاری حاصل ہوتی تھی۔ سپاہیوں کی تنخواہ دس سے ایک ہزار ٹنکوں کے درمیان مقرر کی جاتی تھی۔ ہمیں ایسی بہت سی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں مقطعوں نے نہ صرف غیر مفتوحہ علاقوں کو فتح کر کے ہی اپنے اقطاع کی توسیع کی بلکہ دوسرے اقطاعوں کو مکمل یا جزوی طور پر اپنے علاقے میں شامل کر کے اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ اس حقیقت سے معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ کا تعین کل مالگزاری کے تناسب کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ تناسب کتنا تھا اس کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ چودھویں صدی کے شروع میں غیاث الدین نے اپنے وزیر محصول (دیوان وزارت) کو ہدایت کی تھی کہ 'اپنے عہدے سے منسلک منافع کے علاوہ اگر ملک اور امیر حضرات اقطاع یا ولایت کے محصول کے دسویں یا گیارویں حصے کا نصف یا پھر دسواں اور پندرہواں حصہ لے لیتے ہیں تو انہیں سزا نہ دی جائے۔ اس میں استعمال کیے گئے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصب سے منسلک مراعات خواہ اس کی قیمت کچھ بھی ہو، عہدے دار کی عام تنخواہ تھی۔ اس کے علاوہ بھی سلطان غیاث الدین تغلق مقطع لوگوں کو منافع کا کچھ فیصد فراہم کرنے کے لیے

تیار تھا۔ غالباً یہ خلجی مرکزیت کے وقت ختم کر دی گئی ایک سابقہ روایت تھی جسے دوبارہ زندہ کیا گیا تھا۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ محمد بن تغلق کے صوبائی حکمران محصول کا بیسواں حصہ بطور کمیشن لیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مقطع کو بڑے اقطاع سے منتقل کر کے چھوٹے اقطاع میں مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔ ہمیں اس کا استثناء صرف سزا کی صورت میں ملتا ہے جب التمش نے کبیر خان کو ملتان سے ہٹا کر اسے پلول کا چھوٹا اقطاع دیا یا 1253 عیسوی میں بلبن نے کشلو خان کو دربار سے نکال کر ناگور کے وسیع اقطاع سے ہٹایا اور اسے کڑا میں مقرر کیا۔ یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ مقطع کو محصول کا صرف ایک مقررہ حصہ فراہم کیا جاتا تھا اور اس کی معاشی حیثیت (چھوٹے) اقطاعدار سے مختلف تھی کیونکہ اس پر مرکزی خزانے کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ دوہزار شمسی اقطاعداروں کی حیثیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں فوج میں ذاتی خدمات کے عوض گاؤں کی مالگزاری بطور تنخواہ فراہم کی گئی تھی۔ بختیار کا اقطاع بھی اسی زمرے میں آتا ہے جو اسے اودھ کے مقطع نے دیا تھا۔ غیر فوجی خدمات کے لیے دیے جانے والے عطیات کے زمرے میں ہی سلطنت کے قاضی اور شہر کے میر داد کی اقطاع ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں ترک حکومت کے ابتدائی دور میں اقطاع کے لیے نظام الملک طوسی کے ذریعے سیاست نامہ میں جس رائے کا اظہار کیا تھا اس کا حوالہ دینا یہاں مفید ہو گا۔ اس مشہور تصنیف میں انہوں نے گیارہویں صدی میں سلجوقیوں، خوارزم شاہیوں اور ترک ریاستوں کے تحت مغربی ایشیا میں سیاسی نظم و نسق کے تجربے کا خلاصہ پیش کیا ہے:

> مقطع لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ رعایا پر ان کے اختیار کا مطلب صرف ان سے مناسب رقم اور اضافی منافع (مال حق) کو پرامن طریقے سے حاصل کرنا ہے... رعایا کی جان، مال اور خاندان کو ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رکھا جائے۔ مقطعوں کا ان پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگر رعایا براہ راست سلطان سے اپیل کرنا چاہتی ہے تو مقطع کو انہیں روکنا نہیں چاہیے۔ جو مقطع ان اصولوں کو توڑتا ہے اسے معزول کر دینا چاہیے چاہیے اور اسے سزا بھی ملنی چاہیے... مقطع اور ولی ان لوگوں پر اسی طرح نگراں کے جیسے ہیں، جس طرح مقطع پر سلطان نگران ہے... ہر ایک تین یا چار سال کے بعد عاملوں اور مقطعوں کا تبادلہ کرنا مناسب ہے تاکہ وہ زیادہ طاقت نہ حاصل کر سکیں۔

یہ امر اہم ہے کہ ہندوستان میں اس روایت پر کافی تفصیل کے ساتھ عمل کیا گیا اور فوجی صوبیداری عہدے کا نظام بھی نافذ کیا گیا۔ طوسی کی تفصیل سے درج ذیل خصوصیات واضح ہوتی ہیں:

- مقطعوں کے لیے اتنی ہی رقم جمع کرنا مناسب ہے جتنی ریاست نے واضح کی ہے۔
- جہاں تک ممکن ہو، مقررہ رقم کی وصولی کے لیے طاقت کا استعمال نہ کیا جائے۔
- رعایا کو پورا حق حاصل تھا کہ وہ اپنا مقدمہ براہ راست سلطان کے سامنے پیش کر سکے۔
- مقطع صرف ایک سرکاری اہلکار تھا جس کی تعیناتی قابل تبادلہ تھی۔ یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ یہ تبادلہ باقاعدہ وقت کے اندر ہو جائے گا تاکہ بہتر نظم و نسق برقرار رہے اور مقامی لوگوں میں کسی قسم کا عدم اطمینان بھی نہ ہو۔

4.3.2 اقطاع نظام کے نفاذ کے مقصد (Reasons for Implementation of the *Iqta* System)

ترکوں کو انتظامیہ سے متعلق بہت سے پیچیدہ مسائل کا سامنا تھا۔ جتنے وسیع علاقے کے نظم و نسق کی ذمہ داری ان کے اوپر تھی اس کے مقابلے میں ان کے پاس دستیاب وسائل کافی کم تھے۔ ابھی تک ہندوستان پر صرف راجپوت جاگیرداروں کی حکومت تھی۔ اس سے بھی

بڑھ کر مقامی اہمیت کے بہت سے مسائل سامنے آئے جن کا حل بھی مقامی سطح پر ممکن تھا۔ ترکوں نے جلد ہی سمجھ لیا کہ اتنے وسیع علاقے پر موثر حکمرانی قائم کرنا ملک کے اندر بہت سے غیر مرکزی رجحانات اور سرحدوں پر غیر ملکی حملوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کی وجہ سے ایک مشکل مسئلہ تھا۔ ترک حکمران اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ریاست کے وسائل کو مربوط کر کے اپنی طاقت کو مضبوط کیے بغیر مذکورہ بالا مسائل کا حل ممکن نہیں۔ صورتحال کے پیش نظر اس سے نپٹنے کے لیے تیرھویں صدی میں رائج اقطاع نظام کو ہندوستان میں نافذ کیا گیا۔ ایبک اور التمش نے اس نظام سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان حکمرانوں نے اقطاع نظام کو ہندوستانی معاشرے سے جاگیرداری کو ختم کرنے اور سلطنت کے دور دراز حصوں کو مرکز سے جوڑنے کے ایک اہم ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ اس سے ترک حکمران طبقے کی پیسے کی ضرورت بھی پوری ہوئی اور نو مفتوحہ علاقوں میں امن وامان کے قیام کے ساتھ ساتھ مالگزاری کی وصولی کا ضروری مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس ریاست میں ضرورت سے زیادہ مرکزیت ہو وہاں انتظامیہ کی عسکریت بھی ناگزیر ہے۔ اس کے لیے بڑی فوج کی ضرورت ہے۔ سلطنت کے ابتدائی دور میں ابھی نظام زر (currency system) مستحکم نہیں ہو سکا تھا۔ اہلکاروں کو تنخواہوں کی ادائیگی کا واحد ذریعہ مالگزاری کا عطیہ تھا۔ اس وجہ سے، مالگزاری کی تفویض کا نظام (اقطاع) ایک اہم ترین ادارے کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں اقطاع نظام کو نافذ کرنے کی ایک اور اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ سلطان کو اضافی پیداوار کا ایک بڑا حصہ مہیا کر سکتا تھا۔ ریاست کی آمدنی کا یہ حصہ خراج کے طور پر لیا جاتا تھا اور اس وقت تک یہ باقاعدہ محصول بن چکا تھا۔ اس مالگزاری (زمینی مالگزاری) کے نظام کے تحت، کسان اپنی گزر بسر سے متعلق کم از کم ضروریات کو پورا کرنے کے بعد، اپنے زرعی فواضل کا زیادہ تر حصہ ریاست کو خراج کی شکل میں دیتا تھا۔ اقطاع کے حکام (جنہیں مقطع یا ولی کہا جاتا تھا) خراج اور دیگر ٹیکس جمع کر کے اپنی اور اپنے سپاہیوں کی کفالت کرتے تھے اور زائد رقم (فواضل) سلطان کے خزانے میں بھیج دیتے تھے۔ اس طرح بہت زیادہ محصولات دستیاب ہونے کی وجہ سے ہی مسلم ریاستیں بڑی فوجوں کو برقرار رکھنے کے قابل ہوئیں اور ان ریاستوں میں متعدد بڑے شہروں کی ترقی ممکن ہوئی۔ سلطانوں نے امیر طبقے کو نقد تنخواہ کے بدلے گزر بسر کے لیے اقطاع عنایت کی۔ اس طرح نظام اقطاع میں یہ دونوں کام موجود تھے: کاشتکار طبقے سے فاضل پیداوار کی وصولی اور اس کی حکمران طبقے میں تقسیم۔ یہ کام کچھ اس طرح کیا گیا کہ دلی سلطنت کے سیاسی ڈھانچے میں منحصر اتحاد کو فوری طور پر کوئی خطرہ درپیش نہ آئے۔

4.3.3 اقطاع کا رواج (Prevalence of the *Iqta* System)

غوری فتوحات کے بعد جلد ہی شمالی ہندوستان میں اقطاع نظام قائم ہو گیا۔ غور کے معزالدین محمد سام (محمد غوری) نے 1192ء میں قطب الدین ایبک کو ہانسی میں مقرر کیا اور کچھ کا علاقہ ملک ناصر الدین استام کو دے دیا۔ ایبک کا دور حکومت 1206 تا 1210، بہت مختصر تھا۔ اس وجہ سے اس کے تحت اقطاع نظام کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1210 میں التمش کی تخت نشینی کے ساتھ ہی اقطاع نظام، دہلی سلطنت کے نظام حکومت کی بنیاد بنا۔ اس کے دور حکومت کے چھبیس سالوں (1211 تا 1236 عیسوی) کے دوران، ملتان اور لکھنوتی کے درمیان پوری سلطنت کو بڑے اور چھوٹے علاقوں میں تقسیم کیا گیا جسے اقطاع کہا جاتا تھا اور جو مقطع نامی ایک خاص افسر کے زیر انتظام تھے۔ اس طرح اقطاع کے دو زمرے تھے - پہلا، خالصہ کے بارہ صوبائی سطح کے اقطاع اور دوسرے، کچھ دیہات کی

شکل میں چھوٹے اقطاع۔ اعلیٰ امیروں کو صوبائی سطح کے اقطاع دیے گئے جن کے ساتھ مالگزاری اور انتظامیہ دونوں سے متعلق ذمہ داریاں وابستہ تھیں۔ ان بڑے اقطاعوں کے حاملین کو 'مقطع' کہا جاتا تھا۔ منہاج اور برنی نے عموماً تمام ذمہ دار عہدوں پر تقرریوں کے سلسلے میں اسی مقطع کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دوسری طرف سلطان اپنے مقرر کردہ سپاہیوں (سوار قلب) کو تنخواہ کے عوض کچھ دیہاتوں کو ملا کر چھوٹے چھوٹے اقطاع دیا کرتا تھا۔ یہ اقطاعات، خالصہ کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔ ان اقطاعداروں کو کسی قسم کی انتظامی یا معاشی ذمہ داریاں نہیں دی جاتی تھیں۔ برنی کے مطابق التمش کے وقت دو ہزار ایسے اقطاعدار تھے جن کے پاس کوئی انتظامی ذمہ داری نہیں تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تیرہویں صدی میں سلاطین نے چھوٹے بڑے علاقے مختلف امرا کو عطا کیے جنہیں انتظامی، مالگزاری اور عسکری امور انجام دینے ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقطع بھی اپنے اقطاع میں سے چھوٹے اقطاع جسے چاہے دے سکتے تھے۔ بدایوں کے مقطع تاج الدین سنجر قتلغ نے 1242–43 عیسوی میں منہاج سراج کی گزر بسر کے لیے اسے اقطاع دی جب اسے (سراج) دہلی چھوڑنا پڑی۔

تیرہویں صدی میں ایک طویل عرصے تک، مواسات (باغی علاقے) یا غیر متعینہ علاقوں کے مقامی حکمرانوں سے زبردستی وصول کیے گئے محصول یا تحائف (جانوروں اور غلاموں کی شکل میں) اور مال غنیمت پر ہی مقطع لوگ انحصار کرتے تھے۔ دوآب اور کٹیہر میں بلبن کی مہمات بہت بڑے پیمانے پر منظم اسی طرح کے چھاپے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رائے، رانا یا رانک اور دوسرے لوگ پرانے نظام کے مطابق محصول اور دیگر اقسام کے منافع وصول کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے ٹیکسوں کے صرف نام ہی ہمیں معلوم ہیں اور ان کے بارے میں کوئی خاص اور مستند معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ اس طرح جمع ہونے والے محصول کا کچھ حصہ سلطان کے مقرر کردہ افسر کو ملتا تھا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ التمش کے دور میں بلبن کے لیے زمین سے متعلق دو ہزار تقرریوں کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ریاست کے بارے میں بلبن کے نظریے سے یہ تقرریاں مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ اس نے دوآب میں دو ہزار سوار فوجیوں کو دیے گئے اقطاعات کی شرطوں اور ان کے حقوق سے متعلق شرائط اور مدت کی جانچ کرائی۔ اس وقت تک ابتدائی طور پر مقرر کردہ بہت سے فوجی مر چکے تھے اور جو ابھی زندہ تھے وہ بڑھاپے کی وجہ سے فوجی خدمات کے قابل نہیں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اقطاع پر قبضہ کر رکھا تھا اور وہ تمام اس پر موروثی حقوق کا دعوی کرنے لگے تھے۔ تاہم، اس سلسلے میں بلبن کی رائے مختلف تھی۔ اس کے مطابق انہیں یہ اقطاع ان کی فوجی خدمات کے عوض ملے تھے۔ بنیادی طور پر مقرر کردہ شخص کی مدت کار پوری ہونے پر وہ معاہدہ ہی منسوخ ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر اسے اقطاع دی گئی تھا۔ دوسری طرف ان اقطاعداروں کا کہنا یہ تھا کہ ان کے آباؤ اجداد نے یہ تمام اقطاعیں ریاست کے لیے ان کی فوجی خدمات کے صلے میں بطور 'انعام' حاصل کی تھیں اور ان میں آئندہ کے لیے کسی طرح کی ذمہ داری منسلک نہیں تھی۔ انہوں نے غالباً اقطاع پر موروثی اختیار کا دعویٰ کرنے کے معاملے میں سلجوقی روایت کا سہارا لیا تھا۔ بلبن حالانکہ باقی تمام معاملات میں سلجوقی سلطان سنجر کو اپنا رہنما سمجھتا تھا، لیکن وہ اقطاع کے حوالے سے اس کی پیروی کرنے کو تیار نہیں تھا۔ قانون کے نقطہ نظر سے اس کی رائے درست تھی۔ اس سلسلے میں عام طور پر قبول شدہ اصول یہ تھا:

عرفان حبیب کے مطابق 'اگر مقطع آخر تک سرگرمی سے خدمات انجام دیتا رہا تو مالگزاری پر اس کا حق برقرار رہنا فطری تھا۔ اس کے مرنے پر اس کے مالگزاری کے حقوق واپس ریاست کے پاس چلے جاتے تھے۔ اس کے جانشینوں کی پنشن کا انتظام کسی اور عہدے سے کیا جاتا

تھا۔ بیماری کی وجہ سے معذوری کی صورت میں مقامی روایت کے مطابق محصول میں سے دوسرا حصہ مقرر کیا جاتا تھا، یا تو اسے تنخواہ ملتی رہتی یا پھر بیماری کی وجہ سے اسے کسی اور ذریعے سے پنشن دی جاتی تھی۔ اقطاع ساری زندگی کے لیے نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی اقطاعدار اسے اپنے ورثاء کو منتقل کر سکتا تھا کیونکہ ریاست زمین پر اپنے حقوق سے دستبردار ہو کر اپنا مالی اقتدار اعلیٰ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اگرچہ بلبن نے دہلی کے کوتوال فخرالدین کی مداخلت کی وجہ سے کچھ مراعات ضرور دیں، لیکن اس نے وراثتی حق کے اصول کو ضرور رد کر دیا۔ اس نے اقطاعدار کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور کنٹرول کرنے کے لیے ایک خواجہ (محاسب) کو بھی مقرر کیا تھا۔ بلبن کی طرف سے مقطع کے ساتھ ایک خواجہ کی تقرری اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ سلطان کی حکومت غالباً یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ اقطاع کے تحت حقیقت میں کتنا جمع ہوتا ہے اور کتنا خرچ ہوتا ہے۔'

خلجی اور تغلق حکمرانوں کے دور میں اس طرح کی تقرریوں کا رواج ختم ہونے لگا۔ صوبائی انتظامیہ میں پیچیدہ نظام شامل کر کے انتظامیہ میں خاطر خواہ تبدیلیاں کی گئیں۔ اس تبدیلی کی جڑ میں 'شق' نامی ایک نئے نظام کا وجود میں آنا فطری تھا۔ اس طرح ان حکمرانوں کے تحت اقطاع میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ تیرہویں صدی کے آخری عشرے سے پہلے مقطعوں نے غیر فوجی (سول)، فوجی اور اقتصادی معاملات میں مکمل انتظامی اختیار کا فائدہ اٹھایا۔ اس کے بعد اقطاع کا نظم و نسق مکمل طور پر ان کے اختیار میں نہیں رہا۔ مالگزاری کے معاملے میں وہ زیادہ سے زیادہ مرکزی حکومت کے کنٹرول میں ہوتے گئے۔ انہیں جمع شدہ پوری رقم اور اس کے اخراجات کا حساب پیش کرنا پڑتا تھا۔ وہ اپنے اور اپنی فوج کے لیے صرف ایک مخصوص رقم لے سکتے تھے، بقیہ شاہی خزانے میں جمع کرنی ہوتی تھی۔ علاؤالدین خلجی (1296–1316) کے دور میں بڑی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ سلطان کے دور میں سلطنت کی سرحدوں کی بے تحاشا توسیع اور پرانے علاقوں میں آباد کسانوں پر مکمل ٹیکس کا نفاذ، ایک ساتھ ہی ہوا۔ حکمران طبقے کی آمدنی میں اس بے مثال اضافے کے ساتھ ہی کئی ایسے قدم اٹھائے گئے جن سے اقطاع نظام پر اثر پڑا۔ جیسے جیسے مزید دور دراز علاقے سلطنت کے قبضے میں آتے گئے اور انہیں بطور اقطاع تقسیم کیا گیا، ویسے ویسے دارالحکومت دہلی سے ملحقہ علاقے خالصہ زمین کا حصہ بنتے گئے۔ اب پورا وسطی دوآب اور جدید روہیل کھنڈ کے کچھ حصے اس کے تحت آ گئے۔ سلطان کے ذاتی گھڑسوار دستوں (حشم) کو تنخواہ کے طور پر اقطاع کی شکل میں گاؤں نام کرنے کا رواج ختم کر دیا گیا۔ خالصہ کی پوری مالگزاری خزانے میں جمع کر دی جاتی تھی اور سپاہیوں کو نقد تنخواہیں ادا کی جاتی تھیں۔ یہ نظام محمد بن تغلق کے دور حکومت کے آخر تک اسی طرح جاری رہا۔

مورلینڈ کے مطابق علاؤالدین خلجی نے اپنے جرنیلوں (مقطع، ولی) کو اقطاع دینے کا رواج برقرار رکھا۔ اب جو نیا عنصر آیا وہ یہ تھا کہ انتظامیہ میں سلطان کی نوکر شاہی کی مداخلت بڑھ گئی۔ مزید برآں، محکمہ مالیات (دیوانِ وزارت) ہر اقطاع کی مالگزاری سے ہونے والی آمدنی کی مقررہ رقم کا تخمینہ لگاتا تھا۔ محکمہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ کسی طرح اس تخمینہ کی رقم میں اضافہ کا موقع ہاتھ آئے۔ مقطع یا ولی کے ماتحت فوج کی تنخواہ (مواجب) کے لیے اقطاع کی تخمینہ رقم کا ایک مخصوص حصہ چھوڑنے کا انتظام تھا۔ جتنی زمین سے اتنی رقم کی فصل پیدا ہو سکتی تھی اتنی زمین کو دیوان الگ کر دیتا تھا، باقی زمین مقطع کی اپنی اقطاع سمجھی جاتی تھی، یعنی اس کی ذاتی تنخواہ اور اس کے ذاتی عملے اور نوکر چاکروں کے لیے ہوتی تھی۔ اگر وصولی اس رقم سے تجاوز کر جاتی جتنی اسے اپنے سپاہیوں کی تنخواہوں اور اپنی ذاتی آمدنی کے لیے لینے کی

اجازت تھی، تو اسے اضافی رقم خزانے میں جمع کرانی پڑتی تھی۔ یہ فطری بات تھی کہ مقطعوں کے دل میں اپنی حقیقی آمدنی چھپانے اور سلطان کو دی جانے والی فاضل رقم کو کم کرنے آنکنے کا لالچ پیدا ہی جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی، اپنی وصولی کو زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے، مقطع اپنی اقطاعوں میں تعینات افسران کے غبن پر قابو پانے کا خواہاں رہتا تھا۔ اس طرح، جہاں سلطان کی حکومت مقطعوں کے آمدنی کو چھپانے یا غبن کرنے کے رجحان کو روکنے کا ارادہ رکھتی تھی، مقطع بھی اسی طرح اپنے ماتحتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دونوں ہی سطح پر جانچ پڑتال (audit) کے ایک حصے کے طور پر سخت کارروائی کا انتظام تھا جس میں جیل سے لے کر جسمانی اذیت تک شامل تھی۔ ابتدائی تغلق حکمرانوں کے زمانے میں اقطاع یافتہ عہدیداروں کی حیثیت میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ غیاث الدین تغلق نے اقطاع کی آمدنی میں سے مقطع کی ذاتی آمدنی اور اس کے ماتحت فوجیوں کی تنخواہوں میں واضح طور پر تقسیم کی۔ برنی کے مطابق اس نے مقطع اور ولی کے لیے درج ذیل احکامات بھیجے تھے۔

> اگر تم چاہتے ہو کہ دیوانِ وزارت (محکمہ مالیات) کے دفتر میں آنے سے آزاد رہو اور بحیثیت امیر یا ملک تمہاری شہرت، رسوائی اور بدنامی میں نہ بدل جائے تو تم اپنی اقطاع سے تھوڑی مقدار میں ہی زائد (منافع) لو اور اس چھوٹی رقم میں سے کچھ اپنے گماشتوں کے لیے محفوظ رکھو، لیکن فوجیوں کی تنخواہ کے کمترین حصے کا بھی لالچ نہ کرو۔ اگر تم فوجیوں کے لیے مقرر کردہ مال میں سے تھوڑا سا بھی حصہ ملنے کی امید کرتے ہو تو امیر یا ملک کے معزز الفاظ تم لوگوں کے لیے استعمال کرنا غیر مناسب ہوگا۔ اپنے نوکروں کی تنخواہ کا چھوٹا حصہ ہڑپنے سے تو امیر کے لیے دھول پھانکنا بہتر ہے۔ تاہم اگر ملک یا امیر اپنے مخصوص علاقے یا صوبے کی آمدنی کے دسویں یا گیارہویں حصے کا نصف اور دسواں یا پندرہواں حصہ اور اقطاع کے افسر یا صوبائی حکمران کے منصب سے منافع کا حصہ لیتا ہے تو ان منافع کو لینے سے اسے روکنے کی کوئی صورت نہیں پیدا ہوتی اور اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا یا امیروں سے اسے زبردستی وصول کرنا قابل مذمت ہے۔

اس اقتباس سے درج ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

1. کسی مخصوص اقطاع سے حاصل ہونے والی کم از کم آمدنی کا سرکاری طور پر تعین کیا جاتا تھا، جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا:
   (الف) مقطع کے تحت رکھے گئے فوجیوں کی تنخواہ۔ (ب) مقطع کی ذاتی تنخواہ یا اس کی آمدنی۔
2. اگر اقطاع کی تخمینہ کردہ کم از کم آمدنی سے زیادہ جمع ہو جائے تو اسے عام طور پر شاہی خزانے میں بھیجا جانا چاہیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جلال الدین خلجی نے علاء الدین کو فواضل (اضافی آمدنی) بھیجنے سے آزاد کر دیا تھا۔
3. لیکن اس زائد یا فواضل (آمدنی) میں سے، اقطاع کی کل مقررہ سالانہ آمدنی کا 4 سے 10 فیصد (حصہ) مقطع خود استعمال کر سکتا تھا۔
4. مقطع کو اقطاع کی آمدنی میں سپاہیوں کے لیے مختص رقم میں سے کچھ بھی لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس تناظر میں مسالک الابصار کا بیان قابل غور ہے کہ مقطع لوگوں کے سپاہیوں کو نقد تنخواہ ملتی تھی۔

اگلا مرحلہ مالگزاری اور اقتصادی حقوق کو فوجی ذمہ داریوں سے الگ کرنا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اہم تبدیلی محمد تغلق کے اقتدار میں آنے کے بعد آئی۔ اب مالگزاری سے متعلق ذمہ داریاں مقطع اور ولی سے نئے افسر ولی الخراج کو سونپ دی گئیں۔ ابن بطوطہ واضح طور پر کہتا ہے کہ اقطاع میں دو افسر مقرر تھے۔ پہلا ولی الخراج تھا جو محصول جمع کرتا تھا اور دوسرا امیر تھا جو فوج کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اقطاع پر مرکزی گرفت کم کرنے کا رواج فیروز شاہ تغلق کے دور میں شروع ہوا تھا۔ وہ امیروں کو رعایتیں دینے پر اسے مجبور ہونا پڑا۔ اس نے اقطاع پر

جانشینی کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ تقرریوں کے تبادلے کو بھی روک دیا۔ مزید برآں اس نے فوجیوں کو زمینی عطیہ کی شکل میں تنخواہیں دینے کے رواج کو بحال کیا، جسے اس دور میں 'وجہ' کہا جانے لگا۔ جب اس عمل کو مقطعوں کے سپاہیوں پر لاگو کیا گیا تو اس سے زمین کی ذیلی تفویض کے رجحان کو حوصلہ ملا۔ ایسی صورتحال کی وجہ سے فوجیوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اقطاع کے نظم ونسق میں مداخلت کرنا مرکز کے لیے ایک مشکل کام بن گیا۔ لودیوں کے دور میں زمین کی ذیلی تفویض کثرت سے رائج ہوگئی۔ اس وجہ سے اقطاعوں میں وہ 'دوہری انتظامیہ' (مرکز کی مداخلت ساتھ ہی مقطعوں کا نظام حکومت) فیروز شاہ کے دور میں نظر نہیں آتی تھی، جو محمد تغلق کے دور میں رائج تھی۔

4.3.4 اقطاع کی علاقائی تقسیم (Regional Distribution of *Iqta*)

زیر مطالعہ دور میں اقطاع کو ایک مخصوص انداز میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی اقطاعیں دہلی کے ارد گرد مرکوز تھیں۔ اس کے برعکس بڑی بڑی اقطاعیں سلطنت کے دور دراز علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ دہلی کے آس پاس واقع چھوٹی اقطاعوں کی تعداد بڑے علاقوں میں پھیلی ہوئی اقطاعوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس طرح یہ تمام اقطاعیں پوری سلطنت میں بہت ناہموار طریقے سے پھیلی ہوئی تھیں۔ التمش کے زمانے میں منہاج کے ذریعے بیان کردہ اہم مقطعوں کے سوانحوں سے اس بارے میں کچھ معلومات فراہم ہوتی ہے کہ تیرہویں صدی میں مقطعوں کا انتخاب کیسے کیا جاتا تھا۔ اس سوانحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کی زندگی غلام کی طرح شروع ہوئی۔ اقطاع حاصل ہونے سے پہلے وہ دربار میں مختلف عہدوں پر متعین رہ چکے تھے۔ انہیں مقطع کے ذمہ دار عہدوں پر تبھی تعینات کیا جاتا تھا جب سلطان کو ان کی قابلیت اور کارکردگی پر پورا بھروسہ ہو جاتا تھا۔ عموماً یہ طریقہ پوری سلطنت میں کم و بیش رائج تھا۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ اقطاعدار، مقطع یا ولی کے عہدوں میں فرق کے متعلق تمام بحثیں محض قیاسی ہیں کیونکہ اس معاملے میں عصری شواہد نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ متضاد بھی ہیں۔ عام طور پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ چھوٹے اقطاع کے ذمہ داروں کو اقطاعدار کہا جاتا تھا اور بڑے اقطاع کے عہدیداروں کو مقطع یا ولی کہا جاتا تھا۔ ان کے حساب کتاب دیوانِ زیارت سے طے ہوتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لودی دور تک مقطع کو اکثر وجہدار (*Wajahadar*) کہا جانے لگا تھا۔ یہاں یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ منتقل شدہ زمین کو اب بھی اقطاع کہا جاتا تھا۔ عوام الناس میں یہ حکام 'مقطع'، 'حاکم' اور 'امیر' کے ناموں سے بھی مشہور تھے۔ سلطان سکندر لودی کے فرمان میں خاص طور پر ذکر ہے کہ 'املاک' اور 'وظائف' اقطاع میں شامل نہیں ہیں۔ اگر کوئی امیر شاہی فرمان کی نافرمانی کرتے ہوئے 'وجہ معاش' یافتہ پر ظلم کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی اور اسے سکندر لودی سرکاری ملازمت سے ہٹا دیتا تھا۔ اسی طرح کوئی امیر اس زمین پر اپنا حق قائم نہیں کر سکتا تھا جس کا تقرری سے متعلق حکم نامے میں ذکر نہ ہو۔

4.3.5 منصب اقطاع کی مدت کار (Tenure for the Office of *Iqta*)

سیاست نامہ کے مصنف نظام الدین طوسی کے مطابق مقطع کی مدت تین سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ طوسی اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر دو یا تین سال بعد مقطعوں کو منتقل کیا جانا چاہیے ورنہ وہ بہت طاقتور ہو سکتے ہیں۔ دہلی کے ابتدائی سلاطین نے اہم تبدیلیوں کے ساتھ اسی طرز عمل کی پیروی کی۔ چند اہم اقطاعوں جیسے اودھ، بدایوں، برن، اور لاہور میں تقرریوں اور تبادلوں کے گہرے مطالعہ کے بعد معلوم

ہوتا ہے کہ اس عرصے میں مقطع کے عہدے پر تقرری کی اوسط مدت چار سے پانچ سال کے درمیان تھی۔ لیکن لکھنوتی جیسے دور دراز کے اقطاعوں کے سلسلے میں پالیسی زیادہ سخت تھی۔ اس قسم کے اقطاع پر تقرری کی اوسط مدت تین سال تھی۔ اودھ، بدایوں، برن، لاہور اور ملتان جیسے اہم اقطاعوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دہلی کے قریب کی اقطاعیں اس کثرت سے منتقل نہیں ہوئیں جتنا کہ لکھنوتی جیسی جگہوں پر رائج تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب التتمش نے 1225 عیسوی میں بنگال کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو مقطعوں کے متعلق اصول بدل گئے۔ ان کے متواتر تبادلوں کی وجہ سے 1230 عیسوی سے 1233 عیسوی کے درمیان ایک کے بعد ایک چار مقطع لوگوں کا تبادلہ ہوا۔ صرف 1233 عیسوی میں تین تبادلے ہوئے۔ التتمش کے جانشینوں کے زمانے میں دہلی کے قریبی اقطاعوں میں ایک سے دو سال کے عرصے کے درمیان بار بار تبادلے ہوتے رہے۔ علاؤالدین اور محمد تغلق کے دور میں چند اہم اقطاعوں جیسے اودھ، گجرات، کڑہ، ملتان کی تقرری کی اوسط مدت پانچ سے چھ سال تھی۔ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں اقطاعوں کی منتقلی کا رواج کمزور پڑنے لگا۔ مقطع لوگوں کا منصب موروثی ہونے لگا۔ مثال کے طور پر، اودھ کے امیر نظام الملک نوا کی وفات کے بعد، فیروز شاہ تغلق نے اس کے بیٹے ملک سیف الدین کو اودھ کا مقطع مقرر کیا۔

لودی اور سور حکمرانوں نے اپنے شاہی اختیارات اور طاقت کا استعمال کرتے ہوئے حسب منشا امرا کو اقطاع سے منتقل کرتے اور معزول بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ افغان دور کے مقطع لوگوں کی اکبر اور اس کے جانشینوں کے دور میں مغل امیروں کی طرح اتنی کثرت سے منتقلی نہیں ہوتی تھی۔ سلطان کا اعتماد کھونے کے بعد ہی مقطعوں یا وجہداروں کو ان کے اقطاع سے ہٹایا جاتا تھا۔ کچھ ایسے امیر بھی تھے جن کے جانشینوں نے اس منصب اور وقار کے لیے اپنی اہلیت ثابت کی اور اپنے آباؤاجداد کے اقطاع پر اپنے آپ کو برقرار رکھا۔ لیکن ایک امیر کی موت کے بعد سلطان اس کے بیٹوں کو اس عہدے اور وقار کے لیے جب نااہل سمجھتا تھا تو وہ اقطاع پر ان کے حقوق ختم کر سکتا تھا۔ یہ لڑکے اپنے باپ کا مقام و منصب صرف سلطان کی مہربانی سے ہی حاصل کر سکتے تھے کیونکہ جانشینی کے اصول کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ اور اس کے جانشین ضرورت کے مطابق امیروں کو اقطاع سے منتقل اور برطرف بھی کرتے تھے۔ کوئی امیر ان کے حکم کی نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اسلام شاہ کے تخت پر فائز ہونے کے بعد پرانے امیروں کو ان کے اقطاعوں سے بڑے پیمانے پر تبادلہ کر دیا گیا، کیونکہ اسلام شاہ ان کے ساتھ عداوت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے پسندیدہ اشخاص کو بھی سیاسی وجوہات یا سزا کے طور پر تبادلے یا برطرفی کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امیر لوگ ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے۔ ملک میں بدنظمی اور بحرانی صورتحال کے باوجود سلطان عادل شاہ نے ناپسندیدہ امرا کا اقطاع سے تبادلہ کیا۔

4.3.6 مقطع کے فرائض اور اخراجات (Duties and Expenses of the *Muqta*)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سپاہیوں کے دستے کی دیکھ بھال اور تربیت کو بعد میں مقطع کی ذمہ داریوں میں شامل کر دیا گیا۔ اے بی ایم حبیب اللہ کے مطابق 'الکامل فی التاریخ' (1205) کے مصنف ابن اثیر نے مقطعوں کے سپاہیوں کو ہتھیاروں سے لیس کرنے کا ذکر کیا ہے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی کے اوائل میں سلطان کی طرف سے دیے گئے اقطاع عطیات سے متعلق شواہد کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقطع کے اہم کام درج ذیل تھے:

1. مقامی جاگیرداروں اور بیرونی حملوں کے خلاف جنگ کرنا۔
2. اہم شہروں اور چوکیوں میں اپنے نمائندے مقرر کرنا۔
3. اپنے پیاروں اور اہل علم کو بلا محصول زمین فراہم کرنا۔
4. انہیں عطا کردہ زمینی مالگزاری سے فوجیوں کی مناسب تعداد کو برقرار رکھنا۔

ان سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ سلطان کو جب بھی اور جہاں بھی ضرورت ہو گی فوجی مدد فراہم کریں گے۔ 1204 عیسوی میں محمد غوری نے لاہور اور ملتان کے مقطعوں کو زمینی محصول کے بقایاجات بھیجنے کی ہدایات بھیجی تھیں تاکہ وہ ماوراالنہر میں مہم کی تیاری کر سکے۔ برنی کے مطابق، بلبن کا بیٹا شہزادہ محمد جو سندھ کا ولی تھا، ہر سال اپنے صوبے کا محصول ذاتی طور پر اپنے والد کو بھیجتا تھا۔ کڑہ اور اودھ کے مقطع علاؤالدین خلجی نے سلطان جلال الدین خلجی سے صوبے کے فواضل (اضافی آمدنی) کو گھوڑوں کی خریداری اور چندیری کی مہم کے سلسلے میں سپاہیوں کی بھرتی کے لیے استعمال کرنے کی اجازت طلب کی۔ اگرچہ ہر مقطع فوجی خدمات کا پابند تھا، لیکن عام طور پر صرف دہلی کے پڑوس کے لوگوں کو ہی حاضر رہنے کی اجازت تھی۔ برنی کی تصنیف تاریخ فیروز شاہی کے ایک اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تغلقوں کے ماتحت مرکزی حکومت نے صوبائی فوج کی تعداد، تنخواہ اور ساز و سامان مقرر کر دیا تھا جس میں مقطع کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس میں شک ہے کہ آیا یہ 'پرانے' رواج کا دوبارہ آغاز تھا کیونکہ تیرہویں صدی میں رائج خود مختاری کے ساتھ اس کے کام کاج پر ایسی حد لگانا متضاد لگتا ہے۔ علاؤالدین کی طرف سے حکمرانی کی مرکزیت سے پہلے، اقطاع کی فوجی انتظامیہ میں اتنی وسیع مداخلت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلبن نے سمانہ اور سنام کے مقطع بغرا خان کو فوجیوں کی نئی بھرتی کے ذریعے صوبائی فوجیوں کی تعداد کو دوگنا کرنے اور سپاہیوں کی تنخواہوں میں اضافہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ سلطان نے اس بات پر بھی زور دیا کہ وہ اپنے فوجی امور کے بارے میں تفصیلی معلومات رکھے۔ 'فوج کے لیے کسی بھی اخراجات کو بہت زیادہ نہ سمجھو اور تمہارے عارض (فوجی انتظامیہ کا سربراہ) کو چاہیے کہ وہ پرانے فوجیوں کو برقرار رکھتے ہوئے، نئے بھرتی کریے اور اپنے محکمے کے ہر ایک خرچ سے واقف رہے۔ صوبے کے فوجی دستے کی تعداد کا ہمیں کہیں بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا لیکن صوبائی مالگزاری کے مطابق اس تعداد میں اختلاف ضرور رہا ہو گا۔ اس طرح مقطعوں کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ سلطان کی خدمت کے لیے ہمہ وقت مستعد فوجیوں کا دستہ برقرار رکھیں اور پورے داخلی انتظامیہ کی نگرانی کریں۔ اس کی دیگر ذمہ داریاں اپنے علاقے میں امن وامان کو برقرار رکھنا، لوگوں کے جان ومال کا تحفظ کرنا اور سماج دشمن عناصر کو صوبے کے امن وسلامتی کو خطرے میں ڈالنے سے روکنا تھا۔ وہ اقطاع کے ذریعہ مالگزاری کی چھان بین اور معائنہ کرتا تھا۔ اندرونی تجارت کی حوصلہ افزائی بھی مقطع کے ضروری فرائض میں سے ایک تھی۔

اقطاع کی آمدنی پر مقطع کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ بعض اوقات انہیں مرکز کو اضافی آمدنی کی ایک سالانہ رقم بھیجنی پڑتی تھی۔ اس کا تعین پرگنوں اور دیہاتوں کے سابقہ کاغذات کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ دیوان اعلیٰ میں ان کے حساب کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ اگر تمام رسمی کارروائیاں ٹھیک طریقے سے مکمل ہو جاتیں تو متعینہ افسر (مقطع) کو اپنے اقطاع کی انتظامیہ کو رضاکارانہ طور پر چلانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اگر اقطاع سے دیوان کے تخمینہ سے زیادہ آمدنی ہوتی تو مقرر کردہ افسر کو اس کے استعمال کے لیے سکندر لودی جیسے سلطان سے اجازت

لینی پڑتی تھی۔ اپنی اقطاع میں اعلیٰ ترین حاکم ہونے کی وجہ سے وہ مذہبی لوگوں کو تھوڑی بہت زمین دے بھی سکتا تھا۔ مقطع یا وجہدار نے اپنی اقطاع میں کھیتی کی ترقی میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ کاشتکاروں کو نئی زمین پر کاشت کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی اور ضرورت پڑنے پر قرضے بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ اگر وہ اپنے اقطاع سے باہر کہیں مقرر ہوتا تھا تو اس کا نمائندہ اقطاع کا نظم و نسق چلاتا تھا یا وہ صوبے کے حاکم سے مکمل طور پر آزاد ہو کر اقطاع کے اندر فوجی اور انتظامی اختیارات کا مکمل استعمال کرتا تھا۔ مثال کے طور پر، سلطان بہلول نے مسند عالی عمر خان سروانی کو لاہور سرکار کا حاکم مقرر کیا، جب کہ اس کی اقطاع سرہند کی سرکار میں تھی۔ اسی طرح ابراہیم لودی کے دور میں عیسیٰ خان سروانی کو مسندِ عالی کا خطاب دیا گیا۔ وہ دہلی قلعہ میں تعینات تھے لیکن تھانیشور میں ان کی اقطاع کا انتظام ان کا بیٹا کمال خان چلا رہا تھا۔

سُور (Sur) حکمرانوں کے زمانے میں بھی مذکورہ اقطاع کا رواج بغیر کسی تبدیلی کے جاری رہا۔ انہوں نے امیروں کو تنخواہوں کے بدلے اور مقام و منصب کے مطابق پرگنوں اور سرکاروں کی مالگزاری تفویض کی۔ ان پرگنوں اور سرکاروں کو 'وجہداری اقطاع' کہا جاتا تھا۔ سور سلاطین نے بھی علماء، سیدوں اور مذہبی افراد کی گزر بسر کے لیے دی گئی وجہ معاش زمین کو علیحدہ کر کے امیروں کو اقطاع دی۔ اس سلسلے میں حاصل ہونے والے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ خالصہ پرگنوں کے امیروں نے سلطان ابراہیم کے دور حکومت میں لوگوں کو دی گئی اراضی کو غصب کر لیا تھا۔ شیر شاہ نے اپنے امیروں کو حکم دیا کہ وہ ان کی شکایت کی تحقیقات کریں اور عطیہ کے دور پر دی گئی زمین ان کے جائز حقداروں کو واپس کریں۔ اگرچہ اسلام شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اقطاع کا نظام ختم کر کے نقد تنخواہ کا رواج متعارف کرایا اور پوری سلطنت کو خالصہ کے ماتحت کر دیا، پھر بھی گہرائی سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رواج اس کے دور میں بھی جاری رہا۔ تاہم، صوبے کے عدالتی نظام پر مقطع کے اختیار یا اس کی کسی طرح کی عدالتی سرگرمی کا کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ امن و امان برقرار رکھنا ان کا بنیادی کام تھا، جو اتفاق سے عام طور پر بڑے شہروں اور قلعوں تک محدود رہتا تھا، اور جسے ان کے ذریعے مقرر کردہ کوتوال انجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کا کام سلطان کے زمینی محصول کے حصہ کو کاشتکاروں اور مقامی زمینداروں سے وصول کرنا تھا۔

عام طور پر مقطع صوبے میں ہی رہتے تھے، لیکن بعض مقامات پر، خاص طور پر دارالحکومت کے نزدیکی صوبوں میں، وہ غیر حاضر زمینداروں (absentee landlords) کی طرح تھے۔ وہ نائبوں کے ذریعے حکومت کرتے تھے جنہیں کبھی کبھی مرکز کی طرف سے مقرر کیا جاتا تھا۔ قنوج کا نائب التمش نے مقرر کیا تھا۔ بہرام کے دور میں دربار میں واپسی پر ہندو خان نے اپنے نائب کے ذریعے اُچ کا نظم و نسق سنبھالا۔ 'امیر حاجب' اور بعد ازاں 'نائب مملکت' کی حیثیت سے بلبن کو مسلسل دربار میں حاضر رہنا پڑتا تھا اس لیے اس نے ہانسی اور سیوالک کی اپنی اقطاع پر اپنے نائب کے ذریعے ہی حکومت کی ہو گی۔ بڑے صوبوں کے مقطع اہم شہروں اور چوکیوں پر خود نائب مقرر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مقطع کو اپنے ماتحت افسروں کو زمین عطا کرنے کا حق حاصل تھا، جیسا کہ بختیار کو اودھ کے مقطع سے فوجی اقطاع حاصل ہوئی۔ بلبن نے بغرا خان کو اقطاع عطا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ سلطان کی طرح مقطع بھی زمین بطور وقف دے سکتا تھا۔ یہ اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ منہاج کو بلبن سے ایک گاؤں ملا تھا جس کی آمدنی تیس ہزار جیتل تھی۔ دبیر، متشرف، کارکن، عامل، کوتوال اور مقدم جیسے عہدوں پر مقامی انتظامیہ کے بہت سے ملازمین ہوتے تھے۔ حالانکہ مقطع کے ماتحت ملازمین کے بارے میں تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہیں، پھر بھی یہ اندازہ

لگایا جاسکتا ہے کہ مندرجہ بالا ملازمین مقطع کے ماتحت کام کرتے تھے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا نظم ونسق، مرکزی نظام کی ایک چھوٹی شکل ہونے کی وجہ سے، سلطان کے مرکزی محکمے کا نمونہ ہوگا۔

4.3.7 مقطعوں کی طاقت (The Power of *Muqtas*)

علماء، سیدوں اور مذہبی لوگوں کے گزارہ کے لیے دی جانے والی زمین کو چھوڑ کر اقطاعوں پر امیروں کا تقرر کیا جاتا تھا۔اپنے علاقے کی انتظامیہ میں اقطاع کے افسران کو کم و بیش مکمل آزادی دینے کے باوجود، دہلی کے دیوانِ زیارت سے متصرف (Auditor) کو ضروری کاغذات کی جانچ پڑتال کے لیے دورے پر بھیجا جاتا تھا۔ لیکن اقطاع کے اہلکاروں کو قابو کرنا بہت مشکل تھا۔یہ بات خاص طور پر دور دراز علاقوں میں تعینات لوگوں پر صادق آتی ہے۔امیر خسرو نے ایک متصرف کے تجربے کا تذکرہ کیا جس کو اقطاع میں انتہائی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔التمش نے بڑی تعداد میں اقطاع تقسیم کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی اور اسی لیے وہ ریاست کے لیے مزید مسائل پیدا کرنے کا بالواسطہ ذمہ دار بھی تھا۔اپنی زندگی کے دوران انتظامیہ پر اپنے محتاط اور چوکس کنٹرول کے ذریعے، اس نے اس عمل میں شامل نقصان دہ عناصر کو ختم کیا۔ لیکن التمش کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے عدم استحکام کے دوران پورا اقطاع نظام غیر منظم ہو گیا۔اقطاعداروں میں مرکزی اقتدار کی نافرمانی کا رجحان پیدا ہوا۔اقطاع نظام کو حکمرانی کی مرکزیت کے عمل کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، لیکن یہ طرز عمل اب سیاسی طاقت کے انحطاط اور غیر مرکزیت کا سبب بن گیا تھا۔ برنی کی بیان کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ جب علاؤالدین خلجی کڑا اور اودھ کا مقطع تھا تو اس نے جنوبی مہم کا منصوبہ بنایا۔اس منصوبے کے سلسلے میں اس نے بطور مقطع جلال الدین خلجی سے فواضل کو ذاتی طور پر استعمال کرنے کی درخواست کی تھی تاکہ اضافی فوج جمع کی جاسکے۔ عفیف کے مطابق، سلطان کی طرف سے مقطع مقرر ہونے کے بعد عین الملک نے فیروز شاہ تغلق سے کہا تھا: 'میرے لیے اقطاع کے نظم ونسق کی ذمہ داری قبول کرنا اور وہاں کام چلاتے ہوئے دیوان وزارت کو حسابات بھیجنا ناممکن ہوگا۔اسے میں صرف سلطان کے سامنے پیش کروں گا۔'

یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ مقطع لوگ بعض اوقات اپنے تقرری کے حقوق بھاری رقم کے عوض کسی دوسرے شخص کو پٹے پر دے دیتے تھے۔زیادہ رقم کے مطالبے کا بوجھ ہمیشہ غریب کسانوں پر پڑتا تھا۔اس طرح جمع ہونے والا فواضل (اضافی رقم) حکمران طبقے کی جیبوں میں ہی چلا جاتا تھا۔ بلبن کے دور حکومت میں دہلی کے امیر ہمیشہ اپنی جاگیروں سے حاصل ہونے والی آمدنی کی بنیاد پر وہاں کے ساہوکاروں سے بھاری رقوم کے قرضت لیتے رہتے تھے۔ لیکن خلجی حکمرانوں کی طرف سے پیداوار اور کاشتکاری کے حوالے سے زیادہ موثر انداز اپنانے کی وجہ سے یہ صورت حال زیادہ عام نہیں ہو سکی۔ایک طاقتور سلطان کے تحت ایک امیر کے اقطاع کا حجم اور اس کا ذاتی منصب اور وقار انتہائی ذاتی معاملات تھے۔ ریاست نے وراثت کے قانون کے تحت نجی جائیداد اور ریاستی عہدوں بشمول زمین کے عطیہ (اقطاع) کے درمیان واضح فرق کرنے پر اصرار کیا کیونکہ یہ ریاستی عہدے کسی بھی قسم کے انحصاری یا موروثی حق سے آزاد تھے۔ابتدائی تغلق حکمرانوں کے زمانے تک یہ صورت حال کم و بیش برقرار رہی۔ لیکن محمد بن تغلق کی موت کے بعد، مرکزی اقتدار میں کمزوری ظاہر ہوتے ہی اس میں تبدیلی آگئی۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں حکمران طبقہ انتہائی طاقتور ہو گیا اور ملک کے فواضل (اضافی آمدنی) کا ایک بڑا حصہ ہڑپ کرنے لگا۔ یہ

مقطع لوگ زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے اور اپنی آمدنی فضول خرچی میں ہی خرچ کرتے تھے۔ جب افغان امیروں نے اپنے اقتدار کو موروثی سمجھنا شروع کیا تو سلطان سکندر لودی نے کھل کر اپنا نقطہ نظر ایک مشہور افغان امیر مسند عالی کے جانشین زین الدین کو باور کرایا۔ شاہی فرمان میں کہا گیا: "زین الدین کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی تقرری خالصتاً ان کی ذاتی حیثیت میں کی گئی ہے نہ کہ سابقہ مسند علی کے رشتہ دار ہونے کی وجہ سے۔" سابق امیر کے بیٹے کو نقد بھتہ دیا گیا اور ان کی اہلیہ کو پٹے پر زمین دی گئی جس کی ہر سال تجدید اور منظوری درکار تھی۔ نقد بھتے کی عطیہ میں بھی یہی اصول لاگو تھے۔ اس وجہ سے، ریاست اپنی موثر حیثیت میں اقطاع زمین یا مذہبی اور فرقوں کو دی ہوئی زمینوں پر اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔

4.4 اقطاع نظام کی نوعیت (Nature of the *Iqta* System)

'مشرقی جاگیرداری' کے بارے میں اکثر تبصرے کیے جاتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں اس کی بنیاد اقطاع کا ادارہ ہی تھا۔ ایچ جی راورٹی (H.G. Raverty) نے اقطاع کے لیے 'فیف' (fief) کا لفظ استعمال کیا ہے جو براہ راست جاگیردارانہ نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں بادشاہ کا مرکزی کاشتکار یا پٹہ دار (tenants-in-chief) درحقیقت اپنی جاگیر کا حاکم مطلق ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ بیان مکمل طور پر گمراہ کن ہے کیونکہ مقطعوں پر بہت زیادہ گرفت تھی۔ فیف کی اصطلاح سے اس قدر تسلط کا پتہ نہیں چلتا۔ اس سلسلے میں مثالوں کو غلط طریقے سے پیش کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ لگاتار کمزور حکمرانوں کے عہد میں یا کسی کمزور خاندان کے تحت اقطاع پر اقطاعدار لوگوں کے چلے آرہے اختیار کو کچھ حد تک جواز مل گیا تھا اور اب اقطاع کو ذاتی ملکیت کی طرح سمجھا جانے لگا تھا۔ اسے بغیر کسی وضاحت کے اس سادہ حقیقت کی بنیاد پر ہی یکسر مسترد کر دینا چاہیے کہ کسی باوقار عہدے یا مالگزاری سے متعلق تقرری کے سلسلے میں، جانشین کے طور پر باپ سے بیٹے کے نام منتقل ہونے کے رواج کا زور پکڑنا 'ریاست کے کسی بھی حصے پر دخل دینے یا ذاتی املک رکھنے کے اختیار کی سلطنت کی طرف سے منظوری کے بجائے، مرکزی حکومت کی کمزوری کو' ظاہر کرتا ہے۔ اس ادارے کو 'جاگیرداری' کے طور پر دیکھنے کے لیے ایک اور پہلو بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ پہلو براہ راست سلسلے وار حقوق (hierarchical rights) کا یورپی جاگیردارانہ سماج کے ساتھ موازنہ کرنا ہے جس میں سلطان اعلیٰ ترین عہدے پر تھا، اس کے نیچے بڑے مقطع، صوبائی گورنران کے چھوٹے فوجی اقطاعدار اور آخر میں مقامی سطح کے بچولیے لوگ جیسے کہ کھوت، مقدم، چودھری وغیرہ تھے۔ تاہم اقطاع کوئی جاگیردارانہ ادارہ نہیں تھا، یہ اسی بات سے واضح ہوتا ہے کہ ریاست اور مقطع یا کبھی کبھی تو سب سے نچلے درجے کے اہلکار کے درمیان براہ راست تعلق تھا۔ علاوہ ازیں کسی بھی ریاست نے کبھی بھی مقطع یا والی کو تفویض کردہ زمین کے ساتھ اپنے بنیادی حقوق کو منتقل نہیں کیا۔

کچھ اسباب کی وجہ سے اقطاع نظام، کبھی جاگیرداری نظام میں تبدیل نہیں ہو سکا۔ ۱۔ سلطان کا مزید غلام خریدنے کا خوف پرانے غلاموں کے خود مختار جاگیردار بننے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوا اور اس نے انہیں ریاستی انتظامیہ کے تحت کام کرنے پر مجبور کیا۔ ۲۔ غیر ملکیوں کے حملوں اور ہندوستان کی فتح کے دوران پرانے امیر طبقے کے لوگ ہمیشہ یا تو بھاگتے رہے یا تباہ ہو گئے۔ ان کی طاقت کم ہوئی اور ان کی جگہ نئے

لوگوں نے لے لی۔ ۳۔ مقطع سلطان کے نمائندے (ایجنٹ) کے طور پر کام کرتے تھے اور اپنے اعمال کے لیے براہ راست سلطان کو جوابدہ تھے۔ وہ اپنے عہدے پر تب تک رہ سکتے تھے جب تک سلطان چاہتا۔ اسے ہٹانے، منتقل کرنے یا سزا دینے کا حق صرف سلطان کو تھا۔ اس طرح مقطع کی حیثیت افسر شاہی جیسی تھی جاگیر دارانہ نہیں۔ سلطان کو اقطاع پر مکمل اختیار حاصل تھا۔

مورلینڈ نے امیر طبقے کی ابتدا کے حوالے سے تحقیق کی ہے۔ ان امیر لوگوں میں سے مقطعوں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ تیرہویں صدی کے وسط میں منہاج کی طرف سے اعلیٰ عمائدین سلطنت کی سوانح کے حوالے سے لکھی گئی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مقطع کا درجہ حاصل کرنے والے ہر شخص کے حالات زندگی کا آغاز شاہی غلام کے طور پر ہوتا تھا۔ التمش (جو ایک غلام ہونے کے ناطے خود ایبک کی ملکیت تھا) نے بڑی تعداد میں غیر ملکی غلاموں کو حاصل کیا اور انہیں اپنے محل میں گھریلو کاموں پر لگایا۔ یہ لوگ اپنی دانشمندی اور قابلیت کے مطابق ریاست کے اعلیٰ ترین عہدوں پر ترقی کرتے گئے۔ ان میں توران خان، صف الدین ایبک، طغرل خان، اور الغ خان (بعد میں سلطان بلبن) کے نام نمایاں تھے۔ مورلینڈ انہیں 'عام ایشیائی قسم کے افسر طبقہ' کے طور پر بیان کرتا ہے۔ مورلینڈ نے اس ادارے (اقطاع) میں جاگیر دارانہ خصوصیات کی عدم موجودگی کی مندرجہ ذیل وجوہات پیش کی ہیں۔

1. مقطع کی اپنی کوئی علاقائی حیثیت نہیں تھی اور نہ کسی مخصوص زمین پر اس کا دعویٰ ہی قابل قبول تھا۔
2. جس منصب پر مقطع کو مقرر کیا گیا تھا، بنیادی طور پر وہ اس عہدے کے منتظم تھا۔ اس کے لیے وہ تنخواہ لیتا تھا۔
3. مقطع کا فرض تھا کہ وہ ایک فوجی دستہ اپنے ساتھ رکھے اور ضرورت کے مطابق اسے سلطان کی خدمت میں حاضر کرے۔
4. مقطع کو اپنے ماتحتوں سے مقررہ محصول وصول کرنا تھا۔ فوجیوں کی تنخواہوں جیسے منظور شدہ اخراجات کے بعد جو رقم بچ جاتی تھی اسے دارالحکومت میں سلطان کے خزانے میں جمع کرنا پڑتا تھا۔
5. دیوان وزارت کے افسران، وصول کی گئی رقم اور اس کے اخراجات سے متعلق مقطع کے لین دین کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ کچھ سلاطین کے دور میں ان سے بقایا واجبات کی وصولی کافی سختی سے کی جاتی تھی۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مقطع ایک قابل منتقلی عہدہ تھا جس میں جاگیر دارانہ روایت یا مستقل حقوق کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگرچہ جبری قبضے (غصب) کی کچھ مثالیں موجود ہیں، لیکن مقطع کو تفویض کردہ ذمہ داریاں ایک حاکم کے عمومی فرائض تھے، جن میں مذہب اور مذہبی طبقے کی سرپرستی، عوام الناس میں امن وامان قائم کرنا، صوبائی عدالت میں افسر کی حیثیت سے کام کرنا یا اس کا معائنہ کرنا، ٹیکس جمع کرنا اور تنخواہوں اور بھتوں کی تفصیلات فراہم کرنا شامل ہیں۔ کچھ مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں 'ملک' کو مشورہ کے اصول پر عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس نظام کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ مرکزی انتظامیہ کی طرف سے نسبتاً اپنی غالب حیثیت اور طاقت کے استعمال کے علاوہ صوبائی اقطاع پر کنٹرول برقرار رکھنے یا مقطع کی ناانصافی یا بغاوت کو روکنے کے لیے کوئی مناسب انتظام نہیں کیا گیا۔ اصولی طور پر مظلوم شخص سلطان سے براہ راست انصاف مانگ سکتا تھا لیکن عملی طور پر سلطان سے براہ راست رابطہ اسی صورت میں ممکن تھا جب سلطان اس علاقے سے گزرے یا پھر اس شخص کا دربار یا دارالحکومت میں کسی بااثر شخص کے ذریعے تعارف کرایا جائے۔ اس کے علاوہ اس نظام

میں ایک اور خامی یہ تھی کہ اگرچہ اس کے تحت اختیار کی مرکزیت یا مرکزی حکومت کے اقتدار میں رعایت کا کوئی نظام وضع نہیں کیا گیا تھا اور ایک مضبوط حکمران کے تحت یہ عمل ریاست کی طاقت کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوا، لیکن کمزور حکمران کے دور میں یہی نظام سیاسی انحطاط اور معاشی بدانتظامی کا ذمہ دار ثابت ہوا۔ خالصہ اور شق کی اصطلاحات کے حوالے سے متعلمین کی الجھن کو دور کرنے کے لیے یہاں کچھ وضاحت پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اقطاع سے مختلف تھے۔

4.4.1 اقطاع اور خالصہ (*Iqta* and, *Khalsa*)

دہلی سلطنت میں انتظامی اور اقتصادی تنظیم کی واحد بنیاد اقطاع نظام ہی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے نظام بھی تھے جنہیں خالصہ (ایک اصطلاح جو ریاستی انتظامیہ کے تحت زمین کے لیے استعمال ہوتی ہے) یا محروسہ (محافظ فوج والا شہر یا صوبہ) کہا جاتا تھا۔ خالصہ علاقہ کی انتظامیہ اقطاع نظام سے مختلف تھی۔ خالصہ زمین کی آمدنی سلطان کے لیے مخصوص رہتی تھی۔ عموماً ان علاقوں کی شحنہ، امیر یا ملک نامی افسر کے ذریعے تسط اور نگرانی کی جاتی تھی۔ بھٹنڈا (تبرہند) اور گوالیار دہلی کے ابتدائی سلاطین کے تحت اسی زمرے کے علاقے تھے۔ سلطان مسعود شاہ (1241–46 عیسوی) کے دور میں، بھٹنڈہ کو ایک عام اقطاع میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان علاقوں کا محصول سلطان کے وزارت مالیات کے اہلکار جمع کرتے تھے اور براہ راست شاہی خزانے میں بھیجتے تھے۔ خالصہ کے حاکم یا شحنہ کو شاید ایک مقررہ تنخواہ دی جاتی تھی۔

4.4.2 اقطاع اور شق (*Iqta* and, *Shiq*)

شق کا لفظی معنی ہے 'ایک حصہ'۔ برنی کی چھٹ پٹ وضاحتیں بتاتی ہیں کہ شق بھی اقطاع کی طرح مقررہ حدود کے ساتھ ایک انتظامی اکائی تھی۔ شہاب الدین العمری نے شق کو ولایت سے چھوٹی اکائی سمجھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شق اکائی کو پہلی بار بلبن نے 1279 عیسوی میں رائج کیا تھا۔ اس نے سمانہ اور سنام ولایت کے علاقوں کو شقوں میں تقسیم کر کے مختلف امیروں کو دے دیا۔ لیکن اس حقیقت کی تصدیق کے لیے ہمارے پاس صرف برنی کی تفصیل ہے جو تقریباً اسی سال کے بعد لکھی گئی۔ صرف اسی بنیاد پر اس سے پہلے کے دور میں شق کے وجود کو ایک علاقائی اکائی کے طور پر قبول کرنا مناسب نہیں۔ درحقیقت اس کے بعد برنی نے انتظامی تقسیم کے لیے شِق کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ اکثر اقطاع کا ذکر کیا ہے۔ ہاں البتہ اس نے علاؤالدین کے حکم کے مطابق شق کے متشرفوں اور عاملوں کو دی گئی سزا کی تفصیل ضرور بتائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد تغلق نے دوآب کے شقداروں کو حکم بھیجا تھا کہ 'اناج کی دکانوں کو آگ لگا کر اور ان کے مویشیوں کو ضبط کر کے (ان) ہندوؤں (مقامی ہندوستانیوں) کو تباہ کر دیں س جنہوں نے ریاست کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا کیا ہے۔' حقائق کو تلاش کرنے کے بعد یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ محمد بن تغلق کے آخری دور میں لفظ 'شق' عام طور پر کسی علاقائی اکائی یا طبقے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ہانسی، امروہہ، فتح آباد، سرستی، سلور، خضر آباد اور آس پاس کے علاقوں کے اقطاع کو ملا کر، فیروز شاہ نے حصار اور فیروزہ کا شق بنایا۔ فیروز شاہ کا دوسرا شق سرہند کا فیروز پور تھا۔ دہلی سلطنت کے بعد کے سلاطین کے دور میں شق کی ترقی کی یہ مختصر تاریخ ہمیں اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ شق ولایت کا ایک حصہ تھا اور ساتھ ہی اقطاعوں کا ایک مجموعہ بھی تھا۔ دوسرے لفظوں میں، اس کی تخلیق ایک طویل مدتی کوشش کو سامنے لاتی

ہے جس میں ایک باقاعدہ صوبے کے برابر ایک انتظامی اکائی کی تشکیل شامل ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے پتہ چلتا ہے، شقدار ایک شق کا منتظم تھا۔ اس کا تقرر اس طبقہ امراء میں سے ہوتا تھا جو مقطع کے عہدے پر فائز رہ چکے ہوں یا جنہیں انتظامیہ کا کافی تجربہ ہو۔ کبھی کبھی شق کے منتظم کو مقطع بھی کہا جاتا تھا۔ بد قسمتی سے شق کے انتظامی طور طریقوں کے بارے میں مستند تفصیلات کا فقدان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا علاقائی اختلافات کے علاوہ شق اور اقطاع کے درمیان بھی معیار کا فرق تھا یا نہیں۔

4.5 دیگر عطیات (Other Grants)

سلطنت دور میں سلطان کے اختیار سے آزاد زمین کو مورلینڈ نے عطیات کہا ہے۔ یہ عطیات ا۔ ملک (*Milk*) یعنی بادشاہ کے ذریعے عطا کردہ، ۲۔ وقف (*Waqf*) یعنی مذہبی خدمات کی بنیاد پر عطا کردہ زمین اور ۳۔ انعام (*Inam*) یعنی وظیفہ تھے۔ اس طرح کی زمین پر کسی طرح کا محصول نہیں لگتا تھا۔ وقت گزرنے پر یہ محصول سے آزاد زمین معافی اداروں کی موروثی ملکیت ہو جاتی تھی۔ علاؤالدین خلجی نے سدھاروں کے تحت جہاں تک ہو سکا اس زمین کو ریاست کے ماتحت لے لیا اور اس طرح کی قدیم روایت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے حکم دیا کہ سبھی زمینیں اور گاؤں جو ملک، وقف یا انعام کے طور پر دیے گئے ہیں انہیں خالصہ یعنی سرکاری زمین میں بدل کر ریاست اس کا انتظام خود کرے۔ ڈاکٹر آر۔ پی۔ ترپاٹھی کے مطابق ایسا کرنے میں اس کا مقصد ایسی سبھی زمینوں پر جن کے بارے میں وہ اختیار کو صحیح نہیں سمجھتا تھا سلطان کا اختیار قائم کرنا، فیصلہ کرنا، انہیں ختم کرنا یا اپنی شرطوں پر انہیں دوسرے اشخاص کو دینا تھا۔ فرمان کے تحت بڑے بڑے زمینداروں کو ہٹا دیا گیا اور اس کے نتیجے میں خالصہ زمین میں اضافہ ہوا۔ جن افراد کی زمینیں چھین لی گئی تھی، سلطان غیاث الدین تغلق کے دور حکومت میں ان کے اختیارات دوبارہ انہیں سونپ دیے گئے۔ اس الطاف خسروانہ سے سبھی طبقات کے لوگوں کو فائدہ ہوا جیسے سرکار، علماء، شیوخ وغیرہ۔ محمد بن تولق کے دور میں بھی یہی روایت قائم رہی۔ سلطان نے علماء کو زمینی عطیات دیے۔ مراکشی سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ سو گاؤں شیخ رکن الدین کو عطا کیے گئے تھے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے دور میں بھی پہلے سے دیے گئے عطیات کو دوبارہ جاری کرنے اور ان کی توثیق کرنے کے شواہد ملتے ہیں۔ شیوخ اور علماء کو ان کی گزر بسر کے لیے گاؤں عطیہ کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ عرفان حبیب نے مناسب ہی اشارہ کیا ہے، عطیات کی معاشی اہمیت محدود تھی کیونکہ ان کا چلن وسیع علاقے میں نہیں تھا۔ شاید ان کی نظریاتی اہمیت زیادہ تھی۔ پورے کے پورے مسلم علماء طبقے کی کفالت انہیں عطیات کے ذریعے ہوتی تھی۔

4.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ دہلی سلطنت میں مالگزاری تفویض کے مختلف طریقوں کے بارے میں پڑھا۔ ان میں اقطاع نظام سب زیادہ اہم تھا کیونکہ اس نے سلطنت کو وسیع اور مستحکم کرنے میں اہم کردار نبھایا۔ مقطع زمین کا مالک نہ ہو کر بس اس کی مالگزاری سے مستفیذ ہونے والا فرد تھا، اس طرح یہ نظام یورپی جاگیرداری نظام سے یکسر الگ تھا۔ دوسرا اقطاع نظام یورپی جاگیرداری کی طرح مرکز گریز نہیں تھا بلکہ مرکزیت پسند تھا، جس کے لیے اقطاع کی شرائط اور مقطع کے فرائض اور اختیارات کو تفصیل سے واضح کیا گیا تھا۔ چھوٹے اقطاع جو

صرف فوجی خدمات کے بدلے دیے جاتے تھے، دہلی سلطنت کی ابتدا میں اہمیت کے حامل رہے مگر بعد میں سلطنت کے خزانے پر ایک بوجھ بن گئے جس کو جلد ہی ختم کر دیا گیا۔ فیروز شاہ کے دور میں جاگیران کا احیا نو ہوا۔ اقطاع کے علاوہ وجہدار، شقدار، دیگر انتظامی عہدے بھی تھے جو مالگزاری تفویض سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ رفاہی اور مذہبی عطیات جیسے، ملک، وقف اور انعام وغیرہ تھے جو مذہبی اور دانشور طبقے یا ہنر مند افراد کو دیے جاتے تھے۔

4.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

tax farming	:	مالگزاری کی وصولی کو ٹھیکے پر دینے کا رواج
(فواضل)	:	صوبائی (اقطاع) اخراجات کے بعد بچ جانے والی رقم
اقطاع تملیک	:	بذریعہ تقرری، منتقل شدہ اقطاع۔
اقطاع استغلال	:	ذاتی استعمال کے حق والی اقطاع۔
مواجب	:	مقطع کا محنتانہ
حشم	:	سلطان کا ذاتی گھڑ سوار دستہ
دیوان وزارت	:	مالیاتی امور دیکھنے والی وزارت جو سلطنت کے جمع اور حاصل کا حساب رکھتی تھی۔
عارض	:	فوجی انتظامیہ کا سربراہ
ٹنکہ	:	دہلی سلطنت کا چاندی کا سکہ جسے التمش نے جاری کیا تھا۔

4.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

4.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. 'جاگی' کسے کہا جاتا تھا؟
2. tax farming سے کیا مراد ہے؟
3. صوبائی اخراجات کے بعد بچ جانے والی رقم کو کیا کہتے تھے؟
4. اقطاع تملیک (*Iqta–i–Tamlik*) سے کیا مراد ہے؟
5. اقطاع استغلال (*Iqta–i–Istighlal*) سے کیا مراد ہے؟
6. حشم کسے کہا جاتا تھا؟
7. دیوان وزارت اقطاع کی کس چیز کی تفتیش کرتا تھا؟
8. 'خان' کو تنخواہ کے طور پر کتنے ٹنکوں کی زمینی مالگزاری ملتی تھی؟

9. منہاج نے 'ایالت' (*Ayalat*) لفظ کا استعمال کس کے معنی میں کیا ہے؟
10. کس نے اقطاعدار کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور کنٹرول کرنے کے لیے ایک خواجہ (محاسب) کو مقرر کیا تھا؟

4.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اقطاعدار اور مقطع کی تنخواہ پر نوٹ لکھیے۔
2. اقطاع نظام کے نفاذ کے مقصد پر نوٹ لکھیے۔
3. اقطاع کی علاقائی تقسیم پر نوٹ لکھیے۔
4. منصب اقطاع کی مدت کار پر نوٹ لکھیے۔
5. مقطعوں کی طاقت پر نوٹ لکھیے۔

4.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اقطاع کے معنی اور اس کی ابتدا اور ارتقا کے پس منظر پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. اقطاع نظام کی توسیع اور اس کے رواج پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
3. اقطاع نظام کی نوعیت پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

4.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ahmed, Fouzia Farooq, *Muslim Rule in Medieval India*: *Power and Religion in the Delhi Sultanate*, Bloomsbury, New Delhi, 2022.
2. Ashraf, K.M., *Life and Conditions of the People of Hindustan*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1970.
3. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
4. Habib, Irfan, *Economic History of India*, *AD 1206–1526*, Tulika Books, Delhi, 2016.
5. Habibullah, A.B.M., *The Foundation of Muslim Rule in India*, Central Publishing House, Allahabad, 1999 (first pub. in 1945).
6. Kumar, Sunil, *The Emergence of the Delhi Sultanate*, *1192–1286*, Permanent Black, Ranikhet, 2007.
7. Lane-Poole, Stanley, *Medieval India under Mohammedan Rule*, Low Price Publications, Delhi, 1990 (first pub. in 1903).
8. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*: *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers, New Delhi,1995 (first pub. in 1983).
9. Mujeeb, M., *The Indian Muslims*, Munshiram Manoharlal, New Delhi, 2003 (first pub. in 1967).
10. Nizami K.A. ed., *Politics and Society during the Early Medieval Period, Collected Works of Professor Muhammad Habib*, Vol. I, Centre of Advanced Study, Department of History,

Aligarh Muslim University, People's Publishing House, 1974.
11. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That Was India*, part–II, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first pub. in 1987).
12. Raychaudhuri, Tapan and Irfan Habib, *The Cambridge Economic History of India*, *Vol. I*, Cambridge University Press, Delhi, 1982.
13. Moreland, W.H., *The Agrarian System of Moslem India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2011.
14. Shrimali, Krishna Mohan, *Land, Agriculture and Money in Central India and Beyond* (*c. 100 to c. 1300 A.D.*): *A Feudal Order Revisited*, Aakar, Delhi, 2024.
15. Sharma, R.S., *Indian Feudalism*, *c. AD 300–1200*, Macmillan, Delhi, 2013 (first pub. in 1965).

اکائی 5۔پیشےاور شہر کاری

(Crafts and Urbanisation)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 کارخانے

5.3 کپڑے کے کارخانے

5.4 دھات کے کارخانے

5.5 کھال کے کارخانے

5.6 ظروف سازی کے کارخانے

5.7 اکتسابی نتائج

5.8 کلیدی الفاظ

5.9 نمونہ امتحانی سوالات

5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

5.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے قیام سے ہندوستان کی سیاست ،معیشت اور تہذیب میں قابل ذکر تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں۔دہلی سلطنت میں دستکاری اور شہر کاری کے فروغ پر دستیاب تاریخی ماخذ خاص طور پر تحریری شواہد کے مطالعہ اور تاریخی مقامات کے مشاہدہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں مذکورہ دونوں شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔مؤرخین نے اسلامی تہذیب وتمدن کو شہری تہذیب کا نام دیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے عالمی تہذیب میں شہری تہذیب وتمدن کو ترجیح اور اس کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا۔دیگر مسلم حکمرانوں کی طرح سلاطین دہلی نے بھی شہری زندگی کو دیہی زندگی پر ترجیح دی اور اسی طرح کفایتی طرز زندگی کو ترک اور سائنسی زندگی کو اختیار کیا۔چنانچہ دہلی میں اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد شہروں کی تعمیر اور عیش وعشرت کے سامانوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کارخانوں کے قیام پر توجہ مرکوز کیا۔نتیجتاً دونوں شعبوں میں ترقی ہوئی۔قیام دہلی سے پہلے ہندوستان میں ان دونوں شعبوں کی صورت حال مختلف تھی۔گپتا حکومت کے زوال کے ساتھ ہی دونوں شعبوں کی تنزلی شروع ہوگئی تھی جو بعد کے دور میں مزید زوال پذید ہوگئی۔مؤرخین جسے آر ایس شرما نے ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کے عروج اور اس کے استحکام کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے شہروں کی تنزلی اور تجارت کے زوال کو اہم ترین وجہ قرار دیا ہے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد دست کاری،کارخانے،مصنوعات کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- دستکاری اور شہر کاری میں مزدوروں اور غلاموں کے کردار سے بھی واقفیت ہو سکیں گے۔
- کارخانوں اور ان میں تیار ہونے والے اشیا کی مالکانہ حیثیت پر بحث کر سکیں گے۔
- دستکاری اور شہر کاری کی ترقی اور اس کی نوعیت کے عوامل واسباب کا بھی علم حاصل کر سکیں گے۔

5.2 کارخانے (The *Karkhanas*)

دہلی سلطنت کے دور میں سیاست کے علاوہ تین بڑے شعبوں یعنی شہر کاری،صنعت گری اور تجارت میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں دست کاری اور کارخانے کو فروغ ملا تاکہ شاہی ضرورتوں کے ساتھ تجارتی مطالبات کو بھی پورا کیا جاسکے۔ چنانچہ درج ذیل مصنوعات کے کارخانے قائم ہوئے۔

- کپڑے کے کارخانے
- دھات کے کارخانے
- کھال کے کارخانے

- زیورات کے کارخانے
- چینی مٹی اور مٹی کے برتنوں کے کارخانے

ڈی ڈی کوشامبی کے مطابق کارخانے صرف سلاطین یاامالدار اشراف طبقہ /امرا قائم کرتے تھے جہاں صرف ان کی ضرورتوں کے مطابق مصنوعات تیار کی جاتی تھیں۔کارخانوں میں تجارتی مقاصد کے تحت مصنوعات تیار نہیں کی جاتی تھیں۔کے کے ایم اشرف کا خیال ہے کہ دہلی سلطنت میں شاہی کارخانوں کا قیام دراصل ایرانی روایات کی دین تھی۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ کارخانوں کا قیام قدیم روایات کا حصہ تھا۔ایران کے علاوہ دیگر ممالک جیسے مصر میں فاطمی دور میں بھی ذاتی اور حکومتی (ریاستی) دونوں طرح کے کارخانے موجود تھے۔

ریاستی اور ذاتی کارخانوں میں واضح فرق تھا۔ریاستی کارخانوں میں شاہی ضرورتوں سے مصنوعات تیار ہوتے تھے جبکہ ذاتی کارخانوں میں تجارت کی غرض سے مصنوعات تیار کیے جاتے تھے۔دہلی سلطنت کے دور میں ذاتی کارخانوں سے متعلق تاریخی معلومات نادار دہیں ۔ریاستی کارخانوں کے بارے میں تفصیلی معلومات موجود ہیں۔مثال کے طور پر فیروز شاہ تغلق کے کارخانے میں ہر طرح کے قیمتی کپڑے جیسے خلعت فاخرہ اور دوسری قسم کے خلعت اور ملبوسات تیار کیے جاتے تھے۔فیروز شاہ تغلق کے کارخانہ میں تقریباً چار سو ریشم ساز کام کرتے تھے۔فیروز شاہ تغلق دہلی سلطنت کا پہلا حکمراں تھا جس کے دور میں کارخانوں کا دائرہ کافی وسیع ہوا۔شمس سراج عفیف لکھتے ہیں کہ سلطان فیروز نے کارخانوں کے قیام اور فروغ پر خصوصی توجہ دیا۔مصنوعات کی تیاری سے متعلق ضروری اسباب جیسے خام مال کی فراہمی کو بھی یقینی بنایا۔اس نے سلطان کے کارخانوں کی تعداد 36 درج کیا ہے۔اس نے کارخانوں کا ذکر کرتے ہوئے جن ناموں سے موسوم کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے بیان میں کارخانوں کے ساتھ گوداموں کو بھی کارخانوں کی فہرست میں درج کر دیا ہے۔تاہم یہ حقیقت ہے کہ سلطان فیروز تغلق کے دور میں کارخانوں کو کافی ترقی حاصل ہوئی۔

عفیف نے اس کے دور میں موجود کارخانوں کے دو قسمیں بیان کیا ہے۔روایتی غیر روایتی کارخانہ۔روایتی کارخانہ سے مراد وہ کارخانے ہیں جس کے لیے ریاست سالانہ باضابطہ ایک بجٹ مختص کرتا تھا۔ان میں خاص طور پر پہل خانہ، شراب خانہ، شمع خانہ، شتر خانہ، سلگ خانہ، آبدار خانہ اور مطبع وغیرہ شامل تھے۔کتب تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں جو معلومات حاصل ہوتے ہیں، اس لحاظ سے روایتی کارخانہ کے لیے مختص بجٹ کی رقم ماہانہ رقم ایک لاکھ ساٹھ ہزار ٹنکہ تھی۔اس کے علاوہ افسران کی تنخواہ یا اخراجات کے لیے ایک لاکھ ساٹھ ہزار علٰحدہ مختص تھا۔غیر روایتی کارخانہ سے مراد وہ کارخانے ہیں جن کے لیے کوئی بجٹ مقرر نہیں تھا۔ایسے کارخانوں کی فہرست میں علم خانہ، فراش خانہ ،رکاب خانہ وغیرہ کو شمار کیا جاتا ہے۔ان کارخانوں کے اخراجات کے لیے سالانہ کوئی بجٹ مختص نہیں تھا۔ضرورتوں کے لحاظ سے اخراجات کے لیے رقم جاری کی جاتی تھی۔مثال کے طور پر موسم سرما میں جمادار خانہ پر چھ لاکھ ٹنکہ خرچ کیا جاتا تھا۔کاتبوں کی اجرت اور محاسبین کی تنخواہ کے علاوہ علم خانہ میں استعمال ہونے والے ضروری سامانوں کی خریداری کے لیے اسی ہزار خرچ کیا جاتا تھا، اسی طرح فراش خانہ تقریباً دو لاکھ ٹنکہ خرچ کیا جاتا تھا۔

کارخانوں کے انتظام وانصرام اور نگرانی کے لیے افسران مقرر کیے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر جمادار خانہ کاانچارج ملک خواجہ، کارخانہ پشتر کاانچارج ملک دلشاد، پہل خانہ کاانچارج ملک شاہین، علم خانہ کاانچارج ملک محمد حاجی تھا۔ مؤرخ عفیف کے والد اوران کے چچارلم خانہ، رکاب خانہ اور پہل خانہ کے متصرف تھے۔ کارخانوں کے متصرف اوران کے چچاعلم خانہ، رکاب خانہ اور پہل خانہ کے متصرف تھے۔ کارخانوں کے متصرف براہ راست سلطان مقرر کرتا تھااور یہ براہ راست سلطان کو جوابدہ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام ریاستی کارخانوں کاایک عام متصرف ہوتا تھا جس کے ماتحت دیگر تمام متصرفین اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ جیسے خواجہ عبدالحسن کو متصرف عام کے عہدہ پر فائز کیا گیا تھا۔ دیگر تمام ریاستی کارخانوں کے متصرفین ان کے ماتحت کام کرتے تھے۔ خواجہ عبدالحق بحیثیت متصرف عام براہ راست سلطان کے رابطہ میں رہتا تھا۔ سلطان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی براہ راست پیغام یا فرمان متصرف عام کو بھیجتا تھااور متصرف عام فرمان شاہی پر عمل کرتے ہوئے مطلوبہ سامان فراہم کرتا تھا۔(1) افسران کے علاوہ ہر کارخانہ میں حساب دار/ محتسب مقرر کیا جاتا جن کے ذمہ حساب رکھتا تھا۔

چونکہ سلاطین دہلی اور امرا کو شہری زندگی پسند تھی اس لیے وہ شہروں میں رہائش پذیر تھے۔ شہروں کے قیام اوران کی ترقی کے لیے مختلف اقدامات کیے۔ نقد کاروبار اور تجارت کے فروغ کے لیے خاطر خواہ پیش رفت کیے۔ ان میں جدید آلات اور طریقہ کار کے علاوہ بازار، تجارت، مصنوعات پر خصوصی توجہ شامل ہیں۔ پروفیسر عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ جدید آلات اور جدید طریقہ معیشت نے یہاں پہلے موجود نظام کاروبار جو ذات پات کی زنجیر سے جکڑی ہوئی تھی، اس بندش اور رکاوٹ کو ختم کرکے کاروبار کے لیے ترقی کی راہیں ہموار کیا۔ یونہی مصنوعات کی کمیت میں بہتری اور پیداوار میں اضافہ ہوا۔

کارخانوں میں تیار ہونے والے مصنوعات کا نظم ونسق کارخانوں سے وابستہ ایک اہم پہلو ہے۔ دو طرح کا نظام رائج تھا۔ گھریلو نظام اور خارجی یا باری نظام۔ اول الذکر نظام کے تحت کاریگران آلات کے خود مختار مالک ہوتے تھے چنانچہ وہ اپنے خام مال کا خود انتظام کرتے اور مصنوعات تیار کرتے تھے۔ مصنوعات پر ان کا خود مختارانہ اختیار ہوتا تھا۔ اپنی مرضی سے آزادانہ طور پر بازاروں میں فروخت کر سکتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ آلات کا سہل الاستعمال اور کم قیمتوں پر دستیابی تھی۔ زیادہ آلات لکڑی کے بنے ہوتے تھے جنہیں کاریگر آسانی سے چلا سکتے تھے۔ لوہے کے بنے ہوئے آلات بھی ہوتے تھے تاہم بہت کم رواج تھا۔ اس سے یہ اندازہ کرنا غلط ہوگا کہ یہ صرف اپنے آلات سے مصنوعات تیار کرتے اور فروخت کرتے تھے، کسی طرح کی مزدوری نہیں کرتے تھے۔ مزدوری کا رواج تھا۔ ایسے کئی مثالیں ملتی ہے کہ اجرت پر سوداگروں کے لیے دھاگے بننے یا فیری لگانے اور سامان کے حمل ونقل کرنے جیسے مزدوری کرتے تھے۔ مثال کے طور پر خیر المجالس کے مصنف لکھتے ہیں کہ دھاگا بننے یا تار کرنے کا کام عام طور پر خواتین اپنے گھروں میں رہ کر اپنے لوم سے تیار کرتی تھیں۔ اسی طرح کاریگر سوداگروں کے لیے اجرت پر سامان تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ سوداگران خام مال مہیا کراتے تھے اور کاریگروں سے اجرت دے کر اپنے تجارتی سامان تیار کراتے تھے۔

اس کے علاوہ اگر قیمتی سامان یا کپڑے جیسے ریشم کے دھاگے، سونے چاندی یا کوئی آسائشی سامان جیسے قیمتی قالین وغیرہ کا کام ہو تو کاریگر اور مزدور کارخانوں میں کسی نگران کے نگرانی کام کرتے تھے۔ جیسے رہائشی کارخانوں یا صاحب ثروت امرا کے کارخانوں میں کاریگر

اور مزدور دونوں کام کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر مسالک الابصار کے مصنف العمری لکھتے ہیں کہ محمد تغلق کے کارخانے میں ریشم سازی اور کڑھائی کا کام ہوتا تھا جہاں ریشمی چادر اور دیگر مختلف قسم کے لباسوں کے لیے کپڑے اور چادر پر ریشم کا کام کرتے تھے۔ سلطان سال میں گرمیوں اور سردیوں کے دو لاکھ ملبوسات لوگوں میں تقسیم کرتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیر معمولی تعداد میں ریشم کے ریاستی کارخانوں میں کاریگروں اور مزدوروں کو روزگار ملتا تھا۔ عفیف کے مطابق فیروز شاہ کے کارخانہ میں قالین اور کپڑے بڑے پیمانے پر تیار کئے جاتے تھے۔ یہاں بھی کاریگر اور مزدور کافی تعداد میں کام کیا کرتے تھے۔

کارخانوں کے قیام کا شہروں کی ترقی سے براہ راست تعلق تھا۔ اولاً کارخانے خواہ ریاستی ہو یا ذاتی دونوں کا قیام شہروں میں ہوتا تھا۔ کارخانوں میں مصنوعات کی تیاری اسی وقت ممکن تھی جب خام مال کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکتا تھا۔ اس طرح کارخانے کا تعلق براہ راست تجارتی سرگرمیوں سے تھا۔ یونہی کارخانوں کے قیام کا تعلق بلڈنگ انڈسٹری سے بھی تھا۔ مطلب کارخانوں کا قیام اور ان کا سرگرمیوں کا مرکز بھی شہری تھا۔ کارخانوں کا سارا کاروبار شہروں میں ہوتا تھا۔ کاریگروں کی ٹریننگ سے لے کر عملی سرگرمیاں سب شہروں میں قائم کارخانوں میں ہی ہوتا تھا۔ یونہی مزدوروں اور غلاموں کو جدید آلات سے روشناس اور دست کاری کا علم بھی کارخانوں میں دیا جاتا تھا جو کہ شہروں میں قائم ہوتے تھے۔ سلاطین اور امرا نے اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کارخانوں کی سرپرستی اور ملکی اور غیر ملکی تاجران اور سوداگران کی پشت پناہی اور مالی امداد نے شہروں کی طرف ان کی ہجرت کے لیے ابھارا۔ نتیجتاً دوسرے مسلم ممالک جیسے ایران، مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا وغیرہ سے تاجران، کاریگران اور دیگر اصحاب علم دہلی کی طرف ہجرت کیے۔ تجارتی تعلقات کی توسیع نے شہروں کی نشوونما اور جدید شہروں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

کارخانوں کے ضمن میں غلاموں کا ذخر بھی ضروری ہے۔ دہلی سلطنت کے دور میں صنعتوں کی ترقی اور عمارتوں کی تعمیر میں غلاموں کا نمایاں کردار تھا۔ غلاموں سے نا صرف گھریلو کام کرائے جاتے تھے بلکہ کارخانوں میں بھی ان سے کام کرائے جاتے تھے۔ دہلی سلطنت کے دور میں غلام دو طریقے سے حاصل کیے جاتے تھے۔ خرید و فروخت کے ذریعہ اور دوسرا جنگوں میں قیدی بنانے کے ذریعہ۔ جنگی مہمات و فتوحات کے دوران کافی تعداد میں غلام حاصل ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر 1197 میں قطب الدین ایبک نے تقریباً بیس ہزار اور 1202-030 میں کالنجر کی مہم میں پچاس ہزار لوگوں کو قید کر کے غلام بنالیا تھا۔ 1253-54 کے دوران غیاث الدین بلبن نے رنتھمبور کی مہم میں بڑی تعداد میں لوگوں کو غلام بنایا۔ برنی لکھتے ہیں کہ بلبن نے دوآب کے مہم کے دوران 1767-68 کے درمیان جنگی قیدیوں کو اتنی بڑی تعداد میں غلام بنایا کہ بازار جہاں غلاموں کی خرید و فروخت (Slave Marketing) ہوتی تھی وہاں غلاموں کی قیمت میں بھاری گراوٹ ہوگئی تھی۔ یونہی علاء الدین خلجی کے پاس پچاس ہزار اور فیروز شاہ تغلق کے پاس ایک لاکھ اسی ہزار غلام تھے۔ غلاموں کے انتظام وانصرام کے لیے فیروز شاہ تغلق نے ایک علٰحدہ شعبہ "دیوان بندگان" کے نام سے قائم کیا تھا۔ عفیف لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ نے اقطاع داروں اور فوجی افسروں کے نام حکم صادر کیا تھا کہ دوران مہم فتوحات میں زیادہ سے زیادہ غلام جمع کریں اور ان میں جو شاہی گھرانے کے لیے مناسب ہوں انہیں دارالحکومت بھیج دیں۔

منہاج الدین سراج اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اسی طرح غیاث الدین بلبن ہر باغی کو گرفتار کرنے کے عوض دوٹنکہ دیتا تھا اور گرفتار شدہ باغی کو غلام بنالیتا تھا۔ غلاموں سے مختلف قسم کے کام کرائے جاتے تھے۔ ذاتی خدمات سے لیکر ریاستی کاموں تک ان سے کرائے جاتے تھے۔ شاہی محلات میں دربانی سے لیکر فوجی خدمات تک ان سے کرائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ریاستی کارخانوں میں مختلف قسم کی خدمات ان سے لی جاتی تھی۔ عفیف لکھتے ہیں کہ فیروز شاہ تغلق کے پاس بارہ ہزار ایسے غلام تھے جو مختلف فنون اور دستکاری میں تربیت یافتہ تھے جو کارخانہ میں کام کرتے تھے۔

5.3 کپڑے کے کارخانے (Textile *Karkhanas*)

دہلی سلطنت کے دور میں کپڑے کی صنعت میں دھاگے بننے، کپڑے تیار کرنے، اور رنگین کپڑے تیار کرنے کے کئی طرح کے طریقے اور آلات استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح کپاس بافی میں جدید آلات کے استعمال سے نرم اور معیاری کپاس تیار کیا جاتا تھا۔ چرخہ اس دور کی اہم ٹکنالوجی تھی جس نے کپڑا سازی کو آسان اور بہتر بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کے استعمال سے پہلے کے مقابلے چھ گنا زیادہ دھاگہ تیار کیا جاتا تھا۔ لوم اور چرخہ دونوں کی مدد سے کپڑے کی صنعت (کپڑوں کے کارخانے) میں کپڑے تیار کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے ممالک جیسے اسکندریہ، عراق اور چین سے قیمتی کپڑے کم خواب، ریشمی کپڑے منگائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اندرون ملک سے بھی تیار شدہ کپڑے اور کپڑا سازی کے لیے خام مال دارالحکومت دہلی منگایا جاتا تھا۔ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ دیوگری سے عمدہ کپڑے اور لکھنوتی سے پٹہ دار کپڑے دہلی منگائے جاتے تھے۔ سلطان علاء الدین نے ملتانی تاجروں کو 20 لاکھ پیشکشی رقم دی تھی تاکہ وہ قیمتی کپڑے دوسرے بازاروں سے خرید کر دہلی کے بازاروں میں لائیں۔ رنگ ساز کپڑوں کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے مختلف رنگوں میں رنگتے تھے۔ رنگ تیار کرنے کے لیے وہ مختلف سامان اور طریقے کا استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر نیل مجیٹھ، لاح وغیرہ کا استعمال رنگ تیار کرنے میں کرتے تھے۔ نیل کا استعمال رنگ اور سفید دونوں میں کرتے تھے۔ یونہی کپڑوں کو مزید مزین کرنے کے لیے ان پر نقاشی کے غرض سے چھپائی بھی کرتے تھے۔ اس طرح جدید آلات اور مختلف طریقے اختیار کرکے دہلی سلطنت میں کپڑے کے کارخانوں کو فروغ دیا گیا۔ ٹیکسٹائیل انڈسٹری ان چند صنعتوں میں سے ایک ہے جس کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔

دہلی سلطنت کے دور میں درج ذیل قسم کے کپڑے اور ملبوسات عروج پر تھے۔

مسکن : امیر خسرو کے مطابق یہ سیاہ رنگ کا ریشمی کپڑا تھا۔

اطلس : چمکدار ریشمی کپڑا

استر : ہر قسم کے ریشمی استر

بیرای : ابن بطوطہ نے بیرای کو اعلیٰ قسم کے ململ کے طور پر ذکر کیا ہے۔

باردڈرو : ایک قسم کی بڑی چادر جسے جسم کی ستر پوشی کے استعمال کیا جاتا تھا۔

بارافی	:	ایک قسم کا کوٹ جو اون یا ریشم سے بنا ہوتا تھا۔ آستین پر کڑھائی کا کام ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان فیروز نے اسے پہنا تھا۔
پھیرہ	:	یہ ایک قیمتی لباس تھا جس کی قیمت علاءالدین خلجی نے اپنے مارکیٹ پالیسی کے تحت متعین کیا تھا۔
بہاری	:	ایک خوبصورت اور نفیس کپڑا تھا جو بہار میں تیار ہوتا تھا اور اسی وجہ سے اس کا نام بہاری ہو گیا جیسا کہ امیر خسرو نے بیان کیا ہے۔
سینی	:	یہ ایک چینی نژاد ریشمی کپڑا تھا جسے فارسی میں چینی کی سینی کہا جاتا تھا۔
دیوگیر	:	یہ ایک عمدہ قسم کا ململ تھا جو دیوگیر میں تیار ہوتا تھا۔
جز	:	یہ پانچ قسم کے رنگوں سے تیار شدہ ریشمی کپڑے کا حصہ تھا جو دوسرے کپڑوں یا سامانوں میں لگایا جاتا تھا۔
کتان	:	یونان میں تیار ہونے والا ایک عمدہ اور معیاری کپڑا تھا۔
خز/الخیز	:	یہ ریشم اور اون سے تیار کردہ بھاری اور عالیشان مخمل تھا۔
مشروشری	:	یہ ریشم اور بکری کے بالوں سے تیار کردہ کپڑا تھا۔
سنیاف	:	ایک عمدہ قسم کا ململ جو خاص طور پر بنگال میں تیار ہوتا تھا۔
تبریزی	:	ریشم کا کپڑا جو تبریز (فارس) میں تیار ہوتا تھا۔

ابن بطوطہ محمد بن تغلق کے دور میں کپڑے کی صنعت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چین کے شہنشاہ نے محمد بن تغلق کو قیمتی تحائف ارسال کیا تھا۔ اس کے بدلے میں محمد بن تغلق نے ایک سو بہترین گھوڑے، ایک سو غلام، ایک سو رقاصائین اور گویے، بیرامی کپڑے کے سو ٹکڑی، خز کپڑے کے سو ٹکڑے، سنباف کے سو ٹکڑے اور کشمیر کے اونی کپڑے بھیجا تھا۔

5.4 دھات کے کارخانے (Metal *Karkhanas*)

سلاطین دہلی اپنی فتوحات میں جدید آلات کے استعمال کی وجہ سے کامیاب ہوئے تھے۔ اسی طرح ان جدید آلات میں خاص طور پر ہتھیار جیسے تلوار، خنجر، برچھی، نیزہ، تیر، توپ، یونہی دفاعی آلات جیسے زرہ، بکتر اور ڈھال وغیرہ کا انحصار لوہے پر تھا۔ اسی طرح نعل، رکاب، قلعوں کو توڑنے یا خندق کھودنے کے لیے لوہے کے آلات کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ دہلی سلطنت میں لوہے کی انڈسٹری کو ریاستی سرپرستی میں قابل قدر ترقی حاصل ہوئی۔ مذکورہ آلات ریاست کی ناقابل التوا ضرورت تھی چوں کہ ریاست کی بقا اور اس کی توسیع ان آلات کو نظرانداز یا التوا کر کے ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ سلاطین دہلی نے ان آلات کو تیار کرنے کے لیے کارخانوں کے قیام کو ناگزیر سمجھتے ہوئے ان کے قیام اور نظم ونسق پر خصوصی توجہ دیا۔ رکاب خانہ اور فراس خانہ جیسے شعبہ ریاستی سطح میں کام کرنے کے لیے مزدوروں کو مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح زر پر مبنی معیشت کو فروغ دینے کے لیے کرنسی نظام کیا گیا تھا۔ سلطان التمش نے اس شعبہ پر خصوصی توجہ دیا تھا۔ اس نظام کے تحت

مختلف قدر و قیمت کے علٰحدہ سکے تیار کیے جاتے تھے۔ ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں کہ ٹنکہ اور جنیل دونوں دارالحکومت دہلی میں رائج تھے۔ سکہ سازی کے ضروری دھات خاص طور پر سونا اور چاندی منگائے جاتے تھے۔ شمال ہندوستان اور دکن میں زخیرہ اندوزی کے بعد سونا اور چاندی منگائے جاتے تھے۔ مذکورہ قیمتی دھات مذکورہ علاقوں سے طلب کر کے ریاستی کارخانہ دہلی میں سکے تیار کیے جاتے تھے۔ دہلی سلطنت کے دور میں تین دھات سونا، چاندی اور تانبا کے سکے تیار ہوتے تھے۔ اس طرح اس دور میں سکہ سازی کے کارخانے کو فروغ ملا۔

اس کے علاوہ سونا اور چاندہ کے مصنوعات میں زیورات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ زیورات تیار کرنے کے لیے کارخانہ کے قیام سے متعلق کوئی پختہ معلومات نہیں ہے۔ تاہم زیورات کے چلن سے متعلق ہمارے پختہ ثبوت ہیں۔ عفیف لکھتے ہیں کہ جاج نگر میں سونے اور چاندی کی بہتات ہے اور یہاں کی عورتیں زیورات سے آراستہ ہوتی ہیں۔ دہلی سلطنت کے دور میں سلاطین امرا اور شاہی گھرانے کی خواتین زیورات کا استعمال کرتے تھے۔ سلاطین سونے اور چاندی سے آراستہ کپڑے جیسے کتان اور جبہ پہنا کرتے تھے۔ شاہی کوتاہ انتہائی مزین زور خوبصورت ہوتا تھا جیسے خاص موقعوں پر سلاطین پہنا کرتے تھے۔ اسی طرح تاتاریال (جبہ) کو سونے سے مزین کیا جاتا تھا جسے خاص موقعوں پر سلاطین اور امرا پہنا کرتے تھے۔ سونے اور چاندی کے علاوہ قیمتی پتھروں جیسے ہیرے، موتی، زمرد، نیلم، نقریں وغیرہ کارخانوں میں تیار ہوتے تھے۔ جس طرح بڑھئی، دباغ، چمار، کمہار، برتن ساز، دھنیا، کپاس باف، معمار، فن کار، دیگر کاریگر ان شہروں میں رہتے اور کام کرتے تھے۔ اسی طرح سنار بھی شہروں میں قیام پذیر تھے اور کارخانوں میں کام کرنے والے کاریگر اور سنار سب شہروں میں رہائش پذیر تھے۔ اس طرح ان کا کردار صرف معیشت کے فروغ میں نمایا نہیں تھا بلکہ شہروں کی ترقی میں بھی قابل انکار خدمات تھی۔

5.5 کھال کے کارخانے (The Fur *Karkhanas*)

دہلی سلطنت کے دور میں جس طرح کپڑے اور دھات کے کارخانوں کو حکومت کی سرپرستی میں ترقی حاصل ہوئی اسی طرح کھال کے کارخانوں کو بھی قابل قدر فروغ حاصل ہوا۔ کھا/چمڑے کی مصنوعات مختلف مقاصد کے تحت تیار اور استعمال ہوئی تھیں۔ ان میں خاص طور پر جنگی آلات جیسے زرہ، بکتر اور ڈھالیں، زین لگام وغیرہ یونہی روزمرہ استعمال کے سامان جیسے جوتا، چپل، بیلٹ، بیگ، مشکیزہ وغیرہ کو شمار کر سکتے ہیں۔ چمڑے کی مصنوعات تیار کرنا ایک اہم عمل تھا جس میں جانوروں سے کھال اتارنے سے لیکر سامان تیار کرنے تک کئی تکنیک کا استعمال اور کئی مرحلوں سے گذارنا پڑتا تھا۔ اس پورے عمل میں کئی کاریگروں، نقش نگاروں اور مزدوروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ چمڑے کو دباغت کے عمل کے ذریعہ مصنوات تیار کرنے کے قابل بنایا جاتا تھا جس میں نمک، دھوپ کے علاوہ مختلف قسم کے قدرتی کیمیکلز کا استعمال کیا جاتا تھا۔ پھر کھال کو مختلف شکلوں میں ضرورت اور نقچے کے مطابق کاٹا جاتا تھا۔ اس کے بعد مصنوعات کو خوبصورت اور جاذب نظر بنانے کے لیے ان پر نقش و نگار اور عمدہ زیبائش کی جاتی تھی۔ چمڑے کی صنعت جہاں بڑے پیمانے پر کھال کی مصنوعات تیار ہوتی تھی وہ دہلی، لکھنو اور ملتان میں قائم تھی۔ دہلی دارالحکومت ہونے کی وجہ سے یہاں نسبتاً زیادہ کاریگر اور مزدور کام کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں کھال سے جنگوں اور گھروں میں استعمال ہونے والے سامان کافی تعداد میں تیار ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ لکھنو اور ملتان میں بھی چمڑے کی صنعت کے لیے مشہور

تھے جہاں کھال کی مصنوعات کافی مشہور تھی۔ یہاں کے کارخانوں میں تیار ہونے والے سامان ہندستان کے علاوہ بیرون ملک بھی بھیجے جاتے تھے۔ کھال کی مصنوعات اس دور کا ایک اہم تجارتی سامان تھا۔

5.6 ظروف سازی کے کارخانے (Utensils *Karkhanas*)

دہلی سلطنت کے دور میں ظروف سازی کے دہلی، ملتان اور گجرات اہم مراکز تھے۔ دہلی میں ظروف سازی کے متعدد ورکشاپس تھے جہاں کافی تعداد میں ماہر ظروف ساز اور کمہار کام کرتے تھے۔ ملتان میں نیلے برتن تیار کیے جاتے تھے۔ نیلے برتن کی روایت قدیم مصر میں رائج تھی۔ مصر کے عہد مملوک میں مسلمان اس روایت سے واقف ہوئے جب مصر پر جو کہ دریائے نیل کی ریت، تانبا اور سہاگہ سے تیار ہوتا تھا۔ ان کو فتح حاصل ہوئی اور اپنی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح نیلے برتن کی روایت ہندوستان میں قیام دہلی سلطنت کے بعد فاتحین کے ذریعہ متعارف ہوا۔ اس طرح ظروف سازی کا ایک اہم مرکز گجرات میں واقع کمبے بھی تھا جو اپنے چمکدار برتنوں کے لیے مشہور تھا۔ دہلی سلطنت کے دور میں مختلف قسم کے برتن متعدد مقاصد جیسے گھریلو استعمال کے برتن (صراحی، مٹکا) تزئینی برتن (گلدان ، مجسمے) اور تجارتی برتن وغیرہ تیار کیے جاتے تھے۔ چاک کی مدد سے پلے برتن کا سانچہ تیار کر کے بھٹی میں پکایا جاتا تھا۔ پھر کندہ کاری اور نقش نگاری کے ذریعہ رنگوں کی مدد سے خوبصورت اور جاذب نظر بنایا جاتا تھا۔ گھریلو استعمال کے علاوہ تجارتی اور کاروبار کے غرض سے بھی برتن تیار کیے جاتے تھے۔ اس طرح ظروف سازی براہ راست دہلی سلطنت میں معیشت سے جڑی ہوتی تھی۔ ظروف سازی کی روایت اور تکنیک دوسرے ممالک کی روایات سے وابستہ تھی اس لیے اس کی ثقافتی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ ظروف سازی کا ایک اہم پہلو شہری ترقی سے جڑا ہوا ہے۔ شہروں کی ترقی اور آبادی میں اضافہ دونوں ہی برتنوں کے مطالبہ کے باعث تھے۔ شہروں میں کاریگروں اور تاجروں کی قیام اور ان کے تجارتی سرگرمیاں براہ راست معیشت سے وابستہ تھے۔ صنعتی اور تجارتی ترقی کا شہر کاری یا شہری ترقی میں نمایا کردار تھا۔ اس صنعت نے اقتصادی، ثقافتی اور شہری ترقی میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔

5.7 شہر کاری (Urbanisation)

دہلی سلطنت کے دور میں شہری ترقی کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم میں ان شہروں کو ہم شمار کر سکتے ہیں جن کا انتظامی اقدام یا ریاستی نظام حکومت کے زیر اثر عروج حاصل ہوا۔ ان میں لاہور، ملتان، سیالکوٹ، دہلی، حصار، جونپور، احمد آباد، برہانپور، آگرہ اور دولت آباد سر فہرست ہیں۔ دوسری قسم کی شہریں جن کو تجارتی اور معاشی سرگرمیوں کے تحت ترقی حاصل ہوئی۔ ان میں چند نمایاں شہر دہلی، لکھنو، گوالیر، اچھ، لاہور، ملتان، کارامنکپور، گجرات (کھمبایت) اور لکھنوئی ہیں۔ تیسری قسم میں ہم ان شہروں کو شمار کر سکتے ہیں جن کی بنیاد یا از سر نو شہری حیثیت حاصل ہوئی۔ آسان لفظوں میں جن کا قیام دہلی سلطنت کے دور میں عمل میں آیا۔ ان میں چند نام ہانسی، حصار، تھانیسر، سنام، بھٹنڈہ، بیانہ، میرٹ، بارن (بلند شہر)، کول (علی گڑھ)، قنوج، براپول، امروہا، پاکپٹن وغیرہ ہیں۔

ان میں بعض ایسے شہر ہیں جن کی ترقی محض تجارتی سرگرمیوں اور صنعت گری کے نتیجہ میں ہوئی ہے یا اپنے مخصوص مصنوعات

کے لیے جانے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر اچھ ملتان اور لاہور ایسے شہر تھے جو دیگر خصوصیات کے ساتھ بڑے بازار اور خوبصورت عمارات کے لیے مشہور تھے۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ ایودھیا پٹہ دار کپڑے، گولا (روہیل کھنڈ) ریشم کے پیداوار، دیوگیری مسلن اور لاہور شکر کی پیداوار کے لیے مشہور تھے۔ اسی طرح قنوج عمدہ اور سستی شکر کی دستیابی کے لیے معروف تھا۔ دولت آباد اور چندبری اپنے بڑے بازاروں اور تاجروں کی کثرت آمد کے لیے جانے جاتے تھے۔ حسن نظامی کے مطابق انہلواڑہ تجارتی گذرگاہ پر واقع ہونے کی وجہ سے کافی ترقی پذیر تھا۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ ساحلی علاقہ میں واقع ہونے کی وجہ سے یمن اور فارس سے اور دیگر مقامات سے تجارتی تعلقات اور رابطہ بہت مستحکم تھا۔ اس طرح گجرات کے بندرگاہ سے سندھ کا مختلف اشیاء اور مصنوعات کی تجارت کے لیے دنیا میں مشہور تھا۔ لکھنوئی عمدہ قسم کے کپڑے کے لیے کافی معروف تھا۔

5.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

13ویں اور 14ویں صدی میں ہندوستان میں شہروں کی ترقی کے دو بڑے عوامل تھے۔ سلاطین دہلی مزاجاً شہریت پسند تھے۔ دوسرا نقد معیشت کے فروغ کے لیے نقد کاروبار اور تجارت پر زور۔ تجارت اور نقد کاروبار کی ترقی اسی وقت ممکن تھی جب تجارتی سامان کی صنعت کارخانوں اور کاریگروں کی پشت پناہی کی جاتی۔ لہٰذا سلاطین دہلی نے مختلف مصنوعات کے کارخانوں کے قیام کے نظم و نسق پر توجہ رہا۔ انہوں نے انتظامی مراکز کا قیام، تجارتی راہوں کی حفاظت، سلطنت کی توسیع، جدید فتوحات، سکہ سازی، قانونی اور تنظیمی کاروبار وغیرہ پر غیر معمولی توجہ دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دہلی سلطنت کی معیشت کو ترقی ملی۔ معاشی ترقی نے شہری ترقی کے لیے راہیں ہموار کیا جس کے نتیجہ میں سابق شہروں کی توسیع اور جدید شہروں اور قصبوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ تاجروں اور کاریگروں نے نہ صرف معیشت کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ بازاروں اور کارخانوں کو مصنوعات کی تیاری کے لیے خام مال اور دیگر ضروری ذرائع فراہم اور خرید و فروخت کے لیے راہیں ہموار کرکے شہروں کی ترقی میں بھی نمایا کردار ادا کیے۔ ملتانی تاجروں اور ساہوکاروں نے مونیٹائیزیشن کے عمل کو مستقل کرنے میں بھی قابل ذکر خدمات انجام دیا۔ مونیٹائزیشن کا شہروں کی ترقی میں ناقابل انکار کردار ہے۔ اس ضمن میں سرائے جہاں مسافرین اور تاجرین کے قیام وبعام کا انتظام اوران کے سامانوں کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا تھا، کا بھی کافی اہم رول تھا۔ تعمیرات، ٹیکسٹائیل، زراعت، دھات۔ کھال، ظروف سازی وغیرہ جیسی صنعتوں میں جدید آلات اور طریقہ کار نے مصنوعات کو معیاری اور تعمیری کاموں کو آسان کرکے شہری ترقی کے لیے راہیں ہموار کیا۔

5.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

کارخانہ، شہر کاری، متصرف

آلات، مصنوعات، شعبہ

5.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مسکن کسے کہتے ہیں؟
2. اطلس سے کیا مراد ہے؟
3. ابن بطوطہ نے بیرای کو اعلیٰ قسم کے _____ کے طور پر ذکر کیا ہے۔
4. باردڈرو کیا ہوتی تھی؟
5. دہلی سلطنت کا وہ پہلا حکمراں کون تھا جس کے دور میں کارخانوں کا دائرہ کافی وسیع ہوا؟
6. سلطان علاءالدین نے ملتانی تاجروں کو 20 لاکھ پیشکشی رقم کیوں دی تھی؟
7. ابن بطوطہ کے مطابق چین کے شہنشاہ نے کس دہلی سلطان کو قیمتی تحائف ارسال کیے تھے؟
8. دہلی سلطنت کے دو سکوں کے نام بتائیے۔
9. دہلی سلطنت کے دور میں شہری ترقی کو کتنے حصوں میں تقسیم کر کے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے؟
10. کھمبایت کہاں واقع ہے؟

5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں دھات کے کارخانہ پر نوٹ لکھیے۔
2. دہلی سلطنت میں کپڑے کے کارخانہ پر نوٹ لکھیے۔
3. دہلی سلطنت میں کھال کے کارخانہ پر نوٹ لکھیے۔
4. ظروف سازی کے کارخانے پر نوٹ لکھیے۔
5. دہلی سلطنت میں شہر کاری پر نوٹ لکھیے۔

5.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں کارخانوں کے قیام اور نشوونما پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. دہلی سلطنت کے دور میں کارخانوں کے قیام اور شہروں کی ترقی کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالیے۔
3. کارخانوں کی ترقی میں غلاموں کے کردار پر مختصر مضمون لکھیے۔

5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ahmed, Fouzia Farooq, *Muslim Rule in Medieval India*: *Power and Religion in the Delhi Sultanate*, Bloomsbury, New Delhi, 2022.
2. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
3. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
4. Habib, Irfan, *Economic History of India*, *AD 1206–1526*, Tulika Books, Delhi, 2016.
5. Kumar, Sunil, *The Emergence of the Delhi Sultanate*, *1192–1286*, Permanent Black, Ranikhet, 2007.
6. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*: *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers, New Delhi,1995 (first pub. in 1983).
7. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That Was India*, part–II, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first pub. in 1987).
8. Raychaudhuri, Tapan and Irfan Habib, *The Cambridge Economic History of India*, *Vol. I*, Cambridge University Press, Delhi, 1982.
9. Shrimali, Krishna Mohan, *Land, Agriculture and Money in Central India and Beyond* (*c. 100 to c. 1300 A.D.*): *A Feudal Order Revisited*, Aakar, Delhi, 2024.
10. Sharma, R.S., *Indian Feudalism*, *c. AD 300–1200*, Macmillan, Delhi, 2013 (first pub. in 1965).

اکائی 6۔ تکنیک اور شہر کاری

(Technology and Urbanisation)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 دہلی سلطنت میں تکنیکی نشوونما

6.2.1 رنگ ریزی اور طباعت/چھپائی

6.2.2 کاغذ اور جلد سازی تکنیک

6.2.3 زراعتی تکنیک

6.2.4 آبپاشی تکنیک

6.2.5 تعمیراتی تکنیک

6.2.6 عسکری تکنیک

6.3 تکنیک اور آلات پر مالکانہ حیثیت

6.5 اکتسابی نتائج

6.6 کلیدی الفاظ

6.7 نمونہ امتحانی سوالات

6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید (Introduction)

اس اکائی میں دہلی سلطنت (1206-1526) میں تکنیک، دست کاری، اور شہروں کی ترقی جیسے اہم موضوعات کا مطالعہ کریں گے۔ خاص طور پر زراعت، عمارت / تعمیر، ٹکسٹائل، کاغذ، گلاس اور کشتی سازی، جنگ سے وابستہ تکنیکوں اور ان کے طریقہ استعمال کے بارے میں اہم معلومات حاصل کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کی تاریخی حقائق اور مراحل ترقی کے ساتھ ان کی تئیں سلاطین دہلی کے رویے کا بھی تجزیاتی جائزہ لیں گے۔ نیز سلاطین کے علاوہ دیگر طبقوں جیسے تاجروں، مزدوروں اور غلاموں کا تکنیک اور شہروں کی ترقی میں کیا کردار تھا؟ اس بارے میں بھی اہم معلومات حاصل کریں گے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت میں تکنیک اور شہر کاری کی ترقی کو سمجھ سکیں گے۔
- تکنیک اور شہر کاری کے مابین رشتوں کی نوعیت کا علم حاصل کر سکیں گے۔
- زراعت، کپڑے، کاغذ سازی، چھپائی، کتابوں کی جلد بندی، فن تعمیر اور دیگر صنعتوں سے وابستہ تکنیک میں اختراعی اور اصلاحات کے بارے میں خاطر خواہ واقف ہو سکیں گے۔

6.2 دہلی سلطنت میں تکنیکی نشوونما (The Growth of Technology during Delhi Sultanate)

دہلی سلطنت کے دور میں کپڑے کی صنعت کو قابل قدر ترقی ملی۔ اس دور میں ٹکسٹائل سازی میں کئی جدید آلات اور طریقہ کار کا استعمال ہونا شروع ہوا۔ مثال کے طور پر کم وقت میں زیادہ مظبوط اور عمدہ کپاس تیار کرنے کے لیے تین مختلف طریقہ کار اور تکنیک یعنی سوت اوٹائی (Yarn Jenning)، سوت دھنائی (Yarn Carding) اور سوت کتائی (Yarn Spinning) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ کپاس تیار کرنے کے لیے پہلے مخصوص طریقہ تھا۔ اولاً بیج سے کمان نما ایک چھڑی کی مدد سے علٰحدہ اور نرم بنایا جاتا تھا۔ پھر دوسرے مرحلہ میں اس کو دھنا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار کو فارسی میں ندافی کہا جاتا تھا۔ پھر آخری مرحلہ میں اسے ایک مخصوص آلہ کار جسے فارسی میں ڈک اور ہندی میں تکلہ کی مدد سے گھما گھما کر مضبوط اور معیاری بنایا جاتا تھا۔

کپڑے کی صنعت میں چرخہ کا استعمال دور کی سب سے بڑی تکنیک تھی۔ چرخہ کا ذکر تاریخی مصادر میں سب سے پہلے عصامی کی کتاب فتوح السلاطین میں ملتا ہے۔ عصامی سے پہلے ہندوستان کے کسی بھی تاریخی ماخذ میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چرخہ ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد 13 ویں اور 14 ویں صدی کے درمیان متعارف ہوا۔ چرخہ کے استعمال سے نہ صرف سوٹ تیار کرنا آسان ہوا بلکہ اس کی تعداد میں اضافہ، کمیت میں بہتری اور پیداوار میں سرعت / تیزی آگئی۔ ایک اندازہ کے مطابق چرخہ کے استعمال

سے پہلے کے مقابلہ اب تقریباً چھ گنا زیادہ دھاگہ /سوت تیار کیا جاتا تھا۔ مطلب کم وقت میں زیادہ اور بہتر کپڑے تیار ہوتے تھے۔ چرخے کے استعمال سے کپڑے کی صنعت کو غیر معلولی ترقی حاصل ہوئی۔ چرخہ کے سانچے کے دونوں طرف لکڑی کے دو تکلے (Spindle) لگے ہوئے تھے جو ایک پٹی کے ذریعہ ایک دوسرے سے جڑے ایک پہیہ سے بندھے ہوتے تھے۔ اسی پہیہ کی مدد سے چرخہ کو کافی تیزی سے گھمایا جاتا تھا۔ یہ پہیہ دراصل ایک طرح سے قوت کے تبادلے کا کام کرتا تھا۔ بعد میں چرخہ کو دستہ سے بھی گھمایا جانے لگا تھا۔ چرخہ کے ساتھ دستہ کو منسلک کیے جانے کا ذکر کتب تاریخ میں نہیں ہے تاہم مفتاح الفضلا میں اس کی ایک تصویر ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً 16 ویں صدی میں دستہ کی بدولت چلانا شروع ہوا ہوگا۔

قدیم ہندوستان یا ماقبل دہلی سلطنت کپڑے بنائی یا سوٹ کٹائی میں کس قسم کے آلات استعمال ہوئے تھے اس بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہے۔ ماقبل دہلی سلطنت سوٹ سازی میں لوم کا استعمال سے متعلق تاریخی شواہد نادار دہیں مفتاح الفضلا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت قائم ہونے کے بعد ہندستان میں اس کا استعمال سوٹ سازی اور کپڑوں کی بنائی میں شروع ہوا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ بنکر کا کرگھا (Drawloom) جنوبی ہندوستان میں 1001ء میں مستعمل تھا تاہم تاریخی شواہد کی عدم موجودگی میں اس طرح کے بیانات پر یقین کرنا مشکل ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں کرگھے کے استعمال کا ثبوت 17 ویں صدی عیسویں میں ملتا ہے۔ بحر حال کرگھے کے استعمال سے کپڑوں کی صنعت کو قابل قدر ترقی ملی۔ کپڑوں کی بنائی میں غیر معمولی تیزی اور کمیت میں بہتری اور تعداد پیداوار میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ بیک وقت رنگین کپڑے بھی تیار کیے جا سکتے تھے۔

6.2.1 رنگ ریزی اور طباعت/چھپائی (Dyeing and Printing)

اس دور میں نباتاتی اور جماداتی اشیاء سے مختلف رنگ تیار کئے جاتے تھے اور پھر اسے رنگ ریزی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ رنگ تیار کرنے میں نیل، مجیٹھ وغیرہ کا استعمال اکثر وبیشتر کیا جاتا تھا۔ پختہ رنگ تیار کرنے کے لیے اس میں دوسرے سامان جیسے پھٹکری ملایا جاتا تھا۔ جیسے سفید بنانے (Bleaching) اور رنگ ریزی دونوں میں نیل کا کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑوں پر چھپائی کے لیے کئی مختلف طریقہ کار اپنایا جاتا تھا۔ جیسے سفید بنانا اور ایندھن وغیرہ کے ذریعہ چھپائی کا کام کیا جاتا تھا۔

6.2.2 کاغذ اور جلد سازی تکنیک (Paper and Book Binding Techniques)

قدیم ہندوستان میں کاغذ سازی کی کوئی تکنیک نہیں تھی۔ پتھر اور تانبے کی تختی، ریشم اور سوتی کپڑوں اور خاص طور پر کھجور کے پتوں پر لکھی جاتی تھی۔ دہلی سلطنت میں کاغذ سازی کو فروغ ملا۔ کاغذ سازی کا عمل سب سے پہلے پہلی صدی عیسوی میں چین نے شروع کیا۔ 751 میں عربوں کچھ چینی لوگوں کو قیدی بنایا تھا اور ان قیدیوں سے عربوں نے کاغذ سازی کا ہنر سیکھا اور اس کو مزید ترقی دیا۔ چین میں کاغذ بانس سے تیار کیا جاتا تھا۔ عربوں نے پرانے کتان (Lenin) سے کاغذ تیار کرنے کی تکنیک کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں غالباً 7 ویں صدی عیسویں میں کاغذ سازی کا عمل شروع ہوا تھا۔ لیکن کاغذ پر لکھنے کا رواج بعد میں شروع ہوا۔ چونکہ اسی دور میں ایک چینی سیاح ای چنگ ہندوستان

آیا تھا وہ سنسکرت زبان لکھ کر اپنے ملک لے جانا چاہتا تھا لیکن کاغذ کی عدم دستیابی کی وجہ سے وہ اپنی خواہش پوری نہیں کر سکا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دہلی سلطنت میں کاغذ سازی کے عمل کو غیر معمولی ترقی ملی اور بڑے پیمانے پر کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کاغذ کا استعمال نہ صرف تحریر لکھنے کے لیے ہوتا تھا بلکہ ایسے شواہد ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں حلوائی کاغذ پر رکھ کر مٹھائیاں فروخت کرتے تھے۔ دہلی سلطنت میں کاغذ سازی کا کام ہوتا تھا تاہم دوسرے ممالک خاص طور پر سمرقند اور شام سے کاغذ درآمد ہوتا تھا۔ 14 ویں صدی کے ایک چینی تاجر ماحوان (Mahuan) رقم طراز ہیں کہ کاغذ اکثر و بیشتر اسلامی ممالک سے ہندوستان درآمد ہوتا تھا۔ اس دور میں کاغذ کی آسانی دستیابی نے تصنیفی امور کو آسان کو کر دیا۔ چنانچہ کثیر تعداد میں کتابیں لکھی جانی لگی۔ بعد میں کافی زخیم بھی لکھی جاتی تھی۔ ان کتابوں کے متعدد نسخے تیار کئے جاتے تھے۔ کتابوں کو مزین کرنے کے لیے سرخیاں، حاشیہ اور حاشیہ بندی میں رنگوں کا استعمال ہوتا تھا۔ یہ عام طور پر رنگین لکھے جاتے تھے۔ کتابوں کو محفوظ اور پائیدار بنانے کھالوں یا کپڑوں سے ان کی جلد کو تیار کیا جاتا تھا۔ اس دور میں جلد سازی نے ایک جدید تکنیک کو جنم دیا۔ جلد سازی یا جلد بندی میں کتابوں کے صفحات کو ترتیب وار جمع کر کے اس کو محفوظ اور مضبوط شکل دینے کے لیے صفحات کو سی کر مضبوط / سخت جلد پر گوند سے چپکا دیا جاتا تھا۔ کتابوں کی جلد بندی۔ جلد سازی اس دور کی اہم اختراع کردہ تکنیک تھی۔

6.2.3 زراعتی تکنیک (Agricultural Techniques)

دہلی سلطنت میں زراعت میں آسانی اور زرعی پیداوار میں اضافہ کی غرض مختلف طریقے اور آلات اختیار کیا گیا۔ ان میں آبپاشی، پلو اور ہل، کھاد اور فصل سے وابستہ طریقے اور آلات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

6.2.4 آبپاشی تکنیک (Irrigation Techniques)

زراعت کے لیے موسمی برسات کے علاوہ ندی، نہر، کوان اور تالاب وغیرہ بھی دستیاب تھے جہاں سے کاشت کاری کے لیے پانی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ کسان ندیوں سے نہریں کھود کر کھیتوں تک پانی کی رسائی کرتے تھے۔ لیکن کوئیں سے پانی نکال کر کھیتوں تک پہنچانا کا مشکل کام تھا۔ چنانچہ کوان سے پانی نکالنے کے لیے اس دور میں درج ذیل طریقے اور آلات استعمال کیے جاتے تھے۔

1. سینچائی۔ آبپاشی کے لیے ایک انتہائی سادہ طریقہ تھا۔ بالٹی کو رسی میں باندھ کر کوئیں سے پانی کھینچ کر کھیتوں میں ڈالا جاتا تھا۔ اس میں وقت اور طاقت زیادہ صرف ہوتا تھا اور پانی بہت کم نکلتا تھا۔ تاہم چھوٹے کھیتوں کی سینچائی ہو جاتی تھی۔ اس سے ان فصلوں کو بھی آبپاشی ہو جاتی تھی جن کی زراعت کے لیے کم پانی کی ضرورت ہوتی تھی۔
2. سینچائی کے لئے دوسری تکنیک تھی۔ چرخی۔ گھرنی۔ چرخی کے ساتھ رسی اور بالٹی کا استعمال ہوتا تھا لیکن اس میں کم طاقت لگتی تھی اور بڑی بالٹی میں پانی نکالا جاسکتا تھا۔ اول الذکر طریقہ سینچائی کے مقابلہ پر زیادہ آرام دہ تھا اور پانی بھی سرعت کے ساتھ کواں سے زیادہ نکالا جاسکتا تھا۔ شرخہ کا استعمال عورتیں / خواتین اپنے خوانگی کاموں میں پانی بھرنے کے لیے کرتی تھیں۔
3. کوان سے پانی نکالنے کے لیے چرخہ کو مرد یا عورت دونوں گھما سکتے تھے لیکن بیلوں کے ذریعہ چرخہ گھمانے کی تکنیک بہت اہم اختراع تھا۔

اس تکنیک نے کوئیں سے پانی نکالنے کے عمل کو بہت ہی آسان کر دیا۔اب انسان کی جگہ جانوروں/بیلوں کا استعمال کیا جارہا تھا جس سے کم وقت میں بیک وقت ایک چرخہ میں کئی بالٹیاں باندھ کر پانی نکالا جاسکتا تھا۔اس تکنیک کی بدولت گہرے کوؤں سے بھی پانی نکالنا اور آبپاشی آسانی ہو گیا۔اس طریقہ کار میں چرسہ کا بھی استعمال ہوتا تھااور اس سے بھی پانی نکالا جاتا تھا۔چرخہ کا استعمال آج بھی شمالی ہندوستان کے مقامات پر جاری ہیں۔

4. آبپاشی سے وابستہ دہلی سلطنت کے دور کی ایک اہم تکنیک شادوف تھی جس کو سنسکرت میں ٹولہ کہا جاتا تھا۔یہ پہلی نیم تکنیکی مشین تھی جس کا استعمال کوان یا پانی کے منبع سے پانی نکالنے کے لیے ہوتا تھا۔یہ درخت کی مضبوط اور لمبی شاخ یا شہتیر (لکڑی کا لمبا سیدھا ٹکڑا) کے بالکل آخری حصہ پر لمبی رسی سے بالٹی باندھ دیا جاتا تھااور اس کے دوسرے حصہ /دوسرے سرے پر کاؤنٹر ویٹ یعنی توازن برقرار رکھنے کے لیے کوئی بھاری سامان جیسے پتھر وغیرہ باندھ دیا جاتا تھا۔یہ ایک محور پر متوازی طریقہ سے استفادہ ہوتا تھا۔ آبپاشی کے وقت رسی کو ہاتھ میں پکڑ کر بالٹی کو کوان میں موجود پانی میں ڈوبا کر اس میں پانی بھر کر باہر آسانی سے نکالا جاتا تھااور اس طرح سینچائی میں اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔اس تکنیک کا قدیم مصر اور میسوپوٹامیا وغیرہ میں استعمال ہوتا تھا۔یہاں پر یہ شادف کے نام سے معروف تھی۔ دہلی سلطنت کے دور میں اس تکنیک کا استعمال سینچائی کے لیے ہوتا تھا۔اس کو سنسکرت میں تولہ اور بہار اور بنگال میں دھنکی یا لٹھ کہا جاتا ہے۔

5. آبپاشی سے وابستہ پانچویں تکنیک ساقیہ تھی جس پر آبی پہیہ لگا ہوتا تھا۔مذکورہ کسی بھی آلہ آبپاشی میں پہیہ نہیں ہوتا تھا۔یہ پہلا آلہ آبپاشی تھا جس پر پہیہ لگا ہوتا تھا۔اس کو مشینی آلہ کہا جاسکتا ہے چونکہ ایک طرف گیئر سسٹم سے چلتا تھا جو بیلوں یا گدھوں کے ذریعہ چلایا جاتا تھا۔

تاریخ میں یہ ایک بحث و تحقیق کا ایک مسئلہ رہا ہے۔آیا ہندوستان میں ترکوں کے آنے سے پہلے مروج تھا یہ ترکوں کی معرفت ہندوستان میں متعارف ہوا۔ہندوستان میں ساقیہ کی ہی طرح ایک آلہ آبپاشی کا ثبوت ملا ہے جس کی بناوٹ کچھ ایک اسکوپ وہیل کی طرح تھی جس میں بالٹی، جار یا اسکوپس کا استعمال ہوتا تھااور یہ براہ راست عمودی پہیے سے باندھا ہوتا تھا جو ایک مضبوط بیلٹ سے مربوط ہوتا تھا۔یہ عمودی پہیہ ایک شادوف کے ذریعہ افقی پہیہ سے منسلک ہوتا تھا۔ساقیہ کو پرشین ویل، رہٹ، ارہٹ اور لاطینی زبان میں ٹائم پمپ کہا جاتا ہے۔ساقیہ اب بھی ہندوستان جیسے مصر، مشرقی وسطیٰ وغیرہ میں استعمال ہوتا ہے۔اس کا استعمال عموماً کنواں یا پانی کے منبع سے پانی نکالنے کے لیے کیا جاتا تھا۔گھریلو ضرورتوں کے علاوہ کھیتوں پر فصلوں کی سینچائی کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ساقیہ اپنے استعمال کی وجہ سے نوریہ سے مختلف تھا۔نوریہ پانی کی حرکت سے چلتا ہے۔جبکہ ساقیہ کو چلانے کے لیے جانوروں کی مدد لی جاتی ہے۔ساقیہ کے استعمال سے زراعت و کاشت کاری میں غیر معمولی بہتری آئی۔شادوف کے استعمال کا انحصار انسانی توانائی پر تھا۔ساقیہ پہلی مشین تھی جس کا انحصار انسانی توانائی پر نہیں تھا۔دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ساقیہ شادوف کے مقابلہ نسبتاً زیادہ پانی اور زیادہ دور تک رسائی کرتا تھا۔

کاشتکاری کے متعلق اہم ٹکنالوجی 'ہل' تھا۔ہندوستان میں کاشت کاری، زراعت کے شروعات کے ثبوت ہمیں ہڑپائی تہذیب کے ایک مقام کالی بنگن (راجستھان) سے آثار قدیمہ کے طور پر دریافت ہوتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھیتوں کی جتائی کے لئے غیر دھاتی

/غیر آہنی ہل کا استعمال ہوتا تھا۔ ویدک عہد میں بیل کے ذریعہ ہل چلانے کا رواج شروع ہوا۔ عہد آہنی میں ہل کی پھال لوہے سے بنایا جانے لگا گرچہ بقیہ فریم ٹمبر کی لکڑی کا بنایا جانے لگا۔ دھار دار آہنی پھال کی ایجاد نے سخت زمین کو جوتنے میں آسان بنادیا۔ مفتاح الفضلا میں ایک تصویر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک کسان کھیت پر بیل سے ہل چلا رہا ہے۔ اس تصویر میں صاف طور پر لکڑی کال اور لوہے کی بھال دیکھی جاسکتی ہے۔ اس تصویر سے عیاں ہوتا ہے کہ دہلی سلچنت مین انہی بھال کا ہل کے طور پر استعمال عام تھا۔ یوروپ کے بر خلاف جہاں ہل چلانے میں گھوڑوں کی مدد لی جاتی تھی چوں کہ شاید وہاں کی زمین زیادہ سخت ہے اس لیے بیل، بھینس کی جگہ گھوڑوں سے کام لیتے تھے۔ ہندوستان میں بالعموم بیل اور بھینس کو ہل چلانے میں استعمال کرتے تھے۔

6.2.5 تعمیراتی تکنیک (Architectural Technology)

دہلی سلطنت میں سب سے بڑی تبدیلی فن تعمیر میں تھی۔ اس دور میں بلڈنگ انڈسٹری (تعمیراتی صنعت) کو غیر معمولی ترقی ملی۔ اس دور میں عمارتوں کی تعمیر میں مختلف تعمیراتی مادوں، طریقوں، آلات اور جدید تکنیک کا آغاز ہوا۔ تغلق آباد کی کھنڈر عمارتوں اور دیواروں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح دہلی سلطنت میں حکمراں اور امرا طبقہ کے ساتھ اوسط درجہ کے لوگوں رہائش گاہیں اور کچے مکانات پختہ عمارتوں میں تبدیل ہو گئیں۔ جدید تعمیراتی مادوں اور جدید آلات کے استعمال سے عمارتوں کی ساخت وہیت، سائز، تعاشی اور زیبائش وغیرہ میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

پتھر چونا کا گارا: قدیم طرز تعمیر میں بسا اوقات مٹی، پتھر، کنکر اور لکڑی کا استعمال کیا جاتا تھا تاہم کنکر کا استعمال کم تھا۔ عام طور پر مٹی اور پانی سے تیار کردہ گارا کا استعمال موجودہ سمینٹ کی جگہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ پانی اور مٹی کے ساتھ بھوسہ کو ملا کر پلاسٹر میں استعمال کیا جاتا تھا۔ پتھر چونا کا گارا قیام دہلی سلطنت کے بعد ہندوستان میں متعارف ہوا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں اس قسم کے گارہ کا استعمال کے ثبوت نہیں ملتا۔ یہ گارہ دو مادوں یعنی چونا اور سرخی مائل ریت اور پانی کو ملا کر تیار کیا جاتا تھا۔ چونا کے دو اہم مادے تھے جپسم اور ٹکلا جن سے چونا تیار کیا جاتا تھا۔ گارا تیار کرنے کے لیے سب سے پہلے چونا کو پانی میں ڈال کر بجھایا جاتا تھا جسکو بجھا ہوا چونا (سلیک لائم) کہا جاتا تھا۔ پھر اس بجھے ہوئے چونا کو کاسٹنگ مادہ میں تبدیل کر کے اس میں ریت اور پانی ملا کر بسدار بتایا جاتا تھا۔ بسا اوقات اسکو مزید بسدار بنانے کے لیے اس میں رال آمیز اور گلوٹینی ملایا جاتا تھا۔ گارا عمارتوں کو مضبوطی اور پائیداری فراہم کرنے کے ساتھ موسمی اثرات جیسے نمی، بارش سے محفوظ اور اندرونی وبیرونی ماحول کے درمیان توازن برقرار رکھتا تھا۔ چنانچہ دہلی سلطنت میں کارا کا استعمال تقریباً تعمیراتی کاموں میں کیا جاتا تھا۔ مثلاً شاہی محلات، پختہ رہائش گاہ، قلعہ، مساجد، مقابر اور دیگر تعمیراتی کاموں جیسے مینار، محراب، گنبد اور محرابی دروازے وغیرہ کی تعمیر میں گارا کا استعمال عام تھا۔

محراب اور گنبد: گارا کے استعمال کی بدولت عمارتوں کی نہ صرف پختہ تعمیر کرنا آسان ہوا بلکہ اس کی بناوٹ، نقشہ اور زیبائش کا کام بھی آسان ہو گیا۔ عمارتوں کے اوپر گنبد اور محراب محرابی دروازے اور دیگر زیبائشی نقشے جونا کے گارہ سے تیار کیا جاتا تھا۔ پتھروں اور کنکروں کو

مضبوطی سے جڑے رکھنے یا اس طرح کی دیگر تعمیراتی مادوں کو جڑنے کے لیے گارہ انتہائی کار گر ذریعہ تھا۔ چنانچہ گارا کی ہی بدولت دہلی سلطنت میں صحیح محراب اور گنبد کی تعمیر ممکن ہوئی۔ محراب کی تعمیر مؤرخین کے درمیان بحث کا موضوع ہے۔ آیا یہ قیام دہلی سلطنت سے پہلے ہندوستان میں مروج تھا یا نہیں۔ کوشانہ عہد کے ایک آثار قدیمہ میں ایک ایسی مثال الٰہ آباد کے قریب واقع کوشامبی سے دریافت ہوئی ہے جو محرابی شکل کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قابل قیام دہلی سلطنت محراب ہندوستان میں موجود تھا اس کی وضاحت اس طور پر کیا گیا ہے کہ کوشانہ مشرقی وسطی سے آئے تھے۔ محراب اسلامی فن تعمیر کا ایک اہم حصہ تھا جو عام طور پر مسجد میں نیم دائرہ یا کمان کی شکل کا طاق نما بنایا جاتا ہے جو نمازیوں کے لیے قبلہ رخ (مکہ کی طرف) اشارہ کرتا ہے۔ محراب کا تعمیر کرنے کا بنیادی مقصد نماز کے لیے قبلہ رخ کی نشاندہی کرنا ہے تاکہ نمازی صحیح رخ پر نماز ادا کر سکیں۔ چنانچہ محراب ہر مسجد میں بنایا جاتا تھا۔ محرولی میں قطب احاطہ میں موجود قبۃ الاسلام مسجد، جامع مسجد، اور علاقائی دروازہ میں محراب کی مثالی دیکھی جاسکتی ہے۔ گنبد اسلامی فن تعمیر کا ایک اہم عنصر ہے جو عموماً مسجدوں، مقبروں اور دیگر اہم عمارتوں کے اوپر چھت پر نیم کرہ کی شکل میں تعمیر کی جاتی تھی۔ گنبد عمارت کی چھت کو مضبوط، پائیدار اور اس کی خوبصورتی کو دوبالا کرتا تھا۔ دہلی سلطنت میں گنبد تعمیر کرنے کا رجحان بہت عام تھا۔ چنانچہ قبۃ الاسلام مسجد، مقبرہ التمش میں گنبد کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ علی کوفی کے مطابق عظیم شہر میں عالی شان محلات، خوبصورت باغات اور فوارے شہنشاہی عروج کے نشانات ہوتے ہیں۔ چودھویں صدی کے مشہور عرب مورخ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ استحکام بادشاہت کے لیے شہروں اور عمارتوں کی منصوبہ بند تعمیر ضروری ہے کیونکہ یہ کسی بھی پائیدار حکومت کی شان و شوکت کو بیان کرتی ہے۔ دہلی میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد شہری کاری اور تکنیک میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ ڈی ڈی کوشامبی لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں جدید تکنیک کے اختیار کرنے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ دہلی سلطنت کے قیام کے بعد ختم ہو گئیں۔

محمد حبیب لکھتے ہیں کہ دہلی سلطنت کے قیام کے بعد 'شہری اور دیہی انقلاب' کا آغاز ہو گیا۔ کے۔ ایم۔ اشرف لکھتے ہیں کہ عمارتوں، مسجدوں، مقبروں اور باغوں کی تعمیر قیام دہلی کی سلطنت کے بعد بڑے پیمانے پر شروع ہوئی۔ قیام دہلی سلطنت کئی بعد جدید شہروں کی تعمیر وتوسیع کے ساتھ کاریگروں، فنکاروں، صنعت کاروں، تاجروں، معماروں اور مزدوروں کی شہروں کی طرف بڑے پیمانے پر منتقل ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔ دہلی سلطنت میں تکنیک کا استعمال بڑے پیمانے پر شروع ہوا۔ جدید تکنیک کے استعمال سے نہ صرف یہاں کی معیشت کو ترقی ملی بلکہ تعمیراتی کاموں میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ دہلی سلطنت میں جدید تکنیک کے اختیار سے یہاں پہلے سے موجود قدامت پسند روایت یعنی ذات پات پر مبنی کاروبار اور پیشے کی جگہ مہارت اور اہلیت پر مبنی دست کاری اور پیشے کو فروغ ملا۔ پروفیسر عرفان حبیب نے تین طرح کے بڑی تبدیلیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے مطابق شہر کاری اور شہروں میں وسعت، دست کاری اور مصنوعات میں اضافہ اور تجارت ومعیشت میں ترقی حاصل ہوئی۔

6.2.6 عسکری تکنیک (Military Technology)

دہلی سلطنت کے دور میں عسکری تکنیک میں قابل ذکر ترقی ہوئی جو کہ ترک حکمرانوں کی فوجی طاقت اور جنگی مہمات سے وابستہ حکمت عملی کا اہم حصہ تھا۔ اس دور میں مختلف قسم کے ہتھیار، دفاعی آلات اور طریقے ہندوستان میں متعارف ہوئے۔ مثال کے طور پر ترکوں

نے ہندوستان میں اصلحہ سازی سے متعلق جدید تکنیک اور طریقے کو رواج بخشا۔ ہتھیاروں میں تلوار، خنجر، برچھی، نیزہ، تیر، کمان، گولہ باری ،توپ اور دفاعی آلات میں زرہ کمبتر، ڈھال، خندق، قلعہ اور جنگی حکمت عملی کے طور پر گھوڑ سوار دستے، پیادہ فوج، مضبوط اور قلعہ سبز دیواروں کو توڈنے کے لیے جدید طریقے اور آلات، نہروں اور پر خطر راستوں کے طے کرنے کے لیے راست اور ریل کی تعمیر خاطر جدید آلات اور طریقے اختیار کئے گئے۔

ہم یہاں عسکری تکنیک سے متعلق رکاب، نعل اور بارود کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ان سے وابستہ تکنیک ز کے مطالعہ سے دہلی سلطنت میں تکنیک کی ترقی کا اندازہ ہو جائے گا۔لوہے سے بار کاب ہندوستان میں دہلی سلطنت سے قبل غیر معروف تھا۔ ہمیں تاریخی مصادر یا آثار قدیمہ حتیٰ کہ سنسکرت میں رکاب کے لیے کوئی اصطلاح بھی موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے پہلے رکاب سے ہندوستانی ناآشنا تھے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آہنی رکاب ہندوستان میں سلاطین دہلی کے ذریعہ متعارف ہوا۔تاریخی لحاظ سے سب سے پہلے یہ چھٹی صدی عیسویں میں چین میں شروع ہوا۔اسلامی ممالک اور ایران نے رکاب کا علم چین سے حاصل کیا اور اس کا استعمال جنگی مہم کے لیے گھوڑ سواری میں کیا۔ ترک، جنگ میں آہنی رکاب سے لیس گھوڑوں کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے۔ جنگوں میں گھوڑوں کے استعمال کو تین مراحل میں تقسیم کرکے بیان کیا جاتا ہے۔پہلا مرحلہ میں گھوڑا گاڑی کے ساتھ گھوڑے کا استعمال کیا جاتا تھا۔دوسرا مرحلہ میں گھوڑ سواری کے طور پر کیا جاتا تھا جس میں جنگجو اپنے گھٹنہ کی بدولت دوڑتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھ اور گھوم کر حملہ کرتا تھا۔ تیسرا مرحلہ میں آہنی رکاب سے لیس کرکے گھوڑوں کا جنگوں میں استعمال شروع ہوا۔رکاب کے استعمال سے دوڑتے ہوئے گھوڑ کی پشت پر بیٹھ یا رکاب پر پیر رکھ کر تیزی سے گھوم کر تیار یا تلوار چلانا بہت آسان ہو گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں جنگی مہم میں کامیابیاں حاصل ہونے لگے اور اس طرح فتوحات پر فتوحات حاصل کرنے لگے۔اس طرح رکاب فوجی تکنیک کا ایک اہم حصہ بن گیا۔

رکاب سے پہلے زین کا استعمال ہوتا تھا لیکن زین اتنا زیادہ معاون نہیں تھا چونکہ دوڑتے گھوڑے کی پشت سے زین کی بدولت ہاتھوں سے فری ہو کر تلوار زنی یا تیر اندازی مشکل امر تھا۔ چنانچہ گھوڑ سوا جنگوں کے لیے میدان جنگ میں مقابلہ کے دوران زین اتنا معاون نہیں تھا جتنا کہ رکاب ثابت ہوا۔ رکاب گھوڑ سوار جنگجو کو اس قابل کر دیا کہ گھوڑ سوار کی پشت پر بیٹھ یا کھڑے ہو کر آسانی سے دونوں ہاتھوں سے حملہ کر سکتا تھا۔اسی طرح وہ ہر طرف حرکت کرکے مضبوطی کے ساتھ حملہ کر سکتا تھا۔اسی طرح نعل فوجی تکنیک کی دوسری اہم اختراع تھی۔ مؤرخین نے نعل کے استعمال کو ترکوں کی فوجی کامیابی اور فتوحات کا ایک ذریعہ بیان کیا ہے۔ہندوستان میں ترکوں کی کامیابی کے پس پشت رکاب اور نعل اور بارود کا استعمال ایک بڑا سبب تھا۔ہندوستان میں گھوڑے بیرون ملک سے درآمد ہوتے تھے۔ قدیم ہندوستان میں گھوڑوں کی پرورش کا ثبوت نادار دہے۔اسی طرح سنسکرت میں نعل یا نعل بندی کے لیے کوئی اصطلاح نہیں ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعل اور نعل بندی کی تکنیک ترکوں کے ذریعہ ہندوستان میں متعارف ہوئی۔ چنانچہ نعل بندی کا پیشہ عہد وسطیٰ میں اکثر و بیشتر مسلم کرتے تھے۔ نعل بندی میں گھوڑے کے کھر کے نچلے حصہ میں نعل نما لوہا پیوست کر دیا جاتا تھا جس سے گھوڑے اس قابل ہو جاتے تھے کہ خاردار اور مشکل راہوں/راستوں جیسے پتھری، پہاڑی علاقوں میں بھی تیزی سے چل اور دوڑ سکتے تھے۔

بارود اور آتش اسلحہ: بارود اور آتشی اسلحے کا استعمال ہندوستان میں کب شروع ہوا؟ یہ مسئلہ مؤرخین کے مابین مختلف فیہ رہا ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں ترکوں کے حملے سے پہلے بھی بارود کا استعمال ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی تحقیق میں ثبوت کے طور پر سنسکرت کے ایک لفظ "سوکرانی" کو پیش کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بارود ہندوستان میں متعارف تھا۔ تاہم اکثر مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آتشی اسلحہ کا استعمال ہندوستان میں پہلی بار ترکوں نے کیا تھا۔ ان سے پہلے اس کے استعمال کے ثبوت نادار د ہیں۔ بارود، شورہ، سلفر اور چارکول سے تیار ہوتا تھا جس کا آغاز پہلی بار چین میں ہوا تھا۔ بعد میں مسلمانوں نے چین سے بارود کے بارے میں علم حاصل کیا اور ترکوں نے 13 ویں اور 14 ویں صدی میں ہندوستان میں بارود کو متعارف کیا۔ فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں آتشبازی کی جاتی تھی۔ 15 ویں صدی عیسوی میں باضابطہ طور پر بارود کا استعمال گجرات، مالوہ، اور دکن میں ہوا تھا۔ 1498 میں پرتگالیوں نے باضابطہ طور پر مسلسل بارود کا استعمال کالیکٹ میں کیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں بابر نے 16 ویں صدی نصف اول کے اوائل میں بارود کا استعمال جنگ میں کیا تھا۔

6.3 تکنیک اور آلات پر مالکانہ حیثیت (The Ownership of Techniques and Equipment)

اس ضمن میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ مصنوعات، تعمیرات اور ٹکسٹائل میں استعمال ہونے والے آلات اور سامانوں کے مالک کاریگر یا تاجر ہوتے تھے؟ کیا یہ اپنے سامان آزادانہ خرید یا فروخت کر سکتے تھے؟ اپنی مرضی سے مصنوعات تیار کر سکتے تھے؟ یا کاریگروں اور مزدوروں کو تاجر آلات اور خام مال مہیا کرا کر اپنے حساب سے بازاری ضرورتوں کے لحاظ سے مصنوعات تیار کراتے تھے، مزدور اور کاریگر محتانہ عوض پر کام کرتے تھے؟ محتانہ لے کر مصنوعات تاجروں یا مالکوں کے حوالے کر دیتے تھے؟ ہم عصری مصادر میں مذکورہ پہلوؤں کے بارے میں تفصیلات درج نہیں ہیں تاہم آلات کے بارے میں کافی اہم معلومات دستیاب ہیں۔ اس دور میں آلات عموماً لکڑیوں اور دھاتوں سے بنے ہوتے تھے۔ تاہم دھاتوں کے آلات کم تھے۔ آلات سہل الاستعمال اور قیمت بھی کم تھی جو آسانی سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ اس لیے کاریگر اپنے آلات کے مالک ہوتے تھے، انہیں تاجروں یا سوداگروں سے محنت کے عوض لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ مزدوروں کی نوعیت الگ تھی۔ سوگران سوت کاٹتے، کپڑے تیار کرنے، پھیری یا سامانوں کی حمل و نقل جیسے کام مزدوروں سے لیا کرتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتوں سے بھی مزدوری کراتے تھے۔ خیر المجالس کے مصنف لکھتے ہیں کہ دھاگے بننے، سوت کاٹنے وغیرہ کا کام عام طور پر خواتین اپنے گھروں میں رہ کر کرتی تھیں۔ فروخت کرنے کے لیے کپڑوں کے کاریگر اپنے گھروں میں اپنے لوم سے تیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ مطالبہ کے مطابق مزدوری پر بھی کپڑے تیاری کرتے تھے۔ لیکن اگر قیمتیں دھاگے/سوت جیسے سونے، چاندی، ریشم یا کوئی آسائش سامان تیار کرنا ہو تو کارخانوں میں جا کر کسی مقررہ نگران کے زیر نگرانی بھی کام کرتے تھے۔ تاجروں یا سوداگروں کے اپنے نجی کارخانہ ہوتے تھے یا نہیں؟ اس بارے میں تحقیق کے لیے ہمارے پاس کوئی ذرائع معلومات نہیں ہے۔ اس لیے یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم ڈی ڈی کوشامبی نے لکھا ہے کہ کارخانے صرف سلاطین یا مالدار اشراف، کے ہوتے تھے۔ جہاں صرف ان کے استعمال کے لیے مصنوعات تیار ہوتی تھی۔ ان کارخانوں میں تجارت کی غرض سے سامان تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان کا بیان بہت حد تک درست ہے۔ چوں کہ بنیادی مصادر

میں اس طرح کے کارخانوں کا ذکر ملتا ہے لیکن نجی کارخانوں یا صنعت گاہوں کا ذکر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سالک الابصار میں بیان کیا گیا ہے کہ محمد تغلق کے قائم کردہ کارخانوں میں آرائش وزیبائش کے لیے قیمتی سامان اور ریشم سے عمدہ کپڑے تیار کرنے والے مزدوروں اور کاریگروں کی تعداد چار ہزار تھی۔ اسی طرح تحقیق کے مطابق فیروز شاہ تغلق کے کارخانہ میں کپڑے اور قالین بڑے پیمانے پر تیار کیے جاتے تھے۔

6.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

سلاطین دہلی نے جدید تکنیک اور جدید آلات کے اختراع اور استعمال دونوں پر کافی دلچسپی رکھتے تھے جس کے نتیجہ میں دہلی سلطنت کے دور میں مختلف قسم کے آلات اور متعدد طریقے کار کو فروغ ملا جو کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبے جیسے کہ سیاست معیشت اور تہذیب سے متعلق ہیں۔ مثلاً زراعتی تکنیک میں خاص طور پر ہل، پھال، آبپاشی، سینچائی اور بیج کی بوائی اور فصل کی کٹائی وغیرہ سے وابستہ تکنیک اور طریق قابل ذکر ہے جن سے نہ صرف زراعت وکاشت کاری میں آسانیاں پیدا ہوتیں بلکہ پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اسی طرح فوجی تکنیک میں رکاب، نعل اور بارود وغیرہ ناقابل انکار تکنیک ہے جن کی بدولت فوجی مہم اور جنگی فتوحات ممکن ہوا۔ فن تعمیر میں خاص طور پر گارا کے استعمال سے تعمیراتی امور میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ گارا کا عمارتوں کو خوبصورت اور مضبوط بنانے میں کلیدی کردار تھا۔ یونہی کاغذ سازی اور کتابوں کے جلد بندی نے علم وہنر کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس تکنیک نے مرسلاتی تعلقات کو بھی آسان بنایا۔ اس کے علاوہ اس تکنیک نے تاریخ کو تحریروں میں محفوظ کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا۔

6.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

تکنیک	زراعت	کاغذ
فن تعمیر	تعمیر	گنبد
گارا	ساقیہ	عسکری
بارود	نعل	

6.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

6.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. چرخہ کے سانچے کے دونوں طرف لکڑی کے کتنے تکلے (Spindle) لگے ہوتے تھے؟
2. چرخہ کا ذکر تاریخی مصادر میں سب سے پہلے کہاں ملتا ہے؟
3. عمدہ کپاس تیار کرنے کے لیے کن تین مختلف طریقہ کار اور تکنیک کا استعمال کیا جاتا تھا؟

4. فارسی میں ندافی کسے کہا جاتا تھا؟
5. بنکر کا کرگھا(Drawloom) جنوبی ہندوستان میں کب مستعمل تھا؟
6. سفید بنانے(Bleaching)اور رنگ ریزی دونوں میں کس چیز کا کثرت سے استعمال ہوتا تھا؟
7. کاغذ سازی کا عمل سب سے پہلے پہلی صدی عیسوی میں کس ملک نے شروع کیا؟
8. عربوں نے کس چیز سے کاغذ تیار کرنے کی تکنیک کا آغاز کیا؟
9. چینی سیاح ای چنگ ہندوستان سے سنسکرت زبان لکھ کر اپنے ملک کیوں نہیں لے جا سکا؟
10. چرخی کے ساتھ کس چیز کا استعمال ہوتا تھا؟

6.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1. رنگ ریزی اور طباعت
2. چرخے کا استعمال
3. دہلی سلطنت میں کاغذ اور جلد سازی تکنیک
4. عسکری تکنیک
5. تکنیک اور آلات پر مالکانہ حیثیت

6.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

6. دہلی سلطنت کے دور میں فن تعمیر میں جدید تکنیک سے بحث کیجئے۔
7. دہلی سلطنت میں تکنیکی نشوونما کا ایک تجزیاتی جائیزہ لیجیے۔
8. آبپاشی سے وابستہ تکنیک پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

6.4 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ahmed, Fouzia Farooq, *Muslim Rule in Medieval India*: *Power and Religion in the Delhi Sultanate*, Bloomsbury, New Delhi, 2022.
2. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
3. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
4. Habib, Irfan, *Economic History of India*, *AD 1206–1526*, Tulika Books, Delhi, 2016.
5. Kumar, Sunil, *The Emergence of the Delhi Sultanate*, *1192–1286*, Permanent Black,

Ranikhet, 2007.
6. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*: *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers, New Delhi,1995 (first pub. in 1983).
7. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That Was India*, part–II, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first pub. in 1987).
8. Raychaudhuri, Tapan and Irfan Habib, *The Cambridge Economic History of India*, *Vol. I*, Cambridge University Press, Delhi, 1982.
9. Shrimali, Krishna Mohan, *Land, Agriculture and Money in Central India and Beyond* (*c. 100 to c. 1300 A.D.*): *A Feudal Order Revisited*, Aakar, Delhi, 2024.
10. Sharma, R.S., *Indian Feudalism*, *c. AD 300–1200*, Macmillan, Delhi, 2013 (first pub. in 1965).

اکائی 7۔ تجارتی ساخت اور نظام زر

(Trade Structure, and Currency)

اکائی کے اجزاء

7.0	تمہید
7.1	مقاصد
7.2	پس منظر
7.3	تجارت
7.4	تاجروں کے اقسام
7.5	بری تجارت
7.6	بیرونی ملک بری اور بحری تجارت
7.7	نظام کرنسی
7.8	سامان تجارت
7.9	شہری ترقی
7.10	شہری ترقی کے عوامل واسباب
7.11	اکتسابی نتائج
7.12	کلیدی الفاظ
7.13	نمونہ امتحانی سوالات
7.14	تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید (Introduction)

شمالی ہندوستان میں غوری کے حملے اور دہلی میں ترک سلطنت کے قیام کے نتیجے میں ہندوستان کے سماج، مذہب، سیاست اور معیشت پر مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوئے۔ مذہب، سماج، سیاست اور معیشت سے متعلق ترکوں کے اپنے نظریے تھے۔ سیاست اور معیشت کو خاص طور پر اپنے نظریے اور مفاد کے مطابق منظم کرنے کی انہوں نے حتی المقدور کوششیں بھی کیں۔ لیکن ہندوستان میں پہلے سے موجود نظام سیاست یا نظام معیشت کو یکسر تبدیلی کر کے جدید نظام قائم کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ سلاطین دہلی نے قیام حکومت کے بعد سابقہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے ضرورت کے مطابق تبدیلی کے عمل کو اپنایا۔ تقریباً ہر سلطان نے اپنی حکومت اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر تبدیلیاں نافذ کرنے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ قیام سلطنت سے زوال سلطنت تک جاری رہا۔ ان تبدیلیوں اور تبدیلی سے متعلق اقدامات کے بارے میں مورخین کے خیالات مختلف ہیں۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت میں معاشی اور تجارتی ترقی اور ان سے وابستہ تبدیلیوں کا مطالعہ کریں گے۔
- سلاطین دہلی کے نظریہ معیشت اور تجارتی ترقی کے لیے ان کے ذریعے اٹھائے گئے اقدامات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- اس دور کے نظریۂ معیشت، تجارت کی نوعیت، تجارتی لین دین، بازاروں کی اہمیت، تاجروں کے اقسام و حیثیت، تجارتی تعلقات اور سامانِ تجارت اور مصنوعاتی پیداوار وغیرہ کے بارے میں واقف ہو سکیں گے۔
- اس کے علاوہ اس دور میں رونما ہونے والی اہم تبدیلیوں اور ان پر جدید مورخین کے خیالات سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

7.2 پس منظر (The Context)

ہندوستان کی تاریخ میں دہلی سلطنت کا قیام اور اس کے نتیجے میں ہونے والے اثرات مورخین کے لیے ایک اہم موضوع تحقیق رہا ہے۔ یونہی معیشت بھی ان کے مابین موضوع بحث رہا ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر للن جی گوپال لکھتے ہیں کہ مسلم حکومت کے قیام کے بعد ہندوستانیوں کا استحصال ایک منظم طریقہ سے شروع ہوا اور ان کا زبردست معاشی استحصال کیا گیا، جس کے نتیجے میں یہاں کی معیشت کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے پہلے یہاں لوگ معاشی طور پر ترقی پذیر تھے۔ انہوں نے اپنے اس بیان کے دلیل میں شمس سراج عفیفی کے بیان کا حوالہ دیا ہے جس میں عفیفی نے جاجنگر کی خوشحالی کی تعریف کی ہے۔ عفیف لکھتے ہیں کہ '(جاجنگر) میں اناج اور دولت، گھوڑے اور سونے کی بے تحاشہ فراوانی تھی۔ لوگوں کے پاس بے شمار سونے اور چاندی تھے۔ یہاں کی عورتیں زیور سے آراستہ ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ کسانوں کے مکانات صاف ستھرے اور فرش پر عمدہ چادریں ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں بھی دولتوں کی فراوانی ہے۔'

للن جی گوپال(Lallanji Gopal) کا خیال ہے کہ عفیف کا بیان ہندوستان کی معاشی خوشحالی اور لوگوں کی فارغ البالی پر روشنی ڈالتا ہے۔ درحقیقت عفیف نے مذکورہ بیان فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں درج کیا تھا۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ترکوں کی ہندوستان آنے سے پہلے یہاں کی معیشت ترقی پذیر تھی جو ترکوں کی وجہ سے ختم ہوگئی، درست نہیں۔ چونکہ عفیف کے بیان سے واضح نہیں کہ جاجنگر دہلی سلطنت کے قیام سے پہلے کے جاجنگر کی تعریف کی ہے۔ البتہ یہ امکان زیادہ قوی ہے کہ جاجنگر پہلے سے خوشحال تھا اور فیروز شاہ تغلق کے دور میں بھی اس کی خوشحالی قابل تعریف تھی۔ مطلب سابقہ معاشی خوشحالی اور فارغ البالی فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں بھی حسبِ روایت جاری تھی۔ قیام دہلی سلطنت سے یہاں کی معیشت کو نقصان نہیں پہنچا۔ کے ایس لال(K.S. Lal) نے جنگی مہموں اور جنگی حالات کو اپنے نظریہ کے ثبوت میں پیش کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف جان کو نقصان پہنچایا بلکہ مال یعنی معیشت کو تباہ کیا۔ یعنی سماج اور معیشت دونوں پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ درحقیقت کے ایس لال نے اپنے مطالعہ میں قیام دہلی سلطنت سے قبل کے جنگی حالات اور ان کے تباہ کن نتائج کو نظرانداز کرتے ہوئے مسلمانوں کے جنگ کا ذکر کیا ہے۔ مزید یہ کہ اپنے بیان میں حد درجہ مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔

مذکورہ دونوں مورخین کے خیالات استشراقی اور نوآبادی نظریہ سے متاثر ہیں، جن میں تاریخ کی صرف ایک پہلو یعنی منفی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ اسی طرح پروفیسر ڈی ڈی کوشامبی لکھتے ہیں کہ ''مسلم حملہ آوروں''، یعنی ترکوں کی ہندوستان پر حملے اور ان کی حکومت کے قیام سے ہندوستان کی معیشت میں تبدیلی اس طور پر آئی کہ یہاں پہلے سے موجود نظامِ جاگیرداری مزید مستحکم ہوگئی۔ کوشامبی کا تجزیہ دراصل چندہ ثبوتوں پر مبنی ہے۔ موصوف نے دیگر تبدیلیوں کو اپنے مطالعہ میں نظرانداز کیا ہے۔ ان کے برعکس پروفیسر محمد حبیب (Professor Muhammad Habib) لکھتے ہیں کہ دہلی سلطنت قائم ہونے کے بعد یہاں کی سیاست، سماج اور معیشت کو غیر معمولی ترقی ملی۔ ان کا خیال ہے کہ دہلی سلطنت میں شہروں کی تعداد میں اضافہ، روزگار کے مواقع مزید وسیع، زرعی پیداوار میں قابل قدر اضافہ، مصنوعات کی پیداوار میں بہتری آئی، اور منجملہ نظام معیشت مزید منظم اور مستحکم ہوئی۔ ان کے مطابق دہلی سلطنت میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئی جس کو 'شہری انقلاب' اور 'دیہی انقلاب' کہا جاسکتا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے اسی طرح ملتے جلتے خیال ہیں۔

محمد حبیب کے نظریہ پر تبصرہ کرتے ہوئے عرفان حبیب(Irfan Habib) لکھتے ہیں کہ دہلی سلطنت میں قابل قدر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ تاہم ان تبدیلیوں کو کسی بھی لحاظ سے انقلابی تبدیلی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کوئی انقلابی تبدیلی نہیں تھی۔ البتہ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس نے دیہی معیشت کو بلدیاتی معیشت سے منسلک کردیا۔ سیاسی قوت کو معاشی طاقت کے ساتھ جوڑ دیا۔ تاجر اور کاریگر بازار کی ضرورتوں کے لحاظ سے سامان تیار کرتے، وہ کسی خاص پروفیشن سے جکڑے ہوئے نہیں تھے، بلکہ ضرورت اور مطالبے کے حساب سے سامان تیار کرتے اور فروخت کرتے تھے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں مقامی اور خاندانی اصحابِ رسوخ کا سامانوں پر تسلط ہوتا تھا۔ یا سامانوں کی تیاری خاندانی نوعیت کی تھی۔ جس پر ذات پات کی زنجیریں لگی ہوئی تھیں۔ اس دور میں نقد کاروبار کو فروغ، شہروں کی تعداد میں اضافہ، جدید ٹکنالوجی نے ذات پات کی زنجیر کو توڑ کر سب کے لیے ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ ٹکنالوجی نے نہ صرف آسانیاں پیدا کی بلکہ مصنوعات کی کمی میں

بہتری، تعداد میں اضافہ اور پیداوار میں تیزی لایا۔ اس دور میں نقد کاروبار کو فروغ، شہروں کو وسعت، پیداوار کو منظم، بازاروں کو نظم و نسق کرنے میں سلاطین دہلی نے اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں فروغ ہونے والی اقتصادیات کو ''اقتصاد عہدِ وسطیٰ'' کا نام دیا جاسکتا ہے جو ایک پائیدار نظام تھا جس نے دہلی سلطنت کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عرفان حبیب مزید لکھتے ہیں کہ عہد سلطنت دہلی میں جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ کسی 'روادار پالیسی' کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ غلام گیری اور ان سے مزدوری کرانے کی وجہ سے ممکن ہوئیں تھیں۔

7.3 تجارت (Trade)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قیام دہلی سلطنت کے بعد 13 ویں اور 14 ویں صدی میں شہروں اور بازاروں کی توسیع اور ان کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب ان سے وابستہ بنیادی ضرورتوں سے متعلق سامانوں کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکتا تھا۔ مثال کے طور پر شہروں کی تعمیر اور بازاروں کی آبادکاری سے متعلق ضروری سامان جیسے ضروریاتِ زندگی سے فارغ آمدنی، مصنوعات کی تیاری کے لیے خام مال کی فراہمی، مزدوری کے لیے مزدوروں کا انتظام، مصنوعات کی تیاری اور ان کی حفاظت، حمل و نقل کے لیے محفوظ راستے وغیرہ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سلطان علاءالدین خلجی نے دیہی علاقوں سے صرف مالگذاری پر اکتفا کیا بلکہ بلدیاتی بازار (Urban Market) شہروں میں بازاروں کی مزید توسیع 'ضروری اشیاء کی وزن اور قیمت کا تعین' خرید و فروخت اور لین دین کو منظم کرنے کے لیے کئی اقدام کیا۔ برنی لکھتا ہے کہ سلطان علاءالدین نے اناج سے لے کر کپڑوں، غلاموں، جانوروں وغیرہ ہر چیز کی قیمت مقرر کرکے اس کو سختی سے نافذ کیا۔ نفاذ اور نگرانی کے لیے افسروں کی تقرری کی، مثلاً اس نے بازار کی نگرانی کے لیے شہنائے منڈی، بدعنوانی اور ناجائز کمائی پر قدغن لگانے کے لیے برید مقرر کیا، جس کے ذمہ معلومات حاصل کرکے سلطان کو آگاہ کرنا تھا۔ خفیہ معلومات کے لیے منہیان مقرر کیا۔ اگر دور حاضر کے تناظر میں بات کریں تو سلطان علاءالدین نے بازار سے متعلق کئی اہم ضابطہ بنائے:

1. ضابطہ نمبر 1: ضروریاتِ زندگی سے وابستہ اناج سے لے کر کپڑے اور غلام سے لے کر جانور ہر سامان کی قیمت مقرر کیا۔
2. ضابطہ نمبر 2: بازار کے نظم و نسق کو قائم رکھنے افسران، شہنائے منڈی اور منہیان مقرر کیا۔
3. ضابطہ نمبر 3: اصتقار پر پابندی۔
4. ضابطہ نمبر 4: سامانوں کی مسلسل سپلائی کو یقینی بنایا۔
5. ضابطہ نمبر 5: غیر قانونی طریقے سے ناجائز کمائی پر پابندی۔

پروفیسر کے ایم اشرف نے اپنی کتاب *Life and Conditions of the People Of Hindustan* میں ضروری اشیاء کی قیمت کی ایک فہرست درج کی۔ اس کے مطابق اشیاء کی قیمتیں مندرجہ ذیل تھیں:

نمبر شمار	سامان	علاءالدین	محمد تغلق	فیروز تغلق
1	گیہوں	7.5	12	8
2	جو	4	8	4

3	دھان	5	14	-
4	دال	5	-	4
5	سفید چینی	3	80	4
6	چینی	100	64	-
7	مٹن (بھیڑ، بکری، خصی)	60	64	120-140
8	گھی	1—12	-	-

مذکورہ جدول سے ایک طرف قیمتوں پر کنٹرول دوسری طرف اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ بازار میں تاجروں کو ان کے سامان کے نفع بخش قیمت مل رہی تھی اور بازار میں ضروری سامان دستیاب تھیں۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ سلطان نے تاجروں اور کسانوں کو مقررہ قیمتوں پر فروخت کرنے کے لیے ابھارا یا تو مجبور کیا تاکہ بازار میں ضروری سامان مناسب قیمت پر لوگوں کو دستیاب ہو سکے۔

اس کے علاوہ سلاطین نے دہلی اور بڑے شہروں جیسے لاہور، راجستھان وغیرہ میں اناج کے گودام تعمیر کرایا۔ تاجروں کے لیے قرض کا اہتمام کیا۔ تاجروں کو پیشگی رقوم دی جاتی تھی۔ تاکہ دوسری جگہوں سے سامان خرید کر دہلی کے بازار میں لے کر آئیں۔ مثال کے طور پر ملتانی تاجروں کو 20 لاکھ روپیہ پیشگی رقم دی گئی تھی تاکہ وہ کپڑے خرید کر بازاروں میں مہیا کرائیں۔ اس طرح سلاطین دہلی نے اشیاء کی فراہمی، قیمتیں تعین، راستوں کو حمل و نقل کے لیے محفوظ، بدعنوانی پر قدغن لگا کر بازاروں کو منظم کیا۔ اور ریاست اور رعایا دونوں کے مفاد کو یقینی بنایا۔ امیر خسرو لکھتے ہیں کہ یہ اقدامات سماجی فلاح و بہبود اور عوام کے حق میں اہم فیصلہ تھا۔ نصیر الدین چراغ بھی لکھتے ہیں کہ یہ اقدامات عوامی مفاد کو پیشِ نظر لیے گئے تھے۔ ان کے برخلاف ضیاء الدین برنی رقم طراز ہیں:

> ان اقدامات کا مقصد حسنِ اخلاق یا خلوص سے زیادہ معاشی اور سیاسی ضرورتیں تھیں۔ سلطان کثیر تعداد میں فوج تیار کرنا، پورے شہر دہلی کی قلعہ بند اور محفوظ محلات کی تعمیر کرانا چاہتا تھا۔ چونکہ منگولوں کے حملے کا خطرہ ہمیشہ سروں پر منڈلاتا رہتا تھا۔ چنانچہ مذکورہ مقاصد کے تحت سلطان نے یہ اقدامات کیے تھے کیونکہ کثیر تعداد میں فوج کی تعیناتی اسی وقت ممکن تھی جب شاہی خزانوں میں دولت و سرمایہ کی فراوانی ہو۔ لیکن اس وقت خزانوں میں اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ فوجوں کو معقول تنخواہ دی جاسکتی تھی۔ چنانچہ سلطان نے ضروری اشیاء کی قیمت مقرر کر دیا تاکہ فوج کو آسانی کے ساتھ کم قیمتوں پر ضروری سامان دستیاب ہو سکے۔

برنی کا بیان اس تناظر میں زیادہ مناسب اور معقول لگتا ہے۔ سلطان علاء الدین کے بعد کسی سلطان نے اس طرح کے اقدام کیا ہو، اس کی مثال کہیں تاریخ میں نہیں ملتی۔ یعنی کسی سلطان نے بازار میں قیمتوں پر کنٹرول کرنے یا مارکیٹ کنٹرول جیسی کوئی پالیسی نہیں بنائی۔ اس کی دو اہم وجہ بیان کی گئی ہے۔ اول وجہ: یہ نظام صرف اسی وقت ممکن تھا جب تک کم قیمتوں پر سامان دستیاب ہوں اور کم قیمتوں پر دستیابی اسی وقت ممکن ہے جب مالگذاری کی شرح کم ہو۔ دوم وجہ: اب منگولوں کے حملے کا خطرہ ختم ہو چکا تھا، جس کے لیے کثیر تعداد میں فوج کی ضرورت نہیں تھی۔

7.4 تاجروں کے اقسام (Types of Traders)

سلطان علاءالدین نقد کاروبار کو فروغ دینے کے لیے تاجروں اور کسانوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ نقد کاروبار کے تحت کسانوں کو نقد مالگذاری ادا کرنے پر مجبور کیا۔ اور زائد پیداوار کو فروخت کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح شہروں میں غلہ اور اناج کے بازاروں کو فروغ ملا جہاں سوداگر تجارت کے غرض سے مستقل آتے جاتے رہتے تھے۔ بازاروں کی ترقی میں ایک طرف نقد مالگذاری اور نقد کاروبار نے تو دوسری طرف تاجروں نے اہم کردار ادا کیا۔ دہلی سلطنت کے ہم عصر ماخذ میں ہمیں دو طرح کے سوداگروں/تاجروں کا ذکر کثیر سے ملتا ہے (1) کاروانی یا نایک اور (2) ملتانی۔ ان کے علاوہ ایک (3) تیسرا گروہ صراف اور دلال تھے۔

کاروانی: برنی کے مطابق وہ تجارت جو اناج جیسے اشیاء کا کاروبار کرتے تھے، انہیں 'کاروانی' کہا جاتا تھا۔ نصیرالدین چراغ دہلوی نے انہیں نایک کے نام سے ذکر کیا ہے۔ چراغ دہلوی نے تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نایک دور دراز علاقوں سے اناج جمع کر کے دس سے بیس ہزار بیل گاڑیوں میں بھر کر دہلی لاتے تھے۔ سارے سوداگر گروہ بنا کر سفر کرتے تھے۔ اس لیے انہیں 'کاروانی' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ پہلے نایک یا کاروانی لفظ کا استعمال ہوا تھا۔ تاہم مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے کاروانی کہا گیا ہو اور بعد میں نایک کا بھی استعمال کیا جانے لگا ہو۔ چونکہ مغل دور میں نایک کا استعمال مذکورہ سیاق میں زیادہ ملتا ہے۔

ملتانی: سوداگروں کا دوسرا اہم گروہ 'ملتانی' تھا۔ ان کے بارے میں ضیاءالدین برنی لکھتے ہیں کہ دور افتادہ تجارت ان کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تجارت کے علاوہ سود اور بیاض جیسے کاروبار بھی کرتے تھے۔ یہ اتنے مالدار تھے کہ ضرورت پر امراء و شرفاء ان سے قرض لیا کرتے تھے۔ برنی نے ان کے مذہب کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ برنی کے مطابق ملتانیوں اور سپاہیوں میں زیادہ تر کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ ان دو مشہور سوداگر گروہ کے علاوہ دوسرے تاجر بھی تھے جو تجارتی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ اس دور میں ہمیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ تصوف سے گہرا تعلق رکھنے والے صوفی بھی تجارت کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر بہار میں ایک صوفی غلاموں کی تجارت کے لیے مشہور تھے۔ اس طرح کئی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ بعض صوفی مشرق وسطیٰ سے بحیثیت صوفی دہلی آئے اور یہاں تجارت شروع کر دی۔

صراف اور دلال: ایک دوسرا گروہ جو تجارتی سرگرمیوں میں کافی مصروف تھا۔ انہیں دلال (Broker) کہا جاتا تھا۔ دلال خریدار اور فروخت کنندہ کے مابین رابطہ کا کام کرتے تھے۔ اور دونوں سے منافع حاصل کرتے تھے۔ انہیں بازار کی حالت، سامان تجارت کی قیمت اور دستیابی کا درست علم ہوتا تھا۔ برنی نے انہیں 'حکیم بازار' کے لقب سے بیان کیا ہے۔ یہ بازار اور سامانِ تجارت کی قیمتوں کو بھی بہت متاثر کرتے تھے۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ سلطان علاءالدین خلجی مصنوعات کی قیمت مقرر کرنے سے پہلے ان سے رجوع کرتا تھا۔ لیکن ان کے خلاف شکایت موصول ہونے پر سختی سے پیش آتا تھا۔ برنی نے ان کے سربراہ کا ذکر 'ماہرین دلال' کے طور پر کیا ہے۔ برنی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت میں دلالوں کا گروہ ہوتا تھا اور ان کا ایک سربراہ بھی ہوتا تھا۔

علاءالدین خلجی نے ان کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور کسی جرم کے ثابت ہونے پر سخت سزائیں دیتا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت میں دلالوں کی حیثیت دوبارہ بحال ہوگئی تھی۔ اس دور میں انہیں باضابطہ طور پر دلالی کی لائسنسیس (اجازت نامہ) دی جاتی تھی جو ''دلالتِ بازار'' کہلاتا تھا۔ دلالت بازار کے رو سے دلال کو حق حاصل تھا کہ اگر کوئی خرید و فروخت کا معاملہ اس کی معرفت طے ہو اور پھر معاملہ پائے تکمیل کو کسی وجہ سے نہیں پہنچا، پھر بھی دلال سے کمیشن واپس نہیں لیا جاسکتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دہلی سلطنت میں دلالی ایک ادارہ کی حیثیت سے سرگرم تھی اور اس کی اہمیت لوگوں میں تسلیم شدہ تھی۔ تجارتی گروہوں میں ایک اہم گروہ صرافوں کا تھا۔ تجارت کے فروغ میں ان کا اہم کردار تھا۔ صراف بنیادی طور پر تبادلہ کرنسی (Money Changing) کا کام کرتے تھے۔ یہ کرنسی، سکہ اور سکہ سازی میں استعمال ہونے والے دھاتوں (سونے، چاندی، پیتل) کی بہتر سمجھ رکھتے تھے، نیز انہیں کرنسی کی قدر و قیمت کا گہرا علم ہوتا تھا۔ صراف دہلی سلطنت میں ایک بینکر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہ کرنسی اپنے پاس رکھ کر اس کے عوض اسی کرنسی کی قدر و قیمت کی ایک ہنڈی جاری کرتے تھے جس کو حسبِ ضرورت کریڈٹ یعنی نقد رقم میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ ہنڈی کو دورِ حاضر میں چیک کی مثال سے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ جس طرح موجودہ قیمت میں نقد رقم کے بجائے چیک دیا جاتا ہے اور پھر اس چیک کو کبھی بھی بینک میں جمع کر کے اس کے عوض چیک میں درج رقم نقد میں حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دہلی سلطنت میں ایک صراف مطلوبہ رقم کی ہنڈی جاری کرتا تھا جس کو دوسرے صراف کے پاس جمع کر کے ان سے نقد رقم حاصل کیا جاسکتا تھا۔ جب دہلی سلطنت میں کاغذ سازی کا آغاز ہوگیا۔ ہنڈی کو اس کا مالک کہیں بغیر کسی خوف لے جاسکتا تھا۔ اس میں چوری یا ڈکیتی/لوٹ جانے کا خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ ہنڈی میں درج رقم صرف ہنڈی کا اصل مالک ہی نقد کرا سکتا تھا۔ ہنڈی جاری کرنے والا صراف ہنڈی جاری کرنے کا کمیشن مقرر مقدار میں حاصل کرتا تھا۔ دہلی سلطنت میں ہنڈی کی قسموں کی تعداد سے متعلق تفصیلات کم ملتی ہیں۔ البتہ مغل دور میں تین طرح کی ہنڈی ہوا کرتی تھی۔ فروخمی ہنڈی، مدتی ہنڈی۔

7.5 بری تجارت (The Inland Trade)

قیام دہلی سلطنت سے پہلے سے ہندوستان میں بری اور بحری دونوں طرح کی تجارت کا رواج تھا۔ دہلی سلطنت میں بری تجارت کو دو طریقے سے ترقی ملی۔ یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ دو جہتوں میں اس کا دائرہ کار وسیع ہوا۔

- نزدیکی تجارت (بین دیہات اور قصبات)
- دور افتادہ تجارت (بین قصبات اور بلدان)

نزدیکی تجارت (Short Distance) یعنی کم دوری والی تجارت کا دائرہ عمل قصبات اور دیہاتوں تک محدود تھا۔ نزدیکی تجارت قصبوں اور دیہاتوں کے مابین ہوتی تھی۔ دور افتادہ تجارت میں قصبات اور شہروں یا ملک اور بیرون ملک کے مابین تجارت ہوتی تھی۔ مذکورہ دونوں طرح کی تجارتی کو ترقی نقد مالگذاری اور نقد کاروبار کے نتیجے میں ہوئی۔ ایک طرف خام مال اور اناجوں کی حصولیابی کے لیے

شہروں کا انحصار ارد گرد کے گاؤں اور قصبوں پر ہوتا تھا، تو دوسری طرف نقد روپیوں اور سامانوں کو فروخت کرنے کے لیے گاؤں کا انحصار شہروں پر ہوتا تھا۔ شہروں میں اپنے پیدا کردہ اناج فروخت کر کے نقد حاصل کرنے اور پھر اسی سے نقد مالگزاری بھی ادا کرتے تھے۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے شہروں کا مکمل انحصار گاؤں پر ہوتا تھا جبکہ گاؤں کا انحصار شہروں پر اس حد تک نہیں تھا۔ گاؤں اپنی ضروریات کے سارے سامان خود پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ شہروں کی ضرورتیں گاؤں سے مستقل پوری ہوتی تھی، اور اسی وجہ سے سلاطین دہلی نے نقد مالگذاری پر زور دیا تھا۔ اس طرح اشیاء کا اخراج گاؤں سے شہروں کی طرف یک طرفہ تھا۔ فطری طور پر اشیاء کا یک طرفہ اخراج دیہی تجارت کو زبردست نقصان اور شہری/بلدیاتی تجارت اور تجارتی مراکز کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ اس طرح دیہی بازاروں کا زوال اور بلدیاتی تجارتی مراکز کی ترقی ہوئی۔ اس طریقہ تجارت میں اشیاء اور سامانوں کا لین دین بہت بڑے پیمانے پر ہوتا تھا، لیکن اس کی خاطر خواہ قیمت نہیں مل پاتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں اشیاء اور مصنوعات تعداد میں زیادہ تھیں لیکن قدر و قیمت میں کم تھی۔ ان اشیاء میں زیادہ تر اناج، گیہوں، چالول، دال، چینی وغیرہ اور خام مال میں خاص طور پر روئی ہوتی تھی۔

بین القصبات اور بین البلاد تجارت کے تحت عام طور پر آرام و آرائش سے متعلق سامان کی تجارت ہوتی تھی۔ اس میں مصنوعات/سامان تجارت تعداد میں کم لیکن قدر و قیمت میں زیادہ ہوتی تھی۔ ایک قصبہ میں تیار ہونے والی مصنوعات دوسرے قصبوں یا شہروں میں تجارت کی غرض سے منتقل ہوتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس ان قیمتوں میں سامان کے خریدار گاؤں میں نہیں ہوتے تھے۔ دہلی کے بازار کے بارے میں ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ 'تیار شدہ شراب، کول (علی گڑھ) اور میرٹھ سے، مسلن (عمدہ قسم کے کپڑے) دیوگری سے، اور پٹہ دار کپڑے لکھنوی (بنگال) سے دارالحکومت (دہلی) آتے تھے۔' ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ 'عام کپڑے اودھ سے اور اشیاء خورد و نوش میں پان مالوہ سے دہلی آتا تھا۔ شکر قند دہلی اور لاہور سے اور گھی سرسہ (ہریانہ) سے آتا تھا۔' اس طرح اندرون ملک کے ساتھ ساتھ دور افتادہ تجارت بیرون ملک بھی ہوتی تھی۔ دور افتادہ بری تجارت عام طور پر ملتان کے راستے ہوتی تھی۔ جب کہ دور افتادہ بحری تجارت بروج اور کھمبیات بندرگاہ سے ہوتی تھی۔

7.6 بیرونی ملک بری اور بحری تجارت (Foreign Inland and, Maritime Trade)

گجرات پر سلطان علاء الدین خلجی کی فتح کے بعد خلیج فارس اور بحر احمر کے راستے بحری تجارت کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ اور پھر بحری تجارت کو دہلی سلطنت میں فروغ ملا۔ چونکہ گجرات کے بندرگاہ خلیج فارس اور بحر احمر کے بندرگاہوں سے منسلک تھے۔ گجرات کے بندرگاہ سے چلنے یا آنے والی کشتیاں خلیج فارس کے دو بڑے اور اہم بندرگاہ بصرہ اور حرمز سے ہو کر گزرتی تھیں۔ اور بحر احمر کے عدن، الحا اور جدہ بندرگاہ سے ہو کر کشتیاں مراقش، حلب اور اسکندریہ روانہ ہوتی تھیں۔ حلب اور مراقش ایسے مقامات تھے جو بحر روم سے جوڑتے تھے۔ بحر روم یوروپ (مغربی ممالک) سے رابطہ ہموار کرتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کی بحری تجارت دہلی سلطنت میں یوروپی ممالک سے بھی ہوتی تھی۔

دہلی سلطنت میں بحری تجارت مشرقی ممالک یعنی انڈونیشیا سے بندرگاہ/ جزائر ملاک اور یمنان کے راستے ہوتی تھی۔ یوروپی سیاح ٹوم پیرس (Tome Pires) جو 16 ویں صدی عیسوی کی دہلی میں ہندوستان آیا تھا۔ بندرگاہ کھمبیات میں تجارتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ: ''کھمبیات کے دو بازو ہیں: ایک بازو عدن اور دوسرا بازو المخا سے جڑا ہوا ہے'' مطلب کھمبیات کا دو مختلف بندرگاہ، عدن اور المخا سے تجارتی تعلقات بحری راہوں سے ہوتی تھی۔ عدن بندرگاہ کی معرفت یوروپ اور آفریقہ، اور المخا کے توسط سے فارس اور عرب ممالک سے تجارت ہوتی تھی۔ ٹوم پیرس نے مزید لکھا ہے کہ المخا اور کھمبیات دونوں ایک دوسرے پر مکمل طور پر انحطاط تھا۔ ایک دوسرے سے منقطع ہو کر ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دونوں کا ایک دوسرے سے تجارتی تعلقات منقطع ہو جائے تو دونوں کی بقاء کو خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔ اطالوی سیاح ورتھیمان (Vertheman) جو 14 ویں صدی کی پہلی دہائی میں ہندوستان آیا تھا، لکھتا ہے کہ مختلف ممالک سے تقریباً 300 کشتیاں ہر سال کھمبیات آتی اور جاتی ہیں۔ سوداگروں پر روشنی ڈالتے ہوئے ورتھیمان نے لکھا ہے کہ دمن ڈیو میں تقریباً 400 ترکی رہتے تھے۔

ایک بیان کے مطابق فارس (ایران) سے ہر سال 10,000 گھوڑے اور معبار اور کھمبیات کی بندرگاہ پر درآمد ہوتے تھے۔ بروچ سے دریافت شدہ سکوں سے دہلی سلطنت میں بیرون ملک تجارت کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ برآمد سکوں کا تعلق دہلی سلطنت، مصر، شام، یمن، ایران، جنیوا، ارمینہ اور وینس وغیرہ سے ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گجرات اس دور میں عالمی بحری تجارت کا اہم مرکز تھا۔ تجارتی تعلقات ایران، عرب، آفریقہ اور یوروپ سے بھی تھا۔ گجرات سے خاص طور پر کھمبیات اور دوسرے علاقوں میں تیار شدہ رنگین کپڑے برآمد کیے جاتے تھے۔ اور ان کے بدلے بیرون ممالک سے مصالحے درآمد کیے جاتے تھے۔ اور یہ سلسلہ بحر ہند کے بحری راستوں پر پرتگال کی تسلط کے بعد بھی جاری تھا۔ اس کے علاوہ مشرقی ممالک سے بھی ہندوستان کی تجارتی تعلقات پائیدار تھی۔ بنگال کے بندرگاہ کے ذریعہ مشرقی علاقوں میں چین، ملاکا، اور مشرق بعید سے تجارتی کاروبار ہوتا تھا۔ بنگال کے بندرگاہ سے برآمد ہونے والی تجارتی اشیاء میں خاص طور پر کپڑا، ریشمی کپڑا اور چینی قابل ذکر ہیں۔ ورتھیمان نے ایسے 50 کشتیوں کا ذکر کیا ہے جو مذکورہ سامان تجارت بنگال کے بندرگاہ سے لے کر فارس اور دوسرے ممالک روانہ ہوتی تھیں۔ ان سامان کے عوض مختلف سامان درآمد کیے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ہرمز سے نمک اور صحرائے مالدیپ سے کوڑیاں درآمد کیا جاتا تھا۔ جس سے سکے تیار کیے جاتے تھے جو بنگال، اڑیسہ اور بہار میں مستعمل تھا۔

بحری تجارت کا ایک اہم مرکز سندھ تھا۔ یہاں کے بندرگاہ دیبول بحری تجارت کے نقطہ نظر سے کافی اہم تھا۔ اس بندرگاہ کا خلیج فارس سے ایک اچھا تجارتی رشتہ تھا۔ سندھ سے کپڑے اور دودھ سے تیار شدہ اشیاء خورد و نوش برآمد کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ سندھ کی مچھلیاں بھی برآمد کی جاتی تھیں۔ بحری تجارت کے سیاق میں ساحلی تجارت گاہوں کا ذکر ضروری ہے۔ سمندری علاقوں میں ساحلی مقامات پر تجارتی سرگرمیاں ایک فطری بات ہے۔ دہلی سلطنت میں سندھ، گجرات، بنگال، مالابار، کورمنڈل وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں تجارتی سرگرمیاں عام تھیں۔ اور آج بھی ان مقامات پر تجارت جاری ہے۔ ان علاقوں سے اندرون اور بیرون ملک دونوں طرح کی تجارتی ہوتی تھی۔ ساحلی مقامات کا ایک خاص فائدہ یہ تھا کہ یہ علاقائی بری تجارت کے لیے راہیں ہموار کرتے تھے۔ یہاں علاقائی سطح پر اشیاء اور مصنوعات کی

خرید و فروخت اور باہم تبادلہ ہوتا تھا۔ دہلی سلطنت میں بری تجارت کا جال پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ اندرون اور بیرون ملک دونوں طرح کی تجارت ہوتی تھی۔ بری تجارت کے نقطۂ نظر سے ملتان اپنے جغرافیائی محل وقوع کے سبب اہم ترین تجارتی مرکز تھا۔ ملتان کے راستے وسطی ایشیاء، مشرقی وسطیٰ، ایران (فارس)، افغانستان وغیرہ سے تجارت ہوتی تھی۔

7.7 نظام زر (The Currency System)

دہلی سلطنت کے قیام کے بعد بالخصوص 14ویں صدی میں زر پر مبنی معیشت کو ہندوستان میں خاطر خواہ ترقی ملی۔ زر پر مبنی معیشت سے مراد لین دین اور خرید و فروخت میں کرنسی کا استعمال ہے، جسے انگریزی زبان میں Money Economy یا معیشت زر کہتے ہیں۔ قیام دہلی سلطنت کے وقت ہندوستان میں زر پر مبنی معیشت کا رواج تقریباً مفقود تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ سکوں کا کم استعمال تھا۔ سونے اور چاندی کے سکوں کا استعمال محدود تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ غوریوں کو ان کے حملے میں تانبے کے سکوں کی کافی تعداد حاصل ہوئی تھی۔ جبکہ سونے اور چاندی کے سکے بہت ہی کم مقدار میں ہے۔ سلاطین دہلی نے زر پر مبنی معیشت کو فروغ دینے پر غیر معمولی توجہ دیا جس کے نتیجے میں نظام کرنسی کو ترقی ملی۔ سلاطین نے سونے، چاندی اور تانبے سے سکہ بڑے پیمانے پر تیار کرایا۔ سلطان التمش (1210-1236) نے سکوں کو معیاری بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ در حقیقت نظام کرنسی کو سلطان التمش ہی نے منظم کیا۔ اس نے الگ قدر و قیمت کا الگ الگ سکہ تیار کرایا۔ اسی نے سونے اور چاندی کا سکہ 'ٹنکا' اور تانبے کا سکہ ''جیتل'' شروع کیا۔ سونے اور چاندی کے سکوں کے مابین 1:10 کی شرح قائم کیا۔ سکوں کی چلن اور اس کی قدر و قیمت کے بارے میں معلومات کے لیے ہمارے پاس تحریری شواہد کے علاوہ آرکائیوز (محافظ خانہ) میں محفوظ سکوں سے ملتا ہے۔ نیز علم مسکوکات سے بھی اس بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ عام طور پر دہلی سلطنت میں تین قسم کی دھاتوں سے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ مثلاً سونا، چاندی اور تانبا۔ شمالی ہندوستان میں ان سکوں کے مابین درج ذیل توازن تھا۔

- چاندی کا ایک ٹنکہ 48 جیتل کے مساوی
- 48 جیتل 192 ڈنگ کے مساوی
- 192 ڈنگ 480 درم کے مساوی

ٹنکہ اور جیتل دو اہم سکے تھے جن کا استعمال لین دین میں کثرت سے ہوتا تھا۔ تاہم دوسرے سکے مثلاً ڈنگ اور درم بھی استعمال میں تھے، جیسا کہ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ مذکورہ دونوں سکے دار الحکومت دہلی میں مروّج تھے۔ دہلی سلطنت میں نقد کاروبار کے فروغ کے لیے سکہ سازی بھی بڑے پیمانے پر ہوئی تھی۔ سکہ سازی کے لیے ضروری دھات دوسرے علاقوں سے منگائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر سونا اور چاندی خاص طور پر بنگال سے منگایا جاتا تھا۔ شمالی ہندوستان اور دکن میں ذخیرہ اندوزی کے بعد یہ دونوں مقامات سونے اور چاندی کی حصولیابی کے دو اہم ذرائع بن گئے۔

دہلی سلطنت میں صرف حکومت کے جاری کردہ سکوں کا چلن نہیں تھا بلکہ بیرون ملک تاجروں کی معرفت آنے والے سکے (سونے اور چاندی۔ بُلین) بھی مستعمل تھے۔ علاءالدین خلجی کے دور حکومت تک بالعموم چاندی کے سکوں کا رواج نسبتاً زیادہ تھا۔ غیاث الدین تغلق کے دور میں چاندی کے سکوں کا چلن میں تنزلی شروع ہوگئی تھی اور اس کی جگہ سونا اور بُلین کا رواج شروع ہوگیا تھا۔ محمد تغلق کے دور میں سونے کے سکوں کا استعمال اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ چاندی کے سکوں کا استعمال ماند پڑ گیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں تو چاندی کے سکوں کا استعمال معدوم ہوگیا۔ لودھی حکومت (1526–1451) میں کالعدم تھا۔ سلطان التمش کے جاری کردہ کرنسی نظام/نظام زر میں ایک بڑی تبدیلی محمد تغلق کے دور میں آئی۔ محمد تغلق نے تانبے اور پیتل سے بنے سکہ جاری کیا اور اس کی قدر و قیمت ٹنکے کے مساوی رکھا۔ اس کرنسی (روپیے) اصل قیمت لاگت قیمت سے زیادہ تھی۔ مطلب دھات اور سکہ سازی دونوں میں جتنی صرفہ (Intrinsic Value) تھا، اس سے زیادہ اس کرنسی کی قیمت (Face Value) مقرر کردیا۔ چنانچہ لوگوں نے اس کمی کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے کرنسی ڈھالنا شروع کردیا، جس کے نتیجے میں نقلی کرنسی بازار میں بے تحاشہ ہوگئی اور نتیجتاً محمد تغلق کا یہ تجربہ ناکام ثابت ہوگیا۔ حالانکہ یہ کوئی پہلا تجربہ نہیں تھا بلکہ چین میں قبلائی خان (94-1260) نے پیپر کرنسی (کاغذ کے روپیے) کا تجربہ کرچکا تھا اور یہ کامیاب تجربہ تھا۔ فارس (ایران) میں کیکو خان (1293) نے ٹوکس کرنسی شروع کیا تھا، لیکن وہ بھی ناکام ثابت ہوگیا۔ تاہم محمد تغلق کا تجربہ ناکام ہوگیا چونکہ وہ نقلی روپیوں پر پابندی لگانے میں کامیاب نہیں ہوپایا۔ محمد تغلق کا یہ اقدام انتہائی ترقی پسندی پر مبنی تھا۔ اس کے ناکام ہونے کے چند اہم وجوہ تھے، مثلاً

- لاگت سے زیادہ کرنسی کی قیمت۔
- علامتی سکے بنانا لوگوں کے لیے بہت آسان تھا۔

برنی مبالغہ آرائی اور تعصب پرستی سے بیان کرتا ہے کہ ہندو کا گھر ایک طرح سے کرنسی سازی کا مرکز بن گیا تھا۔ تاہم اس کا بیان اس چیز کو واضح کرنے میں صحیح ہے کہ نقلی کرنسی بڑے پیمانے پر تیار کیا جارہا تھا اور سلطان اس پر قدغن لگانے سے قاصر رہا۔ محمد تغلق کو جلد ہی اس بات کا ادراک ہوگیا کہ علامتی سکے امید کے برخلاف نقصان دہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس نے شاہی خزانے میں تمام علامتی سکوں کو جمع کرنے اور پھر ان سکوں کو شاہی خزانے سے اصلی سکوں سے تبدیلی کا حکم دیا۔

7.8 سامان تجارت (Trade Goods)

دہلی سلطنت میں حسبِ معمول دو طرفہ تجارت ہوتی تھی۔ یعنی بعض سامان ہندوستان سے بیرون ممالک برآمد کیے جاتے تھے۔ اور اسی طرح بعض سامان بیرون ممالک سے ہندوستان درآمد کیے جاتے تھے۔ اس طرح دہلی سلطنت میں ملکی و غیر ملکی دونوں طرح کے سامانوں کی تجارت ہوتی تھی۔ بیرون ملک سے جو اشیاء و تجارت اس دور میں ہندوستان درآمد ہوتے تھے۔ ان میں دو سامان (i) گھوڑے اور (ii) قیمتی دھات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

1. ہندوستان میں اعلیٰ نسل کے گھوڑے نہیں پائے جاتے تھے۔ اور جنگ میں اعلیٰ نسل کی گھوڑوں کی سخت ضرورت ہوتی تھی، چونکہ فوجی

نقطہ نظر سے یہ گھوڑے غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے۔اس لیے عرب اور مشرقی وسطیٰ سے اعلیٰ نسل کے گھوڑے بڑے پیمانے پر درآمد کیے جاتے تھے۔یہ گھوڑے عام طور پر بندرگاہ یمن، قص، حرمز، عدن اور خلیج فارس کے راستے ہندوستان درآمد ہوتے تھے۔

2. قیمتی دھاتوں میں سونا اور بالخصوص چاندی قابل ذکر ہیں۔ہندوستان میں سونے اور چاندی کے کان نہیں تھے،اس لیے ہندوستان میں اس ان قیمتی دھاتوں کا مطالبہ/ضرورت زیادہ تھی۔ان کا استعمال سکہ سازی کے علاوہ آرائش وزیبائش کے لیے بھی ہوتا تھا۔

کم خواب، ریشم اور ریشمی سامان اسکندریہ، عراق اور چین سے ہندوستان درآمد ہوتے تھے۔بہت سے آسائش سامان یوروپ سے آتا تھا۔ان دنوں گجرات قیمتی سامانوں کی درآمد گی کا اہم مرکز تھا۔گجرات سے ہی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں ارسال کیا جاتا تھا۔دہلی سلطنت میں ہندوستان خاص طور پر اناج اور کپڑے بیرون ملک برآمد کیے جاتے تھے۔ہندوستان سے یہ سامان تجارت کئی ملکوں میں جاتا تھا۔ لیکن فارس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔اناج سب سے زیادہ ہندوستان سے فارس جاتا تھا۔فارس کا ہندوستانی اناج پر حد درجہ انحصار تھا۔اناج کے علاوہ ہندوستان سے نیل بھی کافی مقدار میں فارس بھیجا جاتا تھا۔ہندوستان سے برآمد ہونے والے تجارتی سامانوں میں غلاموں کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ہندوستان سے غلام خاص طور پر وسطی ایشیاء بھیجے جاتے تھے۔مذکورہ سامان تجارت کے علاوہ دیگر سامان جیسے قیمتی پتھر، ہاتھی، ڈنٹ کے مصنوعات، کپاس، مسالے، لوہا، فولاد، کیمیاوی مادے وغیرہ ہندوستان سے بیرون ملک برآمد کیے جاتے تھے۔

7.9 شہری ترقی (Urban development)

دستیاب تاریخی شواہد کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غوری کے فتوحات کے وقت ہندوستان میں شہری معیشت کی حالت خستہ اور شہری آبادکاری کا عمل محدود تھا۔ڈی ڈی کشامبی کے مطابق دارالحکومت دہلی کی حیثیت ایک خیمہ بند شہر سے زیادہ نہیں تھی۔حکمران اپنے افواج کے ساتھ مستقل منتقل ہوتے رہتے تھے۔چھوٹے سرداران گاؤں میں رہتے تھے۔آر ایس شرما لکھتے ہیں کہ اس دور میں قدیم شہر زوال پذیر تھے اور جدید شہر آباد نہیں ہو رہے تھے اور بہت سے موجودہ شہروں میں کوئی وسعت بھی نہیں ہو رہی تھی۔دہلی سلطنت کے قیام سے پہلے سونے اور چاندی کے کرنسی کا عدم رواج اور غیر ملکی سکوں کی عدم دستیابی سے نہ صرف ہمیں تجارتی زوال کو اجاگر کرتی ہے بلکہ شہری زوال کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔لیکن قیام دہلی کے بعد حالات میں تیزی سے تبدیلی آئی۔علم آثارِ قدیمہ، علم مسکوکات اور کتب تواریخ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دہلی سلطنت کے قائم ہونے کے بعد بازاروں کی تعداد میں اضافہ، شہری ترقی، شہروں کی تعداد اور وسعت دونوں میں سرعت آئی۔جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان تبدیلیوں کو محمد حبیب نے ''شہری انقلاب'' سے تشبیہہ دیا ہے۔اس دور میں شہری ترقی مختلف عوامل اور حکومتی پالیسیوں کے سبب ممکن ہوئی۔

لیکن ان عوامل واسباب پر تفصیلی بحث سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ شہر اور شہری ترقی سے کیا مراد ہے؟عام طور پر شہر کی تعریف میں دو عناصر-آبادی اور ذرائع معاش کو بیان کیا گیا ہے۔شہر سے مراد آبادی کا ایسا علاقہ جہاں پانچ ہزار یا اس سے زیادہ کی آبادی ہو اور پچھیتر فیصد یا اس سے زیادہ لوگوں کا ذرائع معاش غیر زرعی ہو۔عہدِ وسطیٰ خاص کر دور دہلی سلطنت کے شہروں کی یہی دو خصوصیات بیان کیے گئے ہیں۔

شہر کی مذکورہ تعریف کا اطلاق دہلی سلطنت میں شہروں کے مطالعہ میں کئی مسئلے درپیش ہیں کہ کتب تواریخ میں شہروں کی کل آبادی کی اعداد و شمار موجود نہیں ہے۔ اس دور کے شہروں میں آباد لوگوں کی مقررہ تعداد معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی پختہ ذریعہ نہیں ہے، تاہم یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس دور میں ایک شہر کی آبادی پانچ ہزار سے زیادہ رہی ہوگی۔ یونہی شہروں میں آباد لوگوں میں اکثر و بیشتر کا ذریعہ معاش غیر زرعی تھا۔ ضیاءالدین برنی کے مطابق ''مسطح ریاستوں (یعنی عرب و فارس) میں کوئی بھی شہر دہلی سے زیادہ بڑا نہیں ہے اور یہاں کی آبادی بھی ان ریاستوں سے زیادہ ہے'' برنی مزید لکھتا ہے کہ ''یہاں کی آبادی بہت تھی اس کے باوجود کہ محمد تغلق نے اپنا دارالحکومت دہلی سے دولت آباد (دکن) منتقل کرتے وقت یہاں کے باشندوں کو دولت آباد ہجرت کرانے کا حکم جاری کیا۔' ہم عصر تاریخی ماخذ میں درج ذیل شہروں کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے۔ دارالحکومت دہلی، ملتان' لاہور' انہلواڑہ (پٹن)' کھمبیات' کرا' لکھنوئی' دولت آباد (دیوگری) وغیرہ۔ لاہور اس وقت ایک بڑا شہر تھا تاہم 13ویں صدی میں منگول کے حملے کے بعد زوال پذیر ہو چکا تھا۔ 14ویں صدی میں دوبارہ عروج کے راستے پر گامزن ہوا۔

7.10 شہری ترقی کے عوامل واسباب (Factors and Causes for the Urban Development)

پہلا سبب تو یہ تھا کہ ترک فاتحین نے دیہی زندگی پر شہری زندگی کو ترجیح دیئے۔ سلاطین کی طرح امراء بھی شہری پسند تھے۔ انتظامی عملے کے لوگ اور افواج بھی زیادہ شہروں میں قیام پذیر تھے۔ سلاطین دہلی مزاجاً اور تقاضاً شہریت پسند تھے۔ ان کا تعلق اسلامی تمدن و ثقافت سے تھا۔ لفظ تمدن مدن (اسی سے مدینہ یعنی شہر) سے ماخوذ ہے جو شہری طرزِ زندگی کی ترجیحات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی دیہی زندگی پر شہری زندگی کو فوقیت دی جاتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ جن علاقوں سے ہو کر ہندوستان آئے تھے وہاں شہری زندگی کافی ترقی یافتہ تھی۔ معیارِ زندگی بہتر تھی۔ بلکہ سلاطین دہلی جس دور میں تھے وہ دور ہی شہریت اور تمدن پسندی کا تھا۔ جس سے متاثر ہونا ایک فطری تقاضہ تھا۔ چنانچہ سلاطین دہلی کی بھی فارسی بادشاہوں کی طرح شہریت اور آسائش کے دلدادہ تھے، تفریح' نغمہ' موسیقی' رقص' شاعری وغیرہ میں کافی دلچسپی تھی۔ اسی طرح آرائش و زیبائش' قیمتی لباس' نادر زیورات' عمدہ قالین' لذیذ خورد و نوش وغیرہ کے دلدادہ تھے۔ محلات اور باغات وغیرہ کی زیبائش پر بھی ان کی بہت دلچسپی تھی۔

اس ضمن میں ایک اور قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ سلاطین دہلی نے دیگر ممالک خاص طور پر مسلم ریاستوں سے آنے والوں میں جنگجوؤں کے علاوہ تاجروں' دستکاروں' کاریگروں' ڈاکٹروں' علماء' شعراء اور دیگر علوم و فنون (علمِ نجوم' علمِ فلکیات' علمِ ہشت' ریاضی وغیرہ) کے ماہرین کی فراخ دلی سے سرپرستی کی۔ یہ افراد بھی زیادہ تر شہروں میں آباد ہوئے۔ اسی طرح یہ بھی شہری کاری/شہروں کی ترقی کے اہم عوامل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح سلاطین کا شہری مزاج یا شہر پسندی ایک بڑا سبب تھا۔ لہٰذا دارالحکومت' انتظامی دفاتر' فوجی قیام گاہیں' صنعتی کارخانے' بڑے بازار اور دیگر تجارتی سرگرمیاں شہروں میں ہوتی تھی۔ اور زمانہ کے ساتھ اقطاع داران اور ان سے وابستہ افراد کی رہائش گاہیں جہاں ہوتی تھی یا مالگذاری وصول کرنے جاتے تھے وہ رفتہ رفتہ شہروں میں تبدیل ہو گئے۔ مورلینڈ نے لکھا ہے کہ 14ویں صدی میں ان مقامات کی ترقی پر شہر کے طور پر ہوئی ہے۔ اس کی کئی وجوہ تھے۔ ان میں نقد کاروبار پر زور' مالگزاری نقد وصول کرنے کا قانون' کسانوں کو نقد کے عوض سامان

کو فروخت پر مجبور کرنا یا ابھارنا' تاجروں کی آمد اور بازاروں کا قیام وغیرہ چند نمایاں وجوہ ہیں جن سے شہروں کو ترقی ملی۔ مذکورہ عوامل کے علاوہ شہری ضرورتوں سے وابستہ مصنوعات کی پیداواری پر توجہ اور اس کے فروغ کے لیے جدید ٹکنالوجیز اور جدید آلات وغیرہ کا استعمال شہری ترقی کا دوسرا بڑا عوامل ہے۔ ترکوں نے کئی جدید ٹکنالوجیز' فن کار' ہنر مند افراد اور کاریگر اپنے ساتھ لے کر آئے۔ مثال کے طور پر شعبہ آسائش سے وابستہ اشیاء جیسے ریشمی کپڑے اور خوبصورت قالین تیار کرنے کے لیے فارس سے جدید آلہ دھاگے بُننے کی مشین انہوں نے ہی ہندوستان میں متعارف کرایا۔ اسی طرح کاغذ سازی کا نیا طریقہ متعارف کرایا جو ہندوستان میں پہلے موجود نہیں تھا۔

7.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بنیادی اور ثانوی مصادر اور ماخذ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد یہاں کے سماج' سیاست اور معیشت پر کافی گہرا اثر ہوا۔ حکومتی پالیسیوں کے سبب شعبہ معیشت میں کئی بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ جدید نظام معیشت' نیا طرز تجارت' مختلف سامان تجارت' جدید آلات مصنوعات ہندوستان میں متعارف ہوئے۔ اسی طرح تاجروں اور سوداگروں کے نئے گروہ جنم لیے۔ یہاں تک کہ زراعت اور مصنوعات کا روایتی نظام پیداوار میں جدید ٹکنالوجیز کے استعمال سے نہ صرف پیداوار میں آسانی آئی بلکہ پیداوار میں سرعت اور اضافہ دونوں ہوا۔ نقد کاروبار کے فروغ سے بازاروں اور شہروں کو ترقی ملی۔

7.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

معیشت، تجارت، تاجر، سوداگر، دست کاری، بری، بحری، بندرگاہ، شہریت، شہر کاری۔

7.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مورخین نے تاجروں کی کتنی قسمیں بتائی ہیں۔
2. ترکوں کی آمد کے بعد سیاسی اور معاشی تبدیلی کو کس نے شہری انقلاب کہا ہے؟
3. مارکیٹ کنٹرول پالیسی کس سلطان نے شروع کیا تھا۔
4. کاروانی تاجر کون تھے؟
5. کن تاجروں کو ملتانی تاجر کہا جاتا تھا؟
6. ہنڈی کسے کہا جاتا تھا؟
7. عہدِ وسطیٰ کے اہم بندرگاہوں کے نام بتایئے۔
8. عہدِ وسطیٰ میں کن کن غیر ممالک سے تجارتی ہوتی تھی؟

9. زر پر مبنی معیشت Money Economy سے کیا مراد ہے؟
10. کس سلطان نے سب سے پہلے معیاری سکے جاری کیے۔

7.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں شہری ترقی کے عوامل واسباب پر مختصر مضمون لکھیے۔
2. دہلی سلطنت کے اہم تجارتی گروہوں پر مختصر مضمون لکھیے۔
3. علاءالدین خلجی کے مارکیٹ کنٹرول پالیسی کی اہم اصلاحاتی اقدامات پر تبصرہ کیجیے۔
4. محمد بن تغلق کے علامتی سکے اصلاح کی ناکامی کی وجوہات بتایئے۔
5. ہنڈی کی تجارتی اہمیت اور قسموں پر نوٹ لکھیے۔

7.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں غیر زرعی معیشت کے فروغ پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. دہلی سلطنت کے نظام تجارت سے بحث کیجیے۔
3. دہلی سلطنت کے تجارتی تعلقات سے بحث کیجیے۔

7.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Ahmed, Fouzia Farooq, *Muslim Rule in Medieval India*: *Power and Religion in the Delhi Sultanate*, Bloomsbury, New Delhi, 2022.
2. Ashraf, K.M., *Life and Conditions of the People of Hindustan*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1970.
3. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
4. Habib, Irfan, *Economic History of India AD 1206–1526*, Tulika Books, Delhi, 2016.
5. Habibullah, A.B.M., *The Foundation of Muslim Rule in India*, Central Publishing House, Allahabad, 1999 (first pub. in 1945).
6. Kumar, Sunil, *The Emergence of the Delhi Sultanate*, *1192–1286*, Permanent Black, Ranikhet, 2007.
7. Lane-Poole, Stanley, *Medieval India under Mohammedan Rule*, Low Price Publications, Delhi, 1990 (first pub. in 1903).
8. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*: *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers, New Delhi,1995 (first pub. in 1983).
9. Mujeeb, M., *The Indian Muslims*, Munshiram Manoharlal, New Delhi, 2003 (first pub. in 1967).
10. Nizami K.A. ed., *Politics and Society during the Early Medieval Period, Collected Works of Professor Muhammad Habib*, Vol. I, Centre of Advanced Study, Department of History,

Aligarh Muslim University, People's Publishing House, 1974.
11. Rizvi, S.A.A., *The Wonder That Was India*, part-II, Rupa & Co., New Delhi, 1995 (first pub. in 1987).
12. Raychaudhuri, Tapan and Irfan Habib, *The Cambridge Economic History of India*, Vol. I Cambridge University Press, Delhi, 1982.
13. Moreland, W.H., *The Agrarian System of Moslem India*, Cambridge University Press, Cambridge, 2011.
14. Shrimali, Krishna Mohan, *Land, Agriculture and Money in Central India and Beyond* (*c. 100 to c. 1300 A.D.*): *A Feudal Order Revisited*, Aakar, Delhi, 2024.
15. Sharma, R.S., *Indian Feudalism*, *c. AD 300–1200*, Macmillan, Delhi, 2013 (first pub. in 1965).

اکائی 8۔دیہی سماج

(Village Community)

اکائی کے اجزا

8.0		تمہید
8.1		مقاصد
8.2		دیہہ یاگاؤں کی تعریف
	8.2.1	دیہی سماج کا تعارف
	8.2.2	دیہی سماج کی تشکیل و تنظیم
	8.2.3	دیہی سماج کی نوعیت وحیثیت
8.3		دیہی سماج کے حقوق وفرائض
	8.3.1	کاشتکار
	8.3.2	مقدم/پنچ مقدم
	83.3	پٹواری
	8.3.4	خدمتگاراور کاری گر
8.4		اکتسابی نتائج
8.5		کلیدی الفاظ
8.6		نمونہ امتحانی سوالات
	8.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	8.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	8.6.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
8.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید(Introduction)

علم سماج کی اصطلاح 'دیہی سماج' دو لفظوں کا مرکب ہے۔ 'دیہی' اور 'سماج'۔ دیہی لفظ دیہہ کا اسم مفعول ہے۔ دیہہ کا مطلب گاؤں ہے اس نسبت سے 'دیہی' کا مطلب 'دیہہ کا' یا 'گاؤں کا'۔ 'سماج' سے مراد ہے افراد کا ایسا مجموعہ جو مشترکہ وجوہات کی بنیاد پر ایک جگہ یا علاقہ میں سکونت کرتے ہوں۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ 'دیہی سماج' سے مراد کسی گاؤں یا دیہہ میں سکونت اختیار کرنے والے افراد کا گروہ جو باہمی معاونت وانحصار کے رشتے میں بندھے ہوں۔ بابائے قوم مہاتما گاندھی نے کہا ہے 'ہندوستان گاؤں میں بستا ہے' 2011 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی کا تقریباً دو تہائی سے زائد حصہ گاؤں میں رہتا ہے۔ جب کسی ملک کی آبادی میں آج بھی گاؤں کا اتنا بڑا حصہ ہے تو ذہن میں سوال پیدا ہونا واجب ہے کہ یہ گاؤں کیا ہے؟ اور ہماری تاریخ میں اس کا مقام و کردار کیا تھا؟ کیونکہ بقول ہیرالڈ. ایچ. مان (Herold H. Mann)' ہندوستان کا دل اس کے گاؤں میں ہے''۔ ان کا اصرار ہے کہ ''اگر کسی ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو ہمیں بادشاہوں، شہزادوں اور ان کے تزک واحتشام کے مبالغہ آمیز تذکروں سے بھرے ہوئے جلی حروف میں رقم شدہ اور مزین دستاویزات کے بجائے ان غبار آلود بوسیدہ اور غیر طبع دستاویزات تک رسائی حاصل کرنا چاہئے جن میں تہہ بہ تہہ دیہی زندگی کے نشیب و فراز اور گہما گہمی کی مکمل روداد موجود ہوتی ہے''۔ لہٰذا ہندوستان کے تاریخی مطالعے کے لیے گاؤں یا دیہہ کو سماجی اور معاشی زندگی کی بنیادی اکائی کے طور پر سمجھنا ضروری ہے تاکہ اس کے آگے دیہی سماج کو تمام جزیات کے ساتھ بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

8.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دیہہ یا گاؤں کی تاریخی حیثیت سے متعارف ہونگے۔
- دیہی سماج کی تشکیل و تنظیم سے واقف ہونگے۔
- دیہی سماج کے مختلف عناصر کے باہمی رشتے کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھ پائیں گے۔
- مغلیہ عہد میں ادنیٰ مگر اہم ترین تنظیمی و معاشی اکائی کے طور پر دیہی سماج کے کردار و تعاون کو سمجھ پائیں گے۔
- معاشی بنیادوں پر حکومت اور دیہی سماج کے باہم انحصار کی کیفیت کا ادراک کر پائیں گے۔

8.2 گاؤں کی تعریف (Introduction to the Village)

ہندوستان کی تاریخ کے ماخذوں میں ہمیں گاؤں کی موجودگی کا مسلسل حوالہ ملتا ہے۔ عہد قدیم کی تحریروں، کتبات اور اسناد شاہی میں ''گرام''، جبکہ عہد وسطیٰ کی فارسی اور دیگر علاقائی تحریروں اور زبانی روایتوں میں اُر، ٹپہ، دیہہ، موضع اور گاؤں پایا جاتا ہے۔ رِگ وید میں پہلی بار لفظ ''گرام'' کا استعمال گاؤں کے لئے نظر آتا ہے جبکہ مرکنڈ پُران میں گاؤں کی تعریف میں کہا گیا کہ ''زرعی اراضیات سے گھرا ہوا وہ علاقہ جہاں کچھ لوگ سکونت پذیر ہوں اور اُن اراضیات میں فصلیں اگانے کی کوششوں میں وہاں کے کاشتکاروں کی مدد کرتے ہوں''، مونئیر ویلیمس

(Monier Williams) کے مطابق گاؤں 'وہ محدود علاقہ ہے جہاں مشترکہ فلاح کی بنیاد پر پیشوں کا محتاط تعین ہو اور خاندانوں کے باہمی انحصار کے ساتھ سیاسی آزادی اور خود مختاری حاصل ہو۔' آر کے پاٹل کے مطابق 'گاؤں سے مراد خاندانوں کا وہ گروہ جو کسی علاقہ کی زرعی اراضیات کے مرکز میں کسی خاص نام کے ساتھ آس پاس یا سلسلہ وار مکانات میں سکونت پذیر ہوں اور باہمی ذمے داریوں کے تعلق سے آپسی رشتے میں جڑے ہوئے ہوں''۔ عرفان حبیب کے مطابق ''گاؤں لازمی طور پر کاشتکاروں کی وہ آبادی ہے جو بہتر حفاظتی بندوبست اور ضروری اشیاء کے مبادلے کی سہولتوں کی بنیاد پر ایک ساتھ سکونت اختیار کرتے ہوں''۔ بی. ڈی. چٹوپادھیائے کے مطابق ''ایک مثالی دیہی آبادی (یعنی گاؤں) تین اجزاء کے مجموعے کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ (1) واستو یعنی (رہائشی) مکانات، (2) شیتر یعنی (زرعی) اراضیات اور (3) گوچر یعنی چراگاہیں۔' راجستھان اسٹیٹ آرکائیوز میں دستیاب مشرقی راجستھان کے زرعی محصولات سے متعلق دستاویزات کے تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل تھے۔ (1) بستی یعنی رہائشی علاقہ، (2) راہ یعنی راستے، (3) مگرو یعنی پتھریلی زمین، (4) پہاڑیاں، (5) ندی، نالے، تالاب یعنی آبی اراضیات، (6) سیر یعنی مخصوص نظامِ محصول کے تحت لائی گئی اراضیات، (7) جنگل اور (8) زرعی اراضیات۔ دانشوروں کے مندرجہ بالا خیالات اور دستاویزات کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ گرچہ گاؤں کی تعریف مختلف طریقے سے کی گئی ہے تاہم اجمالی طور پر گاؤں کے مندرجہ ذیل تین بنیادی اجزاء کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

- علاقہ یعنی ایسا محدود جغرافیائی علاقہ جو رہائشی، زرعی اور غیر زرعی اراضیات پر مشتمل ہو۔
- آبادی یعنی انسانوں کا ایسا گروہ جو مذکورہ بالا علاقے کے درمیان واقعی مکانات میں رہائش پذیر ہو۔ اور
- زرعی معیشت، یعنی مذکورہ آبادی بقائے زندگی کی تمام تر ضرورتوں کے لیے زمینی یا زرعی پیداوار پر منحصر ہوں۔

ان تینوں میں 'آبادی' ہی وہ عنصر ہے جس سے دیہی سماج کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ سوال ہے کہ دیہی سماج کیا ہے اور مغل دور میں اس کی شکل وصورت اور کردار کیا تھا۔

8.2.1 دیہی سماج کا تعارف (Introduction to the Village Community)

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بیان کیا جاچکا کہ دیہی سماج سے مراد کسی گاؤں یا بستی میں سکونت پذیر وہ مجموعی آبادی جو باہمی معاونت و انحصار کے رشتے میں جڑی ہو، اور یہ بھی دیکھ چکے کہ گاؤں کے تشکیلی عناصر میں 'آبادی' سب سے اہم ہے۔ تو یہ سمجھنا قطعی مشکل نہ ہوگا کہ جیسے ہی انسانی آبادی مناسب توازن کے ساتھ باہمی معاونت وانحصار کے رشتے میں جڑی ہے وہیں ایک تنظیم کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ گاؤں کی سطح پر پیدا ہونے والی اسی تنظیم کو انگریزی میں Village Community اور ہندوستانی اصطلاح میں 'دیہی سماج' کہتے ہیں۔ تو کیا مغل دور میں دیہی سماج موجود تھا؟ تاریخ ہند کے تناظر میں دیکھیں تو عہد قدیم سے ہی تاریخی ماخذوں میں ہمیں 'سبھا'، گرام سبھا، پنچایت، گرام پنچایت وغیرہ جیسی اصطلاح ملتی ہے جس سے کسی گاؤں میں زیر بحث دیہی تنظیم کی فعال موجودگی کا علم ہوتا ہے جو گاؤں کے سماجی، معاشی، انتظامی اور فلاحی امور کی نگہداشت کرتی تھی اور ان معاملات میں وہ خود کفیل وخود مختار تھی۔ اس طرح عہد قدیم سے لے کر برٹش حکومت کے قیام تک ہندوستان میں گاؤں کی سطح پر ایک ایسی تنظیم جو یوروپی اصطلاح Village Community کے ہندوستانی مترادف 'دیہی سماج' کے

طور پر نظر آتی ہے۔ حقیقتاً دیکھا جائے تو ہندوستان اور یوروپ میں 'دیہی سماج' یا 'ویلیج کمیونٹی' کی تشکیل میں بنیادی فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی دیہی سماج کی تشکیل میں عہد قدیم سے ہی لوگوں کی مادّی ضرورتوں کے علاوہ وَرن، ذات اور مذہب کا کافی دخل رہا ہے جبکہ یوروپی ویلیج کمیونٹی کی تشکیل میں نسل اور علاقے کو اولیت حاصل رہی ہے۔ اس کے علاوہ یوروپ کی ویلیج کمیونٹی کے کاشتکاروں کو زمین پر حق ملکیت حاصل نہیں تھا جبکہ مغل دور کے دیہی سماج کے کاشتکاروں کو زمین کا حق ملکیت موروثی طور پر حاصل تھا۔

8.2.2 دیہی سماج کی تشکیل و تنظیم (Composition and Organisation of Village Community)

مغل دور کے گاؤں کی تشکیل عمومیت سے کسی ذات، خاندان یا قبیلہ کی بنیاد پر ہوئی تھی جس کی وجہ سے آج بھی اُن گاؤں کو اسی نسبت سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً راجپوتوں، جاٹوں، برہمنوں یا گوجروں کے گاؤں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بیڈین پاویل نے ہندوستان کے دیہی سماج کو ''مشترکہ خاندان کا اضافہ'' کہا ہوگا۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گاؤں کی آبادی میں کثرت کسی ذات، قبیلے یا خاندان کے افراد کی رہی ہو لیکن معاشی نظریہ سے وہ سب مجموعی طور پر کاشتکار ہی تھے۔ جن کی بقائے زندگی کا سارا دارومدار زرعی پیداوار پر منحصر تھا اور زرعی پیداوار کی سرگرمیوں کا بڑا حصہ گاؤں کے خدمت گاروں اور کاری گروں پر منحصر تھا۔ اس طرح مغل دور کے دیہی سماج کی تشکیل میں تین لازمی عناصر کی پہچان کی جا سکتی ہے جو کاشت کار، خدمتگار اور کاری گر کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ گو کہ مغلیہ گاؤں میں ان تین عناصر کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے لوگوں کی موجودگی نظر آتی ہے جن میں چھوٹے خدمتگار بھی تھے جنہیں ''کمین'' کہا جاتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا شمار دیہی سماج میں یا تو کیا نہیں جاتا تھا یا بہت ہی نچلی سطح پر شمار کیا جاتا ہے۔ انتظامی سہولتوں کی وجہ سے مغلوں نے پورے ملک کو درجہ بہ درجہ مختلف اکائیوں میں تقسیم کر رکھا تھا جو آئین کے مطابق صوبہ، سرکار، تحصیل یا پرگنہ کی اصطلاح سے پہچانی جاتی تھیں۔ صوبہ سب سے بڑی اکائی تھی، اس سے چھوٹی سرکار اور سرکار سے چھوٹی اکائی پرگنہ یا تحصیل تھی۔ ایک پرگنے کے اندر کئی گاؤں ہوتے تھے۔ گاؤں معاشی اور انتظامی نظام کی سب سے چھوٹی اکائی ہوتا تھا۔ سیاسی اور جنگی وجوہات کی بناء پر اِن انتظامی اکائیوں کی تعداد کا مستقل تعین ممکن نہیں تھا۔ مطلب یہ کہ یہ طے نہیں تھا کہ پورے ملک میں صوبوں کی تعداد، یا ایک صوبے کے اندر کتنی سرکاریں اور ایک سرکار کے تحت کتنے پرگنے اور پرگنے کے اندر کتنے گاؤں ہوں گے، اس کا کوئی قاعدہ متعین نہیں کیا جا سکا تھا۔

چونکہ گاؤں انتظامی اور معاشی ڈھانچے کی بنیادی اکائی تھا اور مغلیہ ہند کی پوری معیشت زراعت پر منحصر تھی جبکہ حکومت کی آمدنی زرعی محصولات پر جس کے انتظام و انصرام کے لئے حکومت کو گاؤں کی سطح پر ایسے افراد کی ضرورت تھی جو گاؤں کے حالات و معمولات کو اچھی طرح جانتے ہوں اور حکومت کے لئے کچھ ذمے داریاں اُٹھا سکیں۔ لہٰذا گاؤں کی سطح پر ایک ایسے گروپ کی نشاندہی ہو جاتی ہے جو اصلاً تو گاؤں کے باشندے ہوتے تھے لیکن سرکاری ذمہ داریوں کو نبھانے کی وجہ سے گاؤں میں ان کے کردار وہاں کے عام لوگوں سے مختلف ہو جاتا تھا۔ دراصل یہ گروپ مغل دور کے زرعی ڈھانچے میں گاؤں اور حکومت کے درمیان ایک کڑی کے کردار میں نظر آتا ہے یعنی اس اعتبار سے یہ آدھا دیہی سماج کا حصہ تھا جبکہ آدھا حکومت کا اہلکار۔ اسلئے اگر انہیں ''نیم سرکاری'' اور ''نیم دیہی'' کہیں تو کیا مضائقہ ہے؟ اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ مغل دور کے دیہی سماج کا ڈھانچہ موٹے طور پر چار کھمبوں پر کھڑا تھا۔ یعنی اس کے اجزائے ترکیبی میں کاشتکار، دیہی اہلکار یا عہدیدار،

خد متگار اور کاری گر ود ستکار کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

گو کہ اصولی طور پر گاؤں میں بسنے والا ہر فرد وہاں کے دیہی سماج کا رکن تھا لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں تھا کہ گاؤں کے مالی اور انتظامی معاملات میں ہر فرد سیدھے طور پر شامل ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وِرِندابن اور راجستھان سے دستیاب دستاویزات کے تجزیئے کی بنیاد پر عرفان حبیب کے مطابق ''ہر گاؤں (خصوصاً رعیتی گاؤں) میں ایک پنچایت یا سبھا ہوتی تھی جس میں اُس گاؤں کے ہر کاشتکار خاندان سے ایک فرد بطور پنچ شامل ہوتا تھا جن کی مجموعی تعداد تو طے نہیں ہوتی تھی تاہم پانچ سے تیرہ تک کی شہادت موجود ہے۔ اِن پنچوں میں سے ہی مشترکہ رائے سے ایک سردار منتخب کر لیا جاتا تھا جو مختلف علاقوں میں الگ الگ ناموں سے پہچانے جاتے تھے لیکن مغلیہ نظام میں شمالی ہند میں ''مقدم'' اور جنوبی ہند میں ''پٹیل'' کہلاتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ہی گاؤں میں دو مقدم بھی نظر آجاتے ہیں۔ عام طور پر اس پنچایت کی رُکنیت، جیسا کہ نینسی کی تصنیف کھیات اور بودھ تحریر ملند پنہو سے معلوم ہوتا ہے، کاری گروں، خد متگاروں، مزدوروں، عورتوں، غلاموں، معمولی دیہی باشندے، اور بیماروں کو نہیں ملتی تھی لیکن ایسے کاری گر یا خد متگار، جو ایک مناسب رقبۂ زمین کے مالک ہوتے تھے اور کاشتکاری بھی کرتے تھے، وہ پنچایت میں بطور پنچ شامل ہو سکتے تھے۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیہی سماج کی تشکیل میں صرف اعلیٰ طبقے کے صاحب ثروت کاشتکار، بیوپاری، کاریگر، خد متگار یعنی دیہی اشرافیہ (Village Oligarchy) کی شمولیت ہوتی تھی۔ یا یوں کہیں کہ مغل دور کے دیہی سماج میں طبقاتی تفریق موجود تھی۔ مذکورہ بالا دستاویزات کی بنیاد پر عرفان حبیب کے مطابق پنچ کا مقام حاصل کرنے کے لئے حقِ وراثت کی بڑی اہمیت تھی یہاں تک کہ تبدیلیٔ مذہب بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ جب کہ 42-1640 کے موضع اریٹھ (متھرا) سے متعلق ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ باری خان کے قبول اسلام کے بعد بھی پنچایت میں بطور پنچ اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ موروثی جانشینی کے علاوہ پنچوں کے انتخاب میں ذات، قوم، دولت اور سماجی و سیاسی رسوخ بھی اہم کردار نبھاتے تھے۔ بی۔ آر۔ گروور مغل دور میں دیہی سماج کی موجودگی کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ''عہد وسطیٰ میں دیہی سماج کے لازمی جزو کے طور پر پنچایت سسٹم یا گاؤں کے بزرگوں کی کاؤنسل کے تصور کی تلاش و شناخت بہت مشکل ہے۔ زمیندار اور مقدم خاندان اور دیگر عوام اکثر گاؤں کی چوپال میں جمع ہوتے تھے اور زرعی آبادی اور اُن سے متعلق معاملات پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ ذات برادری کے تعلق سے تبادلۂ خیال کرنے اور اُن سے متعلق دستور کا نفاذ عمل میں لانے کے لئے بھی چوپال مناسب مقام تھا۔ محض اس بنیاد پر مانا جا سکتا ہے کہ مغل دور میں دیہی سماج کا وجود تھا۔'' اس طرح گروور کے لیے دیہی سماج کے منظم ہونے میں ''ذات ہی اہم ترین وجہ انسلاک تھی اور دیہی سماج کی تشکیل اور طرزِ کار ذات پنچایت (Caste Panchayat) جیسا تھا''۔ وہ واضح طور پر اس کی تردید کرتے ہیں کہ دیہی سماج کا گاؤں کی زرعی زندگی، انتظام مالگذاری اور سماجی طور طریقوں کے نشو نما میں کوئی کردار بھی تھا۔

8.2.3 دیہی سماج کی نوعیت ووسعت (Nature and Extent of Village Community)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیہی سماج مغلیہ ہند میں اپنی موجودگی کے لحاظ سے ہمہ گیر (Universal) تھا یا الگ الگ علاقوں میں اس کی نوعیت جداگانہ تھی؟ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان پر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے غلبے کے بعد سے ہی برٹش حکمرانوں کے سامنے ملک کی اراضیات کی ملکیت کا سوال کھڑا ہو گیا جو سیدھے طور پر نئے حکمرانوں کے زرعی محصولات سے منسلک تھا۔ اس معاملے میں ان کا موقف تھا کہ ملک کی تمام تر اراضیات حکومت کی ملکیت ہے اور دیہی سماج کی حیثیت محض پٹہ دار (Tenant) جیسی ہے۔ اپنے اسی موقف کو ثابت کرنے کے لئے 1810ء میں برٹش پارلیامنٹ کی کمیٹی آف ہاؤس آف کامنس برائے ایسٹ انڈیا افیسرز نے اس مسئلہ پر تفصیلی مباحثہ کا اہتمام کیا۔ برٹش افسران چارلس میٹکاف، جیمس مل، ایلیفنسٹن (Elphinstone) اور سر ہنری مین (S.H. Maine) نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی۔

چارلس میٹکاف نے ہندوستان کے دیہی سماج کو 'بیرونی تعلقات سے مبریٰ' 'ناقابل تبدیل' 'چھوٹی جمہوریت' کہا۔ جیمس مل نے اسے 'کارپوریشن' کہا۔ ایلفنسٹن نے کہا کہ 'عہد وسطیٰ میں انہوں (دیہی سماج) نے ہندوستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ میں رکاوٹ پیدا کی تھی'۔ سر ہنری مین نے کہا کہ ''یہ رقبۂ زمین پر مشترکہ حق ملکیت رکھنے والے خودکار خاندانوں کا منظم مجموعہ تھا'۔ انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ ''ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ایک مخصوص قبیلہ غالب اکثریت میں ہوتا تھا وہاں اس قبیلے کے سردار کو افضیلت حاصل ہوتی تھی اور جس گاؤں میں (مختلف قبیلوں کی) ملی جلی آبادی ہوتی تھی وہاں گاؤں کی پنچایت کو فوقیت ملتی تھی''۔ اس طرح ہنری مین نے مغلیہ ہندوستان میں دیہی سماج کے وجود کو ہمہ گیر تسلیم نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ اپنی موجودگی کے لحاظ سے اس کی نوعیت گاؤں کی مجموعی آبادی کی نوعیت پر منحصر تھی۔ یعنی اگر دیہی سماج ہم جنس (Homogenous) تھا تو وہاں اس کی شکل زیادہ واضح نہیں تھی لیکن اگر دیہی سماج کثیر النوع (Heterogenous) تھا تو اس کی صورت زیادہ واضح تھی۔ اس سلسلے میں عرفان حبیب کا خیال ہے کہ ''کچھ گاؤں ایسے تھے جہاں ہم ذات کاشتکاروں کی کثرت تھی جبکہ کئی گاؤں میں کثیر الذات کاشتکاروں کی۔ لہٰذا اسی کو (اصولی طور پر) پورے مغلیہ ہند کے لئے نمونے کے طور پر تسلیم کر لینا چاہئے۔'' آر تھر فلپ کا خیال ہے کہ دیہی سماج قدیم ہندوستان میں موجود تھا لیکن مسلم حکمرانوں کی ارتکازی طرز حکومت (Centralised Administration) میں اسکا زوال ہو گیا اور عہد وسطیٰ میں زمینداری سسٹم نے بھی اس کے زوال کی راہ ہموار کی''۔ حالانکہ دیہی سماج کے ذیلی عناصر جیسے پردھان، پٹواری، چودھری وغیرہ محض حکومت کی خوشنودی کی وجہ سے اپنے عہدوں پر برقرار رہے لیکن ان کی برخواستگی یا تقرری کا مکمل اختیار شاہی حکومت کے پاس ہی محفوظ تھا۔ بی۔ آر۔ گرووَر کے مطابق ''انیسویں صدی میں حقیقتِ اراضی (Land Tenure) پر مبنی دیہی سماج کی موجودگی اُن علاقوں میں زیادہ واضح نظر آتی ہے جہاں دہلی کے سلطانوں اور مغلوں کا مکمل تسلط قائم تھا بہ نسبت اُن علاقوں کے جہاں ان کے دستور العمل کا نفاذ مستقل طور پر نہیں ہو پایا تھا''۔

اس مختصر مباحثے کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ (1) ہندوستان میں دیہی سماج کا تصور ہندو یا مسلم طرز حکومت پر نہیں بلکہ تغیر پذیر علاقائی اور قبائلی رسومات و روایات پر مبنی تھا۔ (2) عہد وسطیٰ کے گاؤوں میں دیہی سماج کی موجودگی یا غیر موجودگی کے لئے کوئی

واضح اصول یا نمونہ موجود نہیں تھا۔(3) لیکن مغلیہ ہند میں دیہی سماج بطور دیہی تنظیم ہر علاقے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا۔ جو ظاہری ہیئت کے لحاظ سے علاقہ بہ علاقہ تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے بی۔آر۔ گرووَر کا خیال ہے کہ ''دیہی سماج کا تصور مروجہ حقیقت اراضی کے طور طریقوں اور اس گاؤں میں موجود زرعی اور غیر زرعی آبادی کے باہمی رشتے پر منحصر تھا۔ لہٰذا اس کا مطالعہ علاقائی اور قبائلی بستیوں اور اکثریتی قبائل کی عملداریوں میں حقوق زمینداری کے تعلق سے بھی کیا جانا چاہئے''۔

8.3 دیہی سماج کے حقوق وفرائض (Rights and duties of rural society)

مغلیہ حکومت کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ زرعی محصولات تھا۔ معمول کے مطابق یا اُس سے بہتر زرعی پیداوار کا حصول کاشتکار اور حکومت، دونوں کی ضرورت تھی۔ یعنی دیہی علاقوں کی آبادی جن پر زراعت کی تمام تر سرگرمیوں کا انحصار تھا اور جو دیہی سماج کے مختلف عناصر پر مشتمل اور منحصر تھی پر جہاں حکومت کے لیے کچھ فرائض ادا کرنے ہوتے تھے وہیں حکومت اپنے معاشی استحکام کے لئے دیہی سماج کے حقوق واختیارات کو بھی تسلیم کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ذیل میں دیہی سماج کے مختلف اہم عناصر کے حقوق وفرائض مختصراً پیش کئے جاتے ہیں۔

8.3.1 کاشتکار (Farmer)

مغل دور میں کاشتکاروں کا ان کے زیر زراعت اراضیات سے کیا رشتہ تھا اس سلسلے میں ابوالفضل (آئین) اور دیگر متعدد عصری دستاویزات ہماری رہنمائی کرتے ہیں جیسا کہ ابوالفضل نے حکومت کے ذریعہ کاشتکاروں اور تاجروں سے طلب کئے گئے محصولات کے سلسلے میں بیان کیا ہے کہ محصولات کا مطالبہ اراضیات پر شاہی حق ملکیت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ان کو (عوام کو) ''حق وانصاف'' اور حفاظت فراہم کرنے کی اجرت کے طور پر تھا۔ پھر اکبر اور جہانگیر کے فرامین اور دیگر احکامات میں زمینداروں کو پر زور تاکید کی گئی تھی کہ وہ ''رعیت کاشتہ'' (اراضیات) کو ''خود کاشتہ'' میں تبدیل نہ کریں کیونکہ آئین کے مطابق یہ بادشاہ کی ذمہ داری ہے کہ نسلوں سے زمینوں پر کھیتی کرتے آرہے کاشتکاروں کی حفاظت کرے۔ اکبر کے عہد کے سورت، کھمبات، وِرِندابن اور راجستھان سے دستیاب دستاویزات، جن کا تجزیہ عرفان حبیب نے کیا ہے ان دستاویزات میں بھی اس ضمن میں وافر شواہد ملتے ہیں جو زرعی اراضیات پر کاشتکاروں کے نہ صرف موروثی حق ملکیت کو ثابت کرتے ہیں بلکہ انہیں ان اراضیات کو فروخت کرنے یا منتقل کرنے کے اختیار کو بھی واضح کرتے ہیں پھر اورنگ زیب کا جاری کیا گیا فرمان بھی وضاحت کرتا ہے کہ زمین کی ملکیت ارباب زمین یا مالک زمین کی ہے۔ اسی فرمان میں یہاں تک حکم ہے کہ اگر کوئی کاشتکار حکومت سے طلب شدہ محصولات کو ادا کئے بغیر فوت ہو گیا ہو تو مذکورہ محصولات اس کے وارثین سے وصول کئے جائیں۔ ان شہادتوں کی بنیاد پر یہ واضح ہو جاتا ہے ہے کہ (زرعی) زمینوں پر کاشتکاروں کو موروثی حق ملکیت حاصل تھا یعنی کاشتکار ہی زمین کے اصل مالک تھے۔ انھیں زمینوں کی خرید وفروخت اور منتقلی کے بھی اختیارات حاصل تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ کوئی کاشتکار نہ تو قابل زراعت اراضیات کو خالی چھوڑے اور نہ ہی

اپنے علاقے کو چھوڑ کر جائے جس سے کہ زرعی پیداوار میں گراوٹ کے نتیجے میں حکومت کو محصولات کا نقصان ہو۔ اس سلسلے میں یوروپی سیاحوں کے بیانات، مغل شہنشاہوں کے فرامین، سورت، کھمبات، وِرندابن، راجستھان سے دستیاب اور دیگر متعدد دستاویزات اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فیکٹری ریکارڈز کے تجزیے سے ایسے شواہد سامنے آتے ہیں جہاں حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کے لیے لازم تھا کہ وہ زرعی زمینوں کو بے کاشت نہ چھوڑیں اور نہ ہی اپنے علاقے کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہو جائیں، حکومت کی ان کوششوں پر بھی روشنی پڑتی ہے جہاں وہ ایک علاقہ سے ہجرت کر چکے کاشتکاروں کو واپس ان کے سابقہ علاقوں میں واپس لانے کی کوششوں میں مصروف نظر آتی ہے اور نگ زیب کے محمد ہاشم کو جاری کئے گئے فرمان سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی کاشتکار استعداد کے باوجود اپنی زمین پر کھیتی نہیں کرتا تھا تو اسے جسمانی سزا کے علاوہ قید کیا جانے کا بھی انتظام تھا۔ اس طرح واضح ہے کہ جہاں کاشتکاروں کو زمین و زراعت کے تعلق سے کئی حقوق حاصل تھے وہیں انھیں حکومت کی طرف سے عائد پابندیوں کو تسلیم کرنا لازم تھا۔ ان پابندیوں کی بنیادی وجہ تھی زرعی محصولات جو حکومت کی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ ایسی حالت میں کاشتکاروں کا وجود پوری طرح آزاد نہیں تھا۔ لہذا بقول عرفان حبیب اس حالت میں مغل دور کے کاشتکاروں کو یا 'نیم زرعی غلام' (Semi Serf) کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے عائد زرعی محصولات کے علاوہ بھی کاشتکاروں کو گاؤں کے مشترکہ مالی فنڈ، مقدم، پٹواری اور دیگر سرکاری اہلکاروں کو دیگر محصول جسے مجموعی طور پر ''ابواب'' کہا جاتا تھا ادا کرنا پڑتا تھا۔

8.3.2 پنچ مقدم (Panch Muqaddam)

مقدم ایک عربی لفظ ہے جس سے مراد وہ شخص ہے جس کو اولیت حاصل ہو۔ یعنی فرد اول۔ مغلوں کے انتظامی اصطلاح میں مقدم گاؤں کے دیہی سماج کی پنچایت کا سردار یعنی فرد اول ہوتا تھا۔ مختلف علاقوں میں الگ الگ ناموں مثلاً۔ منڈل، جیٹھ رعیت، مہتون، مکھیا، پردھان وغیرہ سے پکارا جاتا تھا۔ لیکن آئین اکبری کے مطابق انھیں شمالی ہند میں مقدم اور جنوب میں پٹیل کہا جاتا تھا۔ وِرِندابن سے دستیاب دستاویزات کی روشنی میں عرفان حبیب کا خیال ہے کہ مقدم اور پنچ عملی طور پر ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے گاؤں یا دیہی سماج کی پنچایت کا سردار ہونے کی وجہ سے جہاں انکو عوام کے مقابلے کچھ زیادہ اختیارات و مراعات حاصل تھے وہیں ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ تھی۔ مغلیہ ہند میں گاؤں زرعی محصولات کے تخمینے اور محصولات کی وصولیابی کے لیے بنیادی اکائی تھا اور مقدم ایک نیم سرکاری عہدیدار جس کا کام تھا کہ محصولات کے اہلکاروں کے ساتھ ملکر گاؤں کی زیر کاشت فصلوں کی پیمائش کی بنیاد پر تمام کاشتکاروں کے الگ الگ حصوں کا محصول طے کرنا اور پٹواری کے تعاون سے ان محصولات کی وصولی کرنا اور حکومت کا حصہ سرکاری خزانے میں جمع کرنا۔ اس کے علاوہ مقدم کے ذمے گاؤں کی مشترکہ اراضیات اور مشترکہ مالی فنڈ کی نگہداشت و انتظام، گاؤں کے مشترکہ آمد و خرچ کا حساب رکھنا اور دیہی سماج کے مختلف فلاحی اور ثقافتی پروگراموں کا انتظام و اہتمام کرنا تھا۔

بی۔ آر۔ گروور کے مطابق عہد وسطیٰ میں گاؤں کی نہ تو کوئی مشترکہ اراضی تھی اور نہ ہی کوئی مشترکہ مالی فنڈ، انکا خیال ہے کہ گاؤں کی افتادہ اراضیات (wasteland) چراگاہ اور جنگل حکومت کی ملکیت تھی پھر گاؤں کے ذریعہ زمیندار اور مقدم کو ابواب

(Nominal Cess)کی ادائیگی کے عیوض حق تصرف حاصل ہوجاتا تھا۔' ، مزید برآں گروور کہتے ہیں کہ مغل دور میں ملبہ (contribution to common village fund)کا مطالبہ غیر قانونی تھا جبکہ 'خرچ دیہہ' کو دیہی سماج میں مشترکہ مالی فنڈ کا مقام حاصل ہی نہیں ہوا۔ لیکن ورندابن سے حاصل شدہ دستاویزات کے حوالے سے عرفان حبیب کا نظریہ ہے کہ دیہی سماج کو افتادہ اراضیات پر یقیناحق تصرف حاصل تھااور مشترکہ مالی فنڈ (فوط) بھی موجود تھا،۔انکے مطابق 'زمین موضع' پر پنچایت کا کنٹرول تھاخواہ وہ تالابی اراضیات افتادہ قابل زراعت زمین ہو۔ ورندابن کے چند دستاویزات کے حوالے سے ثابت ہوجاتا ہے کہ دیہی سماج کو مشترکہ اراضیات کو فروخت کرنے، ٹھیکے پر دینے یا کسی کو اس پر کاشتکاری کی اجازت دینے کا مکمل حق حاصل تھا۔ لیکن کسی انفرادی کاشتکار کی زمین کو فروخت یا منتقل کرنے کا اختیار دیہی سماج کو حاصل نہیں تھا۔اسی طرح بی-ایل- بھدانی راجستھان میں، فوکازاواد کن میں اور این کاراشیما جنوبی ہند میں دستیاب دستاویزات کی روشنی میں دیہی سماج کی موجودگی، اسکی مشترکہ اراضیات اور مشترکہ مالی فنڈ کی موجودگی کی توثیق کرتے ہیں۔ چونکہ مقدم دیہی سماج کا سردار ہوتا تھااور اس کے اوپر حکومت کی طرف سے بھی کچھ ذمہ داریاں ڈالی گئی تھیں لہٰذا اسکو دونوں طرف سے کچھ معاوضہ اور مراعات حاصل تھیں، حکومت کیطرف سے وصولے گئے محصولات کا ڈھائی فیصد مقدم کا حصہ طے تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاؤں سے چھوٹے چھوٹے ابواب (cess) وصول کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا دیہی خدمتگاروں اور زرعی مزدوروں سے بیگار کروانے کا حق بھی مقدم کو روایتی طور پر حاصل تھا۔

8.3.3 پٹواری (Patwari)

پٹواری جیسا کہ عرفان حبیب کہتے ہیں لفظ ''پٹّہ'' سے نکلا ہے۔ اراضیات پر حق تصرف کی تفویض کے تعلق سے جو دستاویز تیار ہوتا تھا اسکو ''پٹّہ زمین'' کہتے ہیں جو پٹواری کی تحویل میں رکھے جاتے تھے غالباً اسی سے لفظ پٹواری نکلا ہو۔ دیہی سطح پر پٹواری کی موجودگی سابقہ زمانے میں دیکھی جاسکتی ہے علاءالدین خلجی کے انتظامی امور سے تعلق دستاویزات میں پٹواری کی اصطلاح اکثر آتی ہے مغل دور کے مآخزوں اور زرعی محصولات سے متعلق دستاویزات میں پٹواری اکثر نظر آتا ہے ابوالفضل (آئین) کے مطابق پٹواری کے فرائض میں گاؤں کے آمد و خرچ کا حساب رکھنا اہم تھا ٹوڈرمل کی یادداشتوں کی بنیاد پر عرفان حبیب کہتے ہیں کہ جب اعلی عہدیداراں کسی گاؤں کے زرعی محصولات کا تخمینہ لگا لیتے تھے تب پٹواری کا کام تھا کہ وہ ایک ایک کاشتکار (کارندہ) کے حصے کے رسد (محصول کی مقدار) الگ الگ ان کے ناموں کیساتھ درج کرے اور محصولات وصول کرنے والے ذمہ داروں کا فرض تھا کہ وہ پٹواری اور مقدم سے طے شدہ محصولات کی وصولیابی کو یقینی بنانے کے تعلق سے ایک مچلکہ (bond) تحریر کرواکر محفوظ کرلے آئین کے مطابق عہدیداراں محصولات کی ذمے داری تھی کہ وہ پٹواری پر دباؤ ڈالیں کہ وہ تمام کاشتکاروں سے وصول شدہ محصولات کی رقوم کی سرخط یعنی رسید الگ الگ تحریر کرے اور ان رسیدوں کا جامع ریکارڈ تیار کرلے اور محصولات کی جتنی رقم جن جن ''عیان'' یعنی دیہی امراء (oligarch) کے ذمے باقی رہ گئی ہو اسکا حساب بھی تیار کرکے جمع کرلے۔ پٹواری کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے کاغذات یعنی بہی، یا ''کاغذ خام'' کو ھندوی (علاقائی زبان) میں تحریر کرکے محفوظ کرلے۔ محصولات اور مالی محکمہ کے عہدیداراں کے لیے مالگذاری سے متعلق یہ ریکارڈ سب سے زیادہ معتبر تھے۔

ابوالفضل کے مطابق پٹواری گاؤں کا یعنی دیہی سماج کا ملازم تھا۔ کچھ گاؤوں کے آمد و خرچ سے متعلق دستاویزات کی بنیاد پر عرفان حبیب کا خیال ہے کہ پٹواری کی ادا کی جانیوالی اجرت گاؤں کے اخراجات میں درج کی جاتی تھی یعنی اسکی اجرت کا بار مجموعی طور پر پورے گاؤں پر تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ پٹواری کو حکومت کی طرف سے بھی اس کی خدمات کے عیوض تنخواہ ادا کی جاتی تھی جس کی شرح گاؤں کے مجموعی محصول کا ایک فیصد تھا۔ لہٰذا پٹواری کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ مغل دور میں وہ ایک نیم سرکاری عہدیدار تھا۔ یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ دیہی سماج میں غالب عناصر خصوصاً مقدم کے اختیارات کے اضافے نے کس طرح پٹواری کے حقوق کو متاثر کیا لیکن جیسا کہ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ بعض بعض گاؤں میں پٹواری کو اتنی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ وہ ادنی کاشتکاروں کو کسی نہ کسی بہانے پریشان کر سکتا تھا۔

8.3.4 خدمتگار اور کاری گر (Servants and Workers)

مغلیہ سلطنت کی مجموعی آبادی کا غالبا پچاسی فیصد حصہ گاؤں میں رہتا تھا جن میں پیشے کی بنیاد پر اکثریت کاشتکاروں کی تھی جو مجموعی زرعی اراضیات کے بڑے حصے پر حق ملکیت و تصرف رکھتے تھے۔ لیکن جیسا کہ عرفان حبیب کہتے ہیں۔ ''کاشتکاروں کے علاوہ بھی کچھ لوگ گاؤں میں اور تھے جیسے خدمتگار اور کاری گر جن کی موجودگی زرعی کام کاج اور روزمرہ کی بنیادی اشیاء کی فراہمی کے لیے لازمی تھی''۔ اسلئے گاؤں کے خدمتگار اور کاری گر دیہی سماج کا اہم ترین حصہ تھے۔ وِرندابن کے دستاویزوں سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ گاؤں کی مشترکہ اراضیات سے کچھ حصہ انہیں بھی منتقل کیا جاتا تھا تاہم یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس زمین کا استعمال وہ کیسے کرتے تھے۔

بروچ (گجرات) کے کلکٹر کی 1776 عیسوی کی رپورٹ کے مطابق ''ہر گاؤں میں لازم ہے کہ زمین (لا محصول) کچھ حصہ اُن خدمتگاروں اور کاری گروں، جو مروجہ رسومات کے مطابق گاؤں کی مشترکہ خدمات اور ضروریات کے لئے ضروری ہیں، کی گذر بسر کے لیے محفوظ کر دیا جانا چاہئے''۔ پھر 1800 عیسوی میں بوکانن کے مطابق کرناٹک میں فصلوں کے ڈھیر سے کچھ حصہ مقدم اور پٹواری کے علاوہ پنڈت، فقیر، جیوتشی، نائی، کمہار، بڑھئی، لوہار، دھوبی، امین، موتی گر، چوکیدار اور بھشتی کے لئے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ اس حصے کی شرح کاشتکاروں کے خاندان کی جسامت (Size) پر منحصر ہوتی تھی۔ اور اسی مناسبت سے تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ بوکانن، پھر 12-1811 عیسوی میں بہار اور پٹنہ کی سروے رپورٹ میں درج کرتے ہیں کہ بڑھئی اور لوہار کا تعلق جاگیری کارخانے (Manorial Establishment) سے ہے اور زرعی اوزاروں اور اس کی مرمت کا معاوضہ فصلوں کے حصے سے ادا کیا جاتا تھا۔ 1847 عیسوی کی سندھ کی سروے رپورٹ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بڑھئی کے ذریعہ سال بھر رہٹ کی مرمت کا معاوضہ یا کمہار کے ذریعے مٹی کے برتنوں کی فراہمی کا معاوضہ فصلوں کے حصے کے ذریعے ادا کیا جاتا تھا اور یہ ''مضبوط رشتہ'' گاؤں کے تمام ممبران کے درمیان پایا جاتا تھا۔ اسی کی بنیاد پر عرفان حبیب کے مطابق ''اس طرح کے شواہد سے دیہی سماج کے کلاسک بیانیہ کو مزید تقویت ملتی ہے''۔ جس نے جیمس مل، ہیگل اور مارکس کے خیالی نظرے کو بنیاد فراہم کی''۔ مزید برآں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بیڈین پاویل نے خدمتگاروں اور کاری گروں کے دیہی سماج سے مستقل رشتے کی سچائی کو تسلیم کر لیا۔ 1936 عیسوی میں ڈبلو۔ ایچ۔ وائزر (W.H.Wiser) اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ خدمتگار اور

کاری گر کا انسلاک رسوماتی تعلقات کی بنیاد پر پورے گاؤں سے نہیں تھا بلکہ موکل خاندان (Client Family) کے گروپ (جو اُن کے ججمان تھے) سے تھا"۔ لیکن آر۔ایس شرما کا خیال ہے کہ دوسرے شہری انحطاط (7^{th}–9^{th}) کے زمانے میں شہروں کے بے روزگار کاری گر روزگار کی تلاش میں دیہی علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ جہاں سے گردش زمانہ نے رسمِ ججمانی کو پیدا کیا۔

اس طرح یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ گاؤں کے خدمتگار اور کاری گر غالباً پورے سلطنت مغلیہ کے تمام تر دیہی حصے میں موجود تھے جن کی خدمات پورے گاؤں کے لئے ناگزیر تھی تو وہیں دوسری طرف ان کا انحصار بھی گاؤں پر ہی نظر آتا ہے۔ ایک طرف جہاں گاؤں کے خدمتگار بطور مہتر، بھنگی، چمار وغیرہ گاؤوں کی غلاظت کی صفائی کرتے ہیں وہیں بڑھئی، لوہار، کمہار، سونار، نائی، درزی، دھوبی وغیرہ جیسے کاری گر گاؤں کے لوگوں کی روزمرہ کی ضروری اشیاء کی فراہمی کو یقینی بناتے ہیں۔ یہ صورتحال پورے ہندوستان میں پائی جاتی تھی اور اس کی شہادت بیڈین پاویل نے اپنی تحقیق میں دے دی۔ ان کے مطابق "خدمتگاروں اور کاری گروں کا زمینداروں اور زرعی سماج سے نسلوں پر انارشتہ ہے جو آج بھی ہندوستان کے گاؤوں میں دیکھا جاسکتا ہے"۔

8.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دیہی سماج سے مراد کسی گاؤں کی مجموعی آبادی جن میں کاشتکاروں کی کثرت ہوتی تھی لیکن حکومت کے اہلکار، زرعی خدمتگار، کاری گر اور دیگر ادنی عوام بھی اپنی فعال موجودگی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ دیہی سماج یا گاؤں کو معاشی اور سماجی اکائی کے طور پر منظم رکھنے اور جملہ معاملات کے انتظام و نگہداشت کے لئے ایک پنچایت ہوتی تھی جس کے نمائندوں کو پنچ یا پنچ مقدم اور اس کے سردار (Cheif) کو مقدم کہا جاتا تھا۔ پنچایت میں ممبروں یعنی پنچوں کی تعداد کا تعین گاؤں کی آبادی پر منحصر تھا لیکن یہ پانچ سے تیرہ تک ہو سکتے تھے۔ پنچ کا مقام عام طور پر موروثی حق تھا۔ دیہی سماج کی موجودگی مغل دور میں پوری سلطنت میں تھی۔ مقدم اور پنچ کو گاؤں کی مشترکہ اراضیات پر حق تصرف حاصل تھا اور مشترکہ مالی فنڈ کے کام کاج اور آمد و خرچ کی نگہداشت بھی مقدم کے ذمے تھی۔ زمین پر کاشتکاروں کو حق ملکیت حاصل تھا۔ ان کی ذمے داری تھی کہ وہ اپنی زمینوں پر بہتر فصل اگائیں تاکہ حکومت کو طے شدہ محصولات حاصل ہو سکے۔ دوسری طرف حکومت کی طرف سے اُن پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی تھیں جن کے مطابق کوئی کاشتکار اپنی مرضی سے کاشتکاری کا کام چھوڑ نہیں سکتا تھا نہ ہی اپنی زمینوں کو بے کاشت چھوڑ سکتا تھا۔ ایسا کرنے پر سزا بھی ہو سکتی تھی۔

مقدم اور پٹواری گاؤں کے نیم سرکاری، عہدیدار تھے جن کے ذمے گاؤں کے مجموعی محصولات کا حساب کتاب رکھنا تھا جس کے عیوض حکومت کی طرف سے انہیں گاؤں کے مجموعی زرعی محصول سے ہونے والی آمدنی کا سلسلہ وار ڈھائی فیصد اور ایک فیصد معاوضہ ملتا تھا۔ روزمرہ کی دیہی زندگی میں سماج کو زراعت کے لئے اوزاروں اور مختلف خدمات کی ضرورت ہوتی تھی جس کے لئے وہ دیہی کاری گروں خدمتگاروں اور زرعی مزدوروں پر منحصر تھے۔ دوسری طرف یہ کاری گر، خدمت گار اور مزدور اپنی گوناگوں ضرورتوں کے لئے کاشتکاروں پر منحصر رہتے تھے۔ دونوں گروپ ایک دوسرے پر انحصار کرتے تھے۔ کچھ ادنی درجے کے بھی خدمت گار تھے جو کمین کہلاتے تھے لیکن وہ اپنی

سماجی حیثیت میں کاشتکاری کا پیشہ اختیار کر کے ترقی کر سکتے تھے۔ اجمالی طور پر مغلیہ ہند میں ایک صحت مند، فعال اور خود کفیل دیہی سماج کا تصور سامنے آتا ہے جو یوروپ کی اس عہد کی Village Community سے بہت جدا تھا۔

8.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

دیہہ / گرام / موضع	:	گاؤں
ذات	:	نسل
کاشتکار	:	کھیتی باڑی کا کام کرنے والے لوگ
پٹواری	:	محکمۂ محصولات سے متعلق گاؤں یا پنچایت کی سطح کا ایک نیم سرکاری عہدہ
مقدم / پنچ مقدم	:	دیہی پنچایت کا ممبر یا نمائندہ (شمالی ہند میں)
پٹیل	:	جنوبی اور مغربی ہند میں مقدم کا مترادف

8.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دیہہ یا گاؤں کیا ہے؟
2. کیا دیہی سماج کی موجودگی (extent) پورے مغلیہ ہند میں تھی؟
3. کاشتکار کون تھے؟
4. کیا کاشتکاروں کو زمین کی ملکیت حاصل تھی؟
5. کیا دیہی سماج کو پنچایت کے مشترکہ مالی فنڈ پر اختیارات حاصل تھا؟
6. کیا کاری گروں کو کاشت کاری کرنے کا حق حاصل تھا؟
7. کیا کاشتکار ہونے کے لئے زمین پر مالکانہ حق ضروری تھا؟
8. کیا پٹواری کسی گاؤں میں پوری طرح حکومت کا نمائندہ تھا؟
9. دیہی سماج کا سب سے اہم حصہ کون تھا؟
10. کیا دیہی سماج کی پنچایت یا سبھا میں ممبروں کی تعداد متعین تھی؟

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Question)

1. دیہہ یا گاؤں کی تعریف بیان کیجئے۔

2. دیہی سماج کے تشکیلی اجزاء پر ایک نوٹ تحریر کیجئے۔
3. واضح کیجئے کہ دیہی سماج کی موجودگی زرعی پیداوار کے لئے معاون تھی۔
4. پٹواری کے کام کاج کا جائزہ لیجئے۔
5. کاشتکاروں کے اختیارات و فرائض کا جائزہ پیش کیجئے۔

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دیہی سماج کی وسعت کل ہند تھی، تفصیل سے وضاحت کیجئے۔
2. یوروپی ویلیج کمیونٹی اور ہندوستانی دیہی سماج کے درمیان کیا کچھ مشترک تھا؟ واضح کیجئے۔
3. دیہی سماج میں کاری گروں اور مزدوروں کی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لیجئے۔

8.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggest Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).
3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
4. Chandra, Satish, *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans*, Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta, 1986.
5. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
6. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
7. Hasan, Saiyid Nurul, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, New Delhi, 1990 (first pub. in 1973).
8. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
9. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. in 1923).
10. Shivram, Balkrishan, *Jagirdars in the Mughal empire during the Reign of Akbar*, Manohar, New Delhi, 2008.

اکائی 9۔زرعی پیداوار اور ٹیکنالوجی

(Agricultural Production and Technology)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 مغل عہد کی زرعی پیداوار سے متعلق مواخذہ واعداد و شمار

9.3 وسعت زراعت

9.4 زرعی پیداوار کے وسائل

9.4.1 کاشت کار

9.4.2 پاہی کاشت یا پائی کاشت

9.4.3 زمین اور مٹی

9.5 کھیتی کے لئے ضروری اوزار اور دیگر وسائل

9.5.1 ہل

9.5.2 بیل

9.5.3 پاٹا اور دیگر چھوٹے اوزار

9.6 بیج کی بوائی

9.6.1 کھاد

9.6.2 فصلوں کی حفاظت

9.6.3 فصلوں کی کٹائی اور تیاری

9.7 آبپاشی کے ذرائع

9.7.1 کنواں

9.7.2 باندھ اور دیگر آبی ذخائر

9.7.3 ندی، نہریں
9.8 فصلیں
9.8.1 غذائی فصلیں
9.8.2 نقدی فصلیں
9.8.3 پھل سبزی
9.8.4 مویشی پروری
9.9 شرح پیداوار
9.10 اکتسابی نتائج
9.11 کلیدی الفاظ
9.12 نمونہ امتحانی سوالات
9.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان ایک وسیع ترین علاقۂ زمین ہے جو مختلف النوع جغرافیائی اور ماحولیاتی خصوصیات کی بنیاد پر الگ الگ خطوں میں منقسم ہے۔ زراعت یہاں زمانۂ قدیم سے ہی معیشت کی بنیاد رہی ہے۔ مغل عہد میں بھی زراعت اور اس سے متعلق سرگرمیاں معیشت کا اہم ترین حصہ تھی۔ ایک طرف جہاں یہ حکومت کے لئے آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی وہیں عوام کے لئے بقائے زندگی کا اہم ترین وسیلہ۔ ایک مستحکم حکومت اور یکساں نظام قانون نے نہ صرف زراعت بلکہ صنعت و تجارت کے لئے بھی موافق ماحول پیدا کیا۔ عصری تحریروں اور غیر ملکی سیاحوں کے سفر ناموں میں جگہ جگہ ہندوستانی زراعت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے خوشگوار تذکرے پائے جاتے ہیں۔ ان تذکروں میں زراعت کی وسعت، فصلیں، طریقۂ آبپاشی، مویشی، اوزار، کھیتوں اور جنگلوں پر خاطر خواہ توجہ دی گئی ہے۔ لہٰذا نصاب کے اس حصے میں زیر مطالعہ عہد کی زراعت کی وسعت اور طریقۂ زراعت اور اس سے متعلق دیگر امور کا مطالعہ کریں گے۔ لیکن سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ زرعی پیداوار کیا ہے؟ جیسا کہ ہم جانتے ہیں زراعت سے مراد زمین سے فصل اگانے کا عمل ہے۔ یعنی جب انسان اپنے جہد و توانائی اور دیگر وسائل کا استعمال کر کے زمین سے ایسی اشیاء پیدا کرے جو اس کی بقائے زندگی اور دیگر ضروریات کے لئے لازمی ہو تو اس کی اِس سرگرمی اور کوشش کو زراعت کے عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جو غذائی یا غیر غذائی اجناس پیدا ہوتی ہے اسے زرعی پیداوار کہا جاتا ہے۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل عہد کی زرعی سرگرمیوں سے متعارف ہونگے۔
- وسعت زراعت، زرعی پیداوار کی قسموں اور انہیں پیدا کرنے کے طور طریقوں کی تفصیلی معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- مغلیہ ہند میں زرعی پیداوار کے لیے ضروری وسائل اور تکنیک کی تفصیلی معلومات حاصل کریں گے۔
- کاشتکاروں کی درجہ بندی سے متعارف ہونگے۔
- مغل عہد میں آبپاشی کے انتظامات کی معلومات حاصل کر سکیں گے۔

9.2 زرعی پیداوار سے متعلق اعداد و شمار (Statistics Related to the Agricultural Production)

مغل عہد کی زرعی پیداوار اور اس سے متعلق دیگر معاملات کے مطالعے کے لیے جو چیز سب سے اہم ہے وہ ہے ان امور سے متعلق اعداد و شمار۔ لیکن زیر مطالعہ عہد کی زرعی معیشت بالخصوص زرعی پیداوار کے تعلق سے معتبر اعداد و شمار کی سخت کمی پائی جاتی ہے، اور جو دستیاب بھی ہے تو ان میں تسلسل اور ہم آہنگی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جو عصری مواد دستیاب ہیں اُن میں ابوالفضل کی تصنیف 'اکبر نامہ' اور 'آئین اکبری'، رائے چتور من کی تصنیف 'چہار گلشن' اور نگ زیب کے فرامین اور دساتیر العمل اہم ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف علاقوں اور زبانوں کے بے ربط محصولاتی دستاویزات اور غیر ملکی سیاحوں کے سفر نامے بھی دستیاب ہیں جو تائیدی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تحریروں میں زرعی سرگرمیوں سے متعلق جو بھی اعداد و شمار دستیاب ہیں اُنکی بنیاد پر پورے وثوق کیساتھ کسی نتیجے پر پہونچنا تو یقیناً مشکل ہے لیکن ان کے باریک اور حساس تجزیئے سے کچھ ٹھوس اندازے ضرور قائم کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا عرفان حبیب کے مطابق ''اس موضوع پر معاصرین کے عمومی بیانات زیادہ سود مند نہیں ہیں کیونکہ یہ مبہم اور مبالغہ آمیز ہیں اور بہت حد تک باہم غیر آہنگ بھی ہیں۔ اِن ماخذوں میں کہیں کہیں مخصوص علاقوں کے زرعی حالات کا تذکرہ موجود ہے جن کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں شاید حقیقت کے قریب پہونچ سکتے ہیں۔ ان ریکارڈز میں سب سے اہم ''پیمودہ علاقہ'' اور گاؤوں کی تعداد سے متعلق اعداد و شمار محفوظ ہیں جن کا استعمال زیر مطالعہ عہد کے لیے بطور بنیاد ممکن ہے۔

9.3 وسعتِ زراعت (Extent of the Agriculture)

اکبر کے عہد کے مصنف عارف قندھاری کے مطابق سلطنتِ مغلیہ کی تمامتر اراضیات قابل کاشت تھی، جہانگیر کے ہم عصر معتمد خان کے مطابق پوری اراضیات کا ایک تہائی حصہ قابل کاشت تھی اور نگ زیب کا ہم عصر سجان رائے بھنڈاری کا خیال تھا کہ زیادہ تر اراضیات قابل زراعت تھی۔ عمومیت سے اس طرح کے بیانات کی بنیاد پر یہ معلوم ہونا ممکن نہیں کہ حقیقی طور پر مغل عہد میں زمین کا کتنا رقبہ قابل کاشت تھا اور کتنے رقبہ پر عمومیت سے کاشت کاری ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں ابوالفضل کی آئین، اورنگ زیب کے عہد کے دساتیر العمل اور

چتور من کی 'چہار گلشن' سے کچھ رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ان ماخذوں میں دستیاب اعداد و شمار میں پیائشی اکائیاں مختلف ہیں۔ مثلاً ابوالفضل نے زمین کی پیائش کے لیے بیگہ اُلٰہی کا استعمال کیا ہے تو بقیہ دو میں بیگہ دفتری کا۔ بیگہ اُلٰہی کے مقالے بیگہ دفتری چھوٹی اکائی تھی۔ بیگہ دفتری بیگہ اُلٰہی کا دو تہائی ہوتا تھا۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں بنگال، تھٹہ اور کشمیر کو چھوڑ کر مغل عہد کے تمام شمالی صوبہ جات کے زرعی علاقوں کے سرکار وار اور پرگنہ وار اعداد و شمار پیش کئے ہیں۔ یہ اعداد و شمار 1595ء کے آس پاس کے ہیں وہیں اورنگ زیب کے عہد کے دساتیر العمل میں 1685ء جبکہ چہار گلشن میں 1740ء کے اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔اِن میں تمام صوبوں کے لیے پیمودہ رقبہ، ہر صوبے میں گاؤں کی مجموعی تعداد اور ان کے پیمودہ و غیر پیمودہ گاؤں کی الگ الگ تعداد درج کی گئی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ علحدہ علحدہ پرگنوں کی پیائش حقیقتاً کس حد تک ہوئی تھی مشکل ہے۔ اورنگ زیب کے عہد کے دستیاب اعداد و شمار کچھ بہتر تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق 1685-86 عیسوی تک تقریباً پچاس فیصد گاؤں کی پیائش نہیں ہو پائی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی واضح نہیں ہو پاتا کہ 'زمین پیمودہ' سے کیا مراد ہے۔ کیا یہ صرف زیر کاشت زمینوں کے لیے تھا یا مجموعی طور پر زمینوں کی تمام قسموں پر مشتمل تھا؟ یعنی اس ''زمین پیمودہ'' سے مراد کل زیر کاشت زمین کے علاوہ قابل کاشت افتادہ بنجر، رہائشی علاقے اور دیگر آبی علاقے وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس معاملے میں مؤرخین کی مختلف رائے ہے۔ مورلینڈ کے مطابق ''زمین پیمودہ'' سے مراد کل زیر کاشت (جن پر فصل بوئی گئی تھی) زمین ہے۔

عرفان حبیب کے مطابق مغل دستاویز کی زمین پیمودہ جدید زرعی شماریات میں مجموعی طور پر تین قسموں کی زمین یعنی 'کل آباد زمین (cropped)، بے کاشت زمین اور قابل زراعت افتادہ زمین' پر مشتمل نظر آتی ہے۔ یعنی ان کے مطابق 'زمین پیمودہ' سے مراد مجموعی طور پر تمام اراضیات بشمول رہائشی، قابل زراعت غیر کاشتہ، زمین افتادہ، بنجر اور آبی (ندی، تالاب وغیرہ) اور جنگل ہے۔ عرفان حبیب کی تائید کرتے ہوئے شیریں موسوی نے متعلقہ شماریات کے حوالے سے یہ حساب لگایا ہے کہ ''زمین پیمودہ'' یعنی کل اراضیات میں ''قابل زراعت افتادہ'' زمین کا رقبہ محض دس فیصد تھا۔ لیکن وہ پھر اظہار خیال کرتی ہیں کہ یہ دس فیصد بھی کل رقبے سے الگ کر لینے کے بعد بھی یہ خیال کرنا کہ وہ پوری کی پوری زیر کاشت تھی، مناسب معلوم نہیں ہوتا کیونکہ بہت سے وسیع زیر کاشت زمینوں کی پیائش کے ثبوت نہیں ملتے۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اکثر زیر کاشت زمینوں کی پیائش ربیع اور خریف دونوں فصلوں کے وقت الگ الگ ہوتی تھی لیکن ریکارڈ میں اندراج کرتے وقت دونوں پیائش کو جوڑ کر ''زمین پیمودہ'' کے کالم میں لکھا جاتا تھا۔ ایسی صورتحال میں مغل عہد کے دستیاب اعداد و شمار زراعت کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ تاہم عرفان حبیب اور شیریں موسوی نے کچھ دیگر ماخذوں جیسے زرعی محصولات سے متعلق دستاویزات، شماریاتِ جمع اور دساتیر العمل میں درج مختلف زرعی شماریات اور شرحوں کی بنیاد پر مغل عہد کے حاصل شدہ نتیجوں کا موازنہ بیسویں صدی کی ابتداء (1910) کے زرعی اعداد و شمار سے کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس کے مطابق سولہویں صدی میں زیر کاشت زمینوں کا رقبہ بیسویں صدی تک آتے آتے دوگنا ہو چکا تھا۔ ان کے مطابق بہار، بنگال اور اودھ میں یہ اضافہ جنگل کی کٹائی کی وجہ سے جبکہ پنجاب، سندھ ملتان، لاہور جیسے صوبہ جات میں آبپاشی کے بہتر انتظام اور نہروں کے پھیلتے سلسلے کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔

9.4 زرعی پیداوار کے وسائل (Resources for theAgricultural production)

زرعی پیداوار کا حصول ایک پیچیدہ عمل ہے۔ کامیاب زراعت کے لئے لازم ہے کہ اس سے متعلق وسائل، جیسے انسانی و حیوانی توانائی، زمین یا مٹی، پانی، اوزار وآلات، تربیت یافتہ مزدور، ماحول اور آب وہوا اور مال کے علاوہ سیاسی و سماجی استحکام وغیرہ کے بیچ مناسب ہم آہنگی اور توازن ہو۔ یعنی کھیتی کرنے کے لیے کاشت کار یا کسان کی موجودگی ضروری ہے پھر مناسب زمین چاہیئے، زمین کو کھیتی کے لیے تیار کرنے کے لئے مزدور، مویشی اور اوزار کی ضرورت ہوتی ہے فصلوں کی اچھی پیداوار کے لیے اچھے قسم کی بیج اور کھاد کے علاوہ مناسب آبپاشی اور دیکھ ریکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نصاب کے اس حصے میں مغل عہد میں زرعی پیداوار کے حصول کے لیے ضروری وسائل اور انکا استعمال عصری تکنیک کی مناسبت سے کس طرح کیا جاتا تھا کا مطالعہ کریں گے۔

9.4.1 کاشت کار (The Peasants)

زرعی پیداوار کے وسائل میں جس عنصر کو اولیت حاصل ہوتی ہے وہ ہے کاشت کار یا کسان۔ پچھلے باب میں مغل عہد کے کاشتکاروں کے تعلق سے مختصر گفتگوں ہو چکی ہے جہاں خصوصیت سے دیہی سماج میں کاشتکاروں کی حیثیت اور اختیارات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں یہ دیکھنا مناسب ہے کہ مغل عہد میں زرعی پیداوار کے حوالے سے کاشت کاروں اور کسانوں کی حیثیت، انکی درجہ بندی اور انکا کردار کیا تھا اور پیداوار میں انکی حصہ داری کتنی تھی۔

9.4.2 کاشتکاروں کی درجہ بندی (Classification of the Peasants)

زیر مطالعہ عہد کے زرعی ڈھانچے کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ کاشتکاروں کی درجہ بندی ان کے زیر کاشت رقبۂ زمین، و سائلِ زراعت کی دستیابی، اور فصلوں کی تعداد اور شرح پیداوار کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ اٹھارہویں صدی کی تیسری چوتھائی (1750-75) عیسوی کی ایک تحریر بعنوان 'رسالۂ زراعت' سے کاشتکاروں کے چار طبقوں مقرری، فصلی یا بساتی (خود کاشت)، پائی کاشت اور کلجانہ کا علم ہوتا ہے۔ مقرری درجے میں وہ کاشت کار تھے جن کو زمین پر حق تصرف پٹے کی بنیاد پر ہوتا تھا اور جو ہر حال میں ٹیکس یا محصول کی ادائیگی مقررہ شرح پر کرتے تھے خواہ فصلوں کی پیداوار اچھی ہو یا بُری۔ فصلی یا بساتی (خود کاشت) ایسے کاشت کار تھے جن کو کھیتی کے لیے سال بہ سال زمین کا پٹہ حاصل کرنا پڑتا تھا اور انھیں حقیقی زیر کاشت زمین کے تناسب میں لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایسے کاشت کار اُسی پر گنے یا زمینداری میں سکونت اختیار کرتے تھے جہاں وہ کھیتی کرتے تھے۔ پائی کاشت وہ کاشت کار تھے جو اپنے آبائی علاقہ سکونت کے علاوہ دوسرے گاؤں کی زمینوں پر کاشت کاری کرتے تھے۔ کلجانہ ایسے کاشت کار تھے جو کسی بڑے کاشت کار کی ماتحتی میں انھیں کی زمین پر کھیتی کرتے تھے۔

لیکن عہد وسطی کے اواخر کے دستاویزات خصوصیت سے راجستھانی اور مراٹھی اور برٹش حکومت کے ابتدائی زمانے کے دستاویزات کے مطالعے اور تجزیئے سے کاشتکاروں کی درجہ بندی اور ان کے حالات کا بہتر اندازہ ہوتا ہے۔ ان تحریروں کی بنیاد پر مغل عہد میں عمومی طور پر کاشت کار کے دو اہم اور واضح طبقے نظر آتے ہیں۔ ایک ''خود کاشت'' اور دوسرا'' پاہی کاشت''۔ فارسی اصطلاح ''خود کاشت،

اصل میں مراٹھی لفظ ''تھانی'' یا سنسکرت لفظ ''استھانیکا'' کا مترادف ہے جسکا مطلب ہے مقامی کاشت کار۔ مراٹھی میں خود کاشت کے لیے ''تھلواہک'' یا ''میراسی'' اور پاہی کاشت کے لیے ''اُوپاری'' ''گُٹکلی'' یا ''کلواری'' جبکہ راجستھانی میں ''خود کاشت'' کے لیے ''گاویتی'' یا ''گھروہالا'' اور پاہی کاشت کے لیے صرف پاہی استعمال ہوتا تھا۔ برٹش افسران کو بھی بنگال میں کاشتکاروں کی کچھ ایسی ہی درجہ بندی نظر آئی تھی۔ یہ درجہ بندی کسی خاص علاقہ تک محدود نہیں تھی بلکہ پورے مغلیہ ہند میں رائج تھی۔ جنوبی ہند میں بھی ایسی ہی درجہ بندی تھی۔ لیکن یہ درجہ بندی محض روایتی تھی۔

9.4.3 خود کاشت (*Khudkasht*)

ستیش چندر کے مطابق ''خود کاشت'' ایک خود آشکارہ اصطلاح ہے جس سے مراد کاشتکاروں کا وہ درجہ ہے جو مورثی زمین پر خود سے حاصل شدہ وسائل اور افراد خاندان کے تعاون سے کھیتی کرتا تھا اور اسی علاقے یا زمینداری میں سکونت رکھتا تھا اور جنھیں ان کے زیر کاشت زمین کو فروخت یا منتقل کرنے کا اختیار حاصل تھا اور جنہیں ان زمینوں سے تب تک بے دخل نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک وہ ان زمینوں کا دستور کے مطابق عائد محصولات یا لگان کی ادائیگی کرتے رہتے تھے۔ لیکن ایس پی گپتا، عرفان حبیب اور دلباغ سنگھ کی تحقیقات کے مطابق ''خود کاشت'' درجے کے کاشتکاروں میں زمیندار ی، مقدم، مہاجن اور تاجر (غلے کا) بھی شامل تھے۔ جو اپنی زمینوں پر اجرت کے مزدوروں (hired labour) سے کھیتی کرواتے تھے۔ خود کاشت طبقے کے کاشتکاروں کے لیے مغل دستاویزات میں جابہ جا ''رعیت'' کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ یہ غالباً اسوجہ سے تھا کہ اُنھیں زرعی محصولات میں کچھ رعایت حاصل تھی۔ اصولی طور پر زرعی محصولات کی شرح اس طبقے کے معاملے میں بڑھائی نہیں جاسکتی تھی لیکن عملی طور پر شرح محصول کاشتکاروں کی تول مول کی صلاحیت، حکومت کے طور طریقے اور زمین کی فراہمی پر منحصر تھی۔

خود کاشت درجہ کے کاشت کار عمومیت سے دیگر کاشت کار طبقوں کے مقابلے خوشحال ہوتے تھے۔ وہ عمدہ زمینوں کے مالک ہوتے تھے اور نسبتاً زیادہ ہل بیل کے مالک تھے۔ جسکی وجہ سے سماج میں ان کا مقام دیگر کاشت کار طبقے کے مقابلے برتر ہوتا تھا۔ یہ طبقہ اپنی مضبوط اور مستحکم حالت کیوجہ سے کبھی کبھی محصولات کا اپنا بوجھ عام کسانوں پر ڈال دیتا تھا اور کئی بار رعیت کاشتہ زمینوں کو خود کاشتہ میں تبدیل کرنے کی بھی کوشش کرلیتا تھا۔ یوں تو قانونی طور پر رَعیت کاشتہ کو خود کاشتہ ''میں تبدیلی کرنا غیر قانونی تھا لیکن اس کے باوجود رعیت کاشتہ کو خود کاشتہ میں تبدیل کرنے کا رجحان نہ صرف قائم رہا بلکہ رفتہ رفتہ اسے حمایت بھی حاصل ہونے لگی۔ لہذا مالدار طبقے کے کاشت کار اور دیگر عناصر جن کے پاس زراعت کے وافر وسائل موجود تھے اکثر غریب کسانوں کی زمین کے لیے خریدنے یا انھیں رہن پر لینے لگے تھے جس کی وجہ سے بعد میں چل کر بٹائی داری اور پٹے داری کا رواج عام ہونے لگا۔ زراعت کی توسیع اور ترقی کے لیے سرمایہ لگانے کی اُنکی صلاحیت کی وجہ سے حکومت اُن سے یہ توقع کرتی تھی کہ وہ حکومت کی زرعی پالیسی کے نفاذ میں سرگرم حصہ لیں گے۔ اس کے علاوہ زرعی بحران کی صورت میں بھی وہ زرعی کام کاج کو جاری رکھ سکیں گے۔ جبکہ چھوٹے کاشت کار ایسے بحران کے وقت میں کھیتی باڑی کا کام چھوڑ بیٹھتے تھے۔ اسی کیفیت نے خود کاشتوں کو حکومت اور دیہی سماج کے کمزور طبقوں کے مقابلے اپنی حالت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے قابل بنادیا۔

دیگر کاشت کار طبقے کی طرح ہی خود کاشت طبقے کے کاشتکاروں پر بھی حکومت کی جانب سے دو طرح کی ذمہ داری تھی۔اول یہ کہ یہ اپنی صلاحیت کو بروئے کار لا کر زیادہ سے زیادہ رقبۂ زمین پر کھیتی کریں تا کہ حکومت کو محصولات کا فائدہ ہو۔اس سے لاپروائی برتنے یا انکار کرنے کی صورت میں سزا کے مستحق بھی سمجھے جاتے تھے۔دوئم یہ طبقہ زرعی محصولات کی مجموعی ادائیگی کے لیے بھی ذمہ دار تھا۔اگر ان میں سے کوئی دستور کے مطابق طے شدہ محصولات کی ادائیگی کئے بغیر غائب ہو جاتا تھا تو اسکا ہر جانا دوسرے کاشتکاروں کو اجتماعی طور پر ادا کرنا پڑتا تھا۔ ساتھ ہی غائب ہو چکے کاشت کار کی زمین کو دوسر کاشت کار کو پٹے پر دے دیا جاتا تھا ہے۔جس کی بازیافت کم سے کم تین سال تک ممکن نہیں ہوتی تھی۔لیکن اس مدت کے بعد اصل صاحب زمین تیس سال کی مدت کے اندر بقایا محصولات کی ادائیگی کر کے زمین کی بازیافت کر سکتا تھا۔

9.4.4 پاہی کاشت یا پائی کاشت (*Pahi Kasht* or *Pai Kasht*)

پاہی کاشت یا پائی کاشت ایسے کاشت کار تھے جو اپنے آبائی گاؤں کے بجائے دوسرے علاقوں میں کھیتی کرتے تھے۔انکی سماجی حیثیت اور زمین پر حقوق کی نوعیت انکی ذات (caste)، ہجرت کی مدت زرعی سرمایۂ زمین کی دستیابی اور مخصوص علاقوں کے رسم و رواج کے مطابق جدا جدا ہوتی تھی۔دیہی سماج میں ذات (caste) عزت واحترام (سماجی حیثیت) کے نظریے سے انکا مقام خود کاشتوں کے مقابلے کم تر ہوتا تھا۔کئی بار ایسا بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ ناموافق حالات کی وجہ سے بڑی ذات والے خود کاشت بھی پاہی کاشت بن جاتے ہیں۔سیلیکٹ کمیٹی کی پانچویں رپورٹ میں وارین ہیسٹنگز (Warren Hastings) نے اس درجے کے کاشتکاروں کو "خانہ بدوش رعیت" (Vagrant Ritts) کہا ہے۔اس کی تائید بیڈین پاویل (Baden Pawel) نے بھی اپنی تصنیف 'دی لینڈ سسٹم آف برٹش انڈیا' میں کی ہے۔ان کے مطابق 'پاہی کاشت' ویسے کاشت کار تھے جو ان گاؤں کی زمینوں پر کھیتی کرتے تھے جہاں وہ سکونت نہیں رکھتے تھے، جن کو رضائی پٹے دار (tenants at will) سمجھا جاتا تھا اور ان کی دلچسپی ان زمینوں میں محض عارضی ہوتی تھی جن پر وہ کھیتی کرتے تھے۔ ستیش چندر کے مطابق 'پاہی کاشتوں' کی یہ تعریف اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ کاشتکاروں کی اس حالت کو بیان کرتی ہے جو برٹش حکومت نے اپنے ابتدائی دور میں موجود پایا اور جنکی مزید (منفی) افزائش کے لیے وہ خود (برٹش حکومت) بھی کافی حد تک ذمہ داری تھی۔بی-آر- گروور بھی "پاہی کاشت" کی برٹش تعریف سے اتفاق نہیں کرتے۔اٹھارہویں صدی کی ایک فارسی تحریر کی بنیاد پر گروور کا خیال ہے کہ "پاہی کاشتوں" کو ان کے زیر کاشت زمینوں پر ویسا ہی اختیار حاصل تھا جیسا کہ خود کاشتوں کو انکی زمینوں پر یعنی وہ اپنی زیر کاشت زمین کو اپنے وارثان کی حق میں چھوڑ سکتے تھے اور منتقل بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ستیش چندر، گروور، کے اس خیال کو بیجا تسہیل (over simplification) سے تعبیر کرتے ہیں۔ستیش چندر کے مطابق پاہی کاشتوں کے اختیارات علاقہ بہ علاقہ وہاں کے حالات اور رسم و رواج پر مبنی ہوتے ہیں۔'فرہنگ یاسین' کے مطابق "ایک گاؤں کا رعیت جو دوسرے گاؤں کی زمین پر کھیتی کرتا ہے وہ رعیت گیری کے زمرے میں آتا ہے (تن بہ رعیت گیری آید)" یعنی ایسا کاشت کار جو رعیت یا باشندہ تو ایک موضع یا گاؤں کا ہو لیکن کھیتی کسی دوسرے موضع یا گاؤں یا زمینداری میں کرتا ہو وہ پاہی یا پاہی کاشت کہلاتا ہے۔ لیکن ستیش چندر کے مطابق اگر کوئی کاشت کار ایک ہی زمینداری کے کسی دوسرے گاؤں میں کھیتی کرتا ہو تو وہ پاہی نہیں کہلاتا تھا۔مہاراشٹر میں ایسے کاشت کار کو "اُوند کاری" کہا جاتا تھا۔

پاہی کاشتکاروں کو مزید دو درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے درجے میں ویسے کاشت کار تھے جو اپنے آبائی گاؤں کے قریب کے دوسرے گاؤں کی زمین پر کھیتی کرتے تھے لیکن انکی رہائش ان کے آبائی گاؤں میں ہی ہوتی تھی۔ ایسے کاشت کار کو غیر مقیم کسان بھی کہا گیا ہے۔ اس درجے کے کاشت کار عمومیت سے کسی پاٹل، زمیندار، مہاجن یا تاجر کی خود کاشتہ زمین یا انعام اور مدد معاش قسم کی زمینوں پر موافق شرائط کے ساتھ کھیتی کرتے تھے۔ ایسے بھی شواہد موجود ہیں کہ بڑی ذات کے کاشت کار کھیتی کے کام کو چند سماجی و مذہبی بنیاد پر ہیچ نظروں سے دیکھتے تھے لہٰذا اپنی زمینوں پر کاشت کاری کرنے کے لیے یہ لوگ پاہی کاشتکاروں پر ہی انحصار کرتے تھے۔ چونکہ مغل عہد میں اس قسم کے کاشت کار اچھی تعداد میں موجود تھے جن کے پاس خود کی زمین کی کمی تھی یا بالکل ہی نہیں تھی اسلئے وہ اپنی آمدنی میں خاطر خواہ اضافے کی غرض سے اکثر ایسے ہی کسی پاٹل، مقدم، زمیندار، انعامدار وغیرہ کی خود کاشتہ اراضیات پر موافق شرائط پر کھیتی کرتے تھے۔ مغل دستاویزات میں اس قسم کے چھوٹے کاشتکاروں کو 'ریزہ رعایا' یا 'مزارع' بھی کہا گیا ہے۔ ستیش چندر کے مطابق یہ کاشت کار ایسی زمینوں پر اس وقت تک حق تصرف رکھتے تھے جب تک وہ معمول کے مطابق محصولات کی ادائیگی کرتے تھے۔ اس درجے کے کاشتکاروں کے پاس کھیتی کرنے کے لیے اکثر خود کے ساز و سامان دستیاب نہیں ہوتے تھے لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مالی طور پر دولتمند طبقہ جیسے بڑے کاشت کار، زمیندار، مہاجن، تاجر وغیرہ پر انحصار کرتے تھے۔ یہ غیر مقیم کسان بہتر اور پر کشش شرائط کی تلاش میں اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ایسے کاشتکاروں کو کل پیداوار سے ضروری اخراجات اور محصولات کا حصہ نکالنے کے بعد باقی حصے میں سے ایک چوتھائی ملا کرتا تھا۔

پاہی کاشتوں کا دوسرا درجہ جو زرعی توسیع و ترقی کے لیے بہت ہی اہم نظر آتا ہے، مہاجر کاشتکاروں کا تھا۔ اس درجے کے کاشت کار اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر دور علاقوں تک ہجرت کر جاتے تھے۔ ان کے پاس اپنے ہل بیل اور دیگر لوازمات زراعت موجود ہوتے تھے۔ ان کاشتکاروں کے ذریعہ قابل زراعت افتادہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے، ویران گاؤں کی زرعی تجدید کاری یا نئے گاؤں کے قیام کے لیے حکومت کی جانب سے حوصلہ افزائی کے لیے موافق شرائط و رعایت کی پیشکش کی جاتی تھی۔ راجستھان کے پرگنہ دستاویزات، مہاراشٹر اور دیگر کچھ علاقوں سے دستیاب اہم دستاویزات کے مطالعے اور تجزیئے سے زراعت کی توسیع و ترقی اور ویران گاؤں کی تجدید کاری سے متعلق سرگرمیوں اور عوامل پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ویران گاؤں کی تجدید کاری، نئے گاؤں کی تشکیل و قیام اور نئے علاقوں میں زراعت کی توسیع میں مقدموں، پاٹلوں، زمینداروں اور پاہیوں کا یقیناً بڑا کردار ہوتا تھا۔ اسی ضمن میں ویران شدہ موضع مہاراجپور (راجستھان) کی تجدید کاری کے لیے وہاں کے پاٹل کو حکم دیا گیا کہ وہاں سکونت اختیار کرے اور یہ حلف نامہ پیش کرے کہ وہ گاؤں کی تمام زرعی زمین کو زیر کاشت لائیگا۔ اس کے عیوض اسکو رعایتی شرح پر پٹہ جاری کیا گیا جس میں محصول کی شرح پہلے تین برسوں کے لیے کل پیداوار کا ایک تہائی تھا۔ ایک دوسرے گاؤں میں نئے آسامیوں یا پاہی کاشتوں کو بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور زیر کاشت لانے کے لیے دو تہائی شرح محصول ادا کرنے کی پیشکش کی گئی لیکن وہیں سب سے عمدہ زمین یعنی پولاج قسم کی زمینوں پر شرح چالیس فیصد یا پانچ میں دو حصہ ہی رکھی گئی۔

مہاجر پاہی عمومیت سے اپنے آبائی علاقہ کے آس پاس گاؤں اور کئی مرتبہ دور دراز علاقوں تک ہجرت کر کے زرعی سر گرمیوں کو انجام دیتے تھے۔ یہ اپنے ہل بیل اور دیگر اوزار اپنے ساتھ لاتے تھے۔ انہیں نئے گاؤں میں رہائش کے لیے جھونپڑیاں نصب کرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس طرح سے جھونپڑے نصب کرنے کو رسم ''چھپر بندی'' کہا جاتا تھا۔ لہٰذا 1665ء میں دکن سے ہجرت کر کے چار سو پاہی راجستھان کے پرگنہ ملارن کے چھتیس گاؤں میں آکر بس گئے۔ وہی ایک دوسرے علاقہ سے 163 پاہی 185 ہلوں کیساتھ آکر کئی گاؤں میں زرعی سر گرمیوں میں شامل ہوگئے۔ ان مہاجر پاہیوں کے سامنے موافق اور پر کشش شرائط پیش کی گئیں۔ ''یادداشت پرداختی گاؤں پرگنہ ملارن'' کے تجزیئے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے مہاجر پاہیوں کو اپنا آبائی علاقہ چھوڑنا پڑتا تھا لیکن نئے علاقوں میں چھپر بندی کی رسم ذریعے رہائش اختیار کرنے کی اجازت بھی مل جاتی تھی۔ ایسے موافق حالات کا فائدہ اٹھا کر کئی پاہی کاشتوں نے اچھی ترقی کی اور خود کاشتوں کا مقام حاصل کرنے کے قابل ہوگئے۔

پاہی کاشتوں کے علاوہ بھی کچھ کاشت کار ایسے تھے جن کے پاس نہ تو زمین تھی نہ ہی وسائل اور نہ ہی انکی دلچسپی زمینوں اور فصلوں میں ہوتی تھی۔ دراصل یہ زرعی مزدور ہوتے تھے جو اجرت لیکر زرعی کاموں کو انجام دیتے تھے۔ گو کہ انکی تعداد کم تھی لیکن انکی موجودگی مغل عہد کے دیہی سماج میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہ اکثر چھوٹی ذات یا سماج کے نچلے طبقے سے آتے تھے۔ کاشتکاروں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اکثر زمین اور زرعی وسائل کی کمی کی وجہ سے مناسب مقدار میں پیداوار نہ ہونے کے باعث غربت اور مفلسی کا شکار ہو جاتے تھے ایسے کاشت کار اکثر بڑے کاشتکاروں کی زائد زمینوں پر کبھی اپنے خرچ پر اور کبھی مالک زمین کے خرچ پر کھیتی کرتے تھے۔ ایسے میں کھیتی کرنے والے کسان کو کل پیداوار میں شرائط کے مطابق طے شدہ حصہ ملا کرتا تھا اس طرح کی کھیتی کو 'بٹائی' اور کسان کو 'بٹائی دار' کہا جاتا تھا۔

9.4.5 زمین اور مٹی (Land and Soil)

پورے عہد وسطی کی زراعت کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ آبادی اور زرعی زمینوں کا تناسب بہتر تھا کیونکہ آبادی کے مقابلے قابل زراعت زمین کا رقبہ بہت بڑا تھا۔ ویسے تو عہد وسطی کے لیے ہر کاشت کار خاندان کے لیے انکی زیر کاشت زمینوں کے حقیقی رقبے کا تعین کرنا مشکل ہے لیکن مغل عہد سے متعلق کچھ علاقائی مطالعے سے اس پہلو پر کچھ روشنی ضروری پڑتی ہے۔ دلباغ سنگھ نے مشرقی راجستھان کے علاقے کے لیے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہر آسامی (خاندان) پر کھیتی کے لیے تقریباً نوّے (10) بیگہ زمین تھی۔ زمین کی پیداوری صلاحیت کے لیے مٹی کی نوعیت بہت اہمیت رکھتی تھی۔ لہٰذا زرعی محصولات کا تعین کرتے وقت مغل حکومت نے مٹی کی نوعیت اور اسکی پیداواری صلاحیت کو مد نظر رکھا تھا۔ مغل عہد میں زمین کی درجہ بندی مٹی کی نوعیت اور مقامی حالات کی بنیادوں پر کی گئی تھی اور اس سلسلے میں دیسی طریقے استعمال کئے گئے تھے۔ صوبہ بہار میں زمینوں کی درجہ بندی آبپاشی کی بنیاد پر کھیلفی (artificially irrigated) اور کنہیل (آبی ذخائر کے ذریعہ آبپاشی کی گئی) کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ اسی طرح بھوری مٹی جن میں ریت ملی ہوتی تھی عموماً خریف کی فصلوں کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ اس کے علاوہ زمین کے دو الگ درجے تھے۔ بانگور (عمدہ زمین) اور کھادر (نشیبی زمین) جہاں سال کے بڑے حصے میں پانی جمع رہتا تھا ایسی زمین پر فصلوں کی پیداوار عموماً غیر یقینی ہوتی تھی۔

استعمال کے لحاظ سے مغل ہند میں زمین چار زمروں پولج، پروتی، چاچر اور بنجر میں منقسم تھی۔ ایسی زمین جو اپنی پیداواری صلاحیت کے اعتبار سے عمدہ ہوتی تھی اور جس پر سال بہ سال کھیتی کی جاتی تھی، پولج کہلاتی تھی، اس زمرے کی زمین پر کھیتی کرنا آسان تھا لہٰذا اسے کاشت سے خالی چھوڑنے کا نہ رواج تھا نہ اجازت، دوسرے درجے میں ایسی زمین جو اپنی پیداواری صلاحیت اور زرخیزی میں پولج سے کم تر تھی، پروتی کہلاتی تھی۔ ایسی زمین پر ایک فصل اگانے کے بعد کچھ مدت کے لیے خالی چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ وہ زرخیزی اور پیداواری صلاحیت دوبارہ حاصل کر سکے پروتی کو تقریباً ایک یا دو سال تک علاقے کے حالات کی مناسبت سے خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ تیسرے درجہ میں چاچر قسم کی زمین آتی تھی جن پر ایک فصل اگانے کے بعد تین سے چھ سال تک خالی چھوڑ دی جاتی تھی۔ چوتھے درجے کی زمین بنجر کہلاتی تھی جو اپنی زرخیزی اور پیداواری صلاحیت کے اعتبار سے سب سے کم تر ہوتی تھی جو عمومیت سے پانچ سال یا اس سے زیادہ مدت کے لیے خالی چھوڑ دی جاتی تھی ۔ بنجر زمین کے اکثر علاقے عام طور پر غیر مزروعہ پڑے رہتے تھے یہ زمین خصوصاً ریگستان اور پہاڑی علاقوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

زرعی محصولات کے تعین کے لیے پولج اور پروتی زمینوں کی تقسیم آبپاشی کی سہولتوں کی بنیاد پر ''آبی، چاہی، نہاری، بارانی اور سیلابی کے زمروں میں کی گئی تھی۔ ویسی زمین جن کی آبپاشی نالوں یا دیگر آبی ذخیرے سے کی جاتی تھی ''آبی زمین'' کہلاتی تھی۔ جن زمینوں کی آبپاشی کنوئوں سے کی جاتی تھی وہ ''چاہی زمین'' کہلاتی تھی۔ جن کی نہروں سے آبپاشی ہوتی تھی وہ ''نہاری زمین'' تھی۔ بارش پر منحصر رہنے والی زمینوں کو ''بارانی زمین'' کہا جاتا تھا۔ ویسی زمین جو سیلاب کے پانی سے سیر اب ہوتی تھیں ''سیلابی زمین'' کے طور پر جانی جاتی تھی۔ دہلی اور اودھ صوبے میں اکثر سیلابی زمین تھی جسکی آبیاری گنگا اور جمنا جیسی بڑی ندیوں کے سیلاب کے ذریعہ ہوتی تھی۔ فصلوں کی پیداوار کے لحاظ سے عمدہ قسم کی زمینوں کو مزید تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ایسی زمین جس میں سال میں صرف ایک فصل ہی پیدا کی جاسکتی تھی ایسی زمین یا کھیت کو ''یک فصلہ'' کہا جاتا تھا۔ ان کھیتوں یا زمینوں کو جن میں ہر سال کم از کم دو فصلیں اگائی جاتی تھی ''دو فصلہ'' کہتے تھے اور ایسی زمین جن میں ایک سال کے اندر تین فصلیں پیدا ہوتی تھیں ''سہ فصلہ'' کہلاتی تھی۔ ہندوستانی کھیتوں کی اس خصوصیت کو یورپی سیاحوں نے بڑی دلچسپی اور حیرت سے دیکھا ہے۔ مغل عہد کے زرعی اعداد و شمار پر کاشتکاروں کے مختلف درجات کا علاقہ وار یا پورے مغلیہ عہد کے لیے تعداد و تناسب اور ان کے زیر کاشت زمینوں کے رقبات کا تعین کرنا تو مشکل ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پورے مغلیہ عہد میں کبھی بھی پاہیوں کی تعداد اور ان کے زیر کاشت زمین کا رقبہ خود کاشتوں کی تعداد اور زمین کے رقبے سے زیادہ نہیں تھا۔ ایک اندازے کے مطابق پاہیوں کی تعداد خود کاشتوں کے مقابلے کم و بیش پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں رہی ہو گی۔

کاشتکاروں کی ہجرت کے اسباب بعض دستاویزوں میں ذکر کئے گئے ہیں۔ ان دستاویزوں کی بنیاد پر ہجرت کے لئے کئی اسباب نظر آتے ہیں۔ ان میں قحط، جنگ، مقامی افسران کا ناموافق رویہ، حد سے زیادہ ٹیکس کا بوجھ، بقایا لگان کا بوجھ، قرضوں کی عدم دستیابی، بہتر اور موافق شرائط کی جستجو اور موسم کی تبدیلی وغیرہ ہجرت کے اہم اسباب تھے۔ مشرقی راجستھان کے سترہویں صدی کے دستاویزوں کے مطابق ٹپہ پھاگی کے پٹیل اور رعیت قحط کی وجہ سے اورنگ آباد منتقل ہو گئے۔ پرگنہ ملارن کی مردم شماری کے آنکڑوں کے مطابق کل آبادی کا دس فیصد مہاجر کسان تھے جن میں سات فیصد قریب کے گاؤوں اور پرگنوں سے آئے تھے جب کہ تین فیصد دکن اور مالوہ سے آئے تھے۔ بہتر حالات اور

شرائط کی جستجو میں پاہی کاشتوں کی نقل مکانی کی خواہش اور زراعت کی توسیع کے لیے حکومت کی کوشش کے درمیان ایک مناسب اور متوازن رشتہ بنائے رکھنا مغل عہد کے زرعی اور مالی نظام کی اہم ضرورت تھی جس کا مظاہرہ مغل حکمرانوں کی زرعی پالیسی میں لگاتار نظر آتا ہے۔

9.5 زراعت کے ضروری اوزار اور دیگر وسائل

(Essential Agricultural Tools and Other Resources)

مغل عہد کے تاریخی ماخذ میں یوں تو زرعی اوزاروں اور اس کے استعمال کی تفصیلی جانکاری کا فقدان ہے تاہم کہیں کہیں اس سلسلے میں کچھ تذکرہ ملتا ہے جن کی بنیاد پر کچھ اندازے ضرور لگائے گئے ہیں۔ کھیتی کے لیے ہندوستانی کاشت کار اپنے علاقے کی زمین اور فصلوں کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف قسم کے اوزار اور تکنیک کا استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح کھیتوں کی آبپاشی کے لیے مختلف ذرائع اور ترکیبوں کا استعمال کرتے تھے۔

9.5.1 ہل (Plough)

کھیتوں میں بیج بونے سے قبل اسکو تیار کرنا ضروری تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے کھیت کی جُتائی کر کے مٹی کو ہلکا کیا جاتا تھا۔ جُتائی کے لیے سب سے اہم اوزار ہل تھا۔ یہ عام طور پر مضبوط لکڑی سے بنایا جاتا تھا جس میں ضرورت کے مطابق لوہے کی پھل یا پھال کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ لوہے کے پھال والے ہلوں کا استعمال عام طور پر ان علاقہ میں کیا جاتا تھا جہاں کی مٹی مضبوط اور سخت ہوتی تھی۔ جن علاقوں کی مٹی ہلکی اور بلواہی ہوتی تھی وہاں ہلوں میں لوہے کی پھال لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یوروپی تحریروں میں ہندوستانی ہلوں کے ہلکے پن اور سادگی پر تنقید کی گئی ہے کہ یہ مٹی کی گہرائی تک جوتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور مٹی کی اوپری سطح کو محض کھرچتے بھرتے تھے۔ لیکن اسی سلسلے میں اب تک ہوئی تحقیق سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ ایسا تکنیکی کمزوری یا لوہے کی افراطی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ در حقیقت اسکی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی آب و ہوا اور مٹی کی نوعیت ایسی تھی کہ گہری جوتائی کی وجہ سے مٹی کی نمی کم ہو جاتی تھی دوسرے یہاں کے کھیتوں کی مٹی کی اوپری سطح ہی زیادہ زرخیز ہوتی تھی۔ ایسے حالات میں مغلیہ ہند میں بیشتر علاقوں میں صرف مٹی کی اوپری سطح کو جوتنے کے لیے ہلکے اور سادہ ہلوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ہلکے ہلوں کے استعمال سے کھیت کی سطح کو صرف ہلکا اور ڈھیلا کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ جب بیج سے پودے نکلیں تو انکی جڑوں کو مناسب مقدار میں دھوپ اور ہوا مل سکے اور جڑوں کے نازک ریشے بڑھ سکیں۔ اس کے ساتھ ہی گہری جتائی کی وجہ سے نیچے کی نم مٹی کے اوپر آکر دھوپ میں سوکھ جانے کا خطرہ ہندوستانی کاشت کار برداشت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا مغل ہندوستان کے ہلوں کے ہلکا اور سادہ ہونے کی وجہ سے اُن کی افادیت اور کارکردگی میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ ہندوستان میں جہاں ایک طرف خشک اور سخت مٹی والے علاقوں میں زمانہ قدیم سے ہی لوہے کے پھال والے ہلوں کا استعمال ہوتا آیا تھا۔ جو مغل عہد میں بھی رائج رہا وہیں دوسری طرف ہندوستان کے ساحلی علاقوں کی نم اور ہلکی مٹی کو جوتنے کے لیے سخت اور مضبوط لکڑی سے بنے ہلوں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مغلیہ ہند میں مٹی اور آب و ہوا کی نوعیت کے لحاظ سے عمومیت سے دو قسم کے ہل استعمال کئے جاتے تھے۔ ایک ہلکے اور دوسرا وزنی۔ ہلکے ہلوں میں لوہے کی میخ یا

پھال کا استعمال نہیں ہوتا تھا اور ان کا استعمال ہلکی اور بلواہی مٹی کی جتائی کے لیے کیا جاتا تھا۔ وزنی ہلوں میں لوہے کی مضبوط پھال کا استعمال ہوتا تھا اور ایسے ہلوں کا استعمال خشک اور سخت مٹی والے علاقوں میں کیا جاتا تھا۔

9.5.2 بیل (Oxen)

ہلوں کو کھینچنے کے لیے بیلوں کا استعمال کیا جاتا تھا جو مختلف نسل اور قد و قامت کے ہوتے تھے۔ ہلوں کو کھینچنے کے معاملے میں ہندوستانی بیل عمومیت سے یوروپی بیلوں کے مقابلے زیادہ کارگر تھے۔ کیونکہ ہندوستانی ہل جہاں بیلوں کے کوہاں (گردن کے اوپر کا کوبڑ) میں پھنسا کر کھینچے جاتے تھے وہیں یورپی ہل بیلوں کی سینگ میں باندھ کر کھینچے جاتے تھے۔ یوروپی سیاح ٹریور نیئر کے مطابق ہندوستان میں پائے جانے والے بیل یوروپ کے بیلوں کے مقابلے ہل کھینچنے کی صلاحیت میں اپنے مخصوص کوہان کی وجہ سے برتر تھے۔ اور غالباً اسی وجہ سے عرفان حبیب کا خیال ہے کہ ''یہ ایک حقیقت ہے کہ مغل عہد کی زراعت کئی معنوں میں دور جدید کے معیار کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ تھی''۔

9.5.3 پاٹا اور دیگر چھوٹے اوزار (*Pata* and other Petty Tools)

ہل کے ذریعے کھیتوں کی جتائی کے بعد مٹی کے بڑے بڑے ڈلوں یا ڈھیلوں کو توڑنے کے لیے لکڑی کے چوکور بھاری لٹھے جس کو پاٹا، پٹیلہ، چوکی یا بینگہ کہا جاتا تھا، کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے بھی بیلوں کی مدد سے کھینچا جاتا تھا۔ دو بیلوں کی جوڑی کے کندھو پر پالو (لکڑی کا کم وزنی لٹھا) ڈال دیا جاتا تھا اور اس کے دونوں سروں کو مضبوط رسی کی مدد سے پائے کے دونوں کناروں سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ پھر بیلوں کو ہنکایا جاتا تھا۔ بیلوں کے پیچھے یہ پاٹا بھی گھسٹتا جاتا تھا اور اس کے وزن سے مٹی کے موٹے اور بڑے بڑے ڈلے ٹوٹتے جاتے تھے۔ اکثر پاٹے کا وزن بڑھانے کے لیے کسان خود اس کے اوپر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس طرح دو تین چکر میں کھیت کی مٹی ہلکی اور ہموار ہو جاتی تھی۔ کھیتی میں استعمال ہونے والے کچھ چھوٹے مگر اہم اوزار اکثر لوہے اور لکڑی یا دونوں کے اتصال سے بنائے جاتے تھے۔ ان میں کدال پاپھاوڑا جو خشک مٹی پلٹنے، مینڈھ اور نالیاں بنانے کے لیے، کھرپا یا کھرپی نکونی کے لئے، ہنسیا یا ہنسوا فصلوں کی کٹائی کے لیے، میخ پا سبل بیج بونے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ ان اوزاروں کے پھل لوہے کے اور مٹھ یا دستہ لکڑی کا ہوتا تھا۔ ان اوزاروں کو تیار کرنے اور مرمت کے لیے مغلیہ ہند کے بڑھئی اور لوہاروں کی مناسب تعداد موجود رہتی تھی۔

9.6 بیج کی بوائی (Sowing the Seed)

بیج کی بوائی عام طور پر بیج کو ہاتھ سے بکھیر کر کی جاتی تھی لیکن ڈریل (drill) اور ڈبلنگ (dibbling) کا طریقہ بھی بہت سے علاقوں میں عام تھا۔ اسکی تائید ابتدائی سترہویں صدی میں امانت اللہ حسینی، اٹھارہویں صدی میں باربوسا اور انیسویں صدی میں ایلفنسٹن کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ اس طریقے میں ایک کھوکھلی میخ یا سبّل زمین میں پیوست کی جاتی تھی اور اس کے سوراخ سے محدود تعداد میں بیج ڈالدی جاتی تھی۔ اسکا فائدہ یہ تھا کہ بیج کو مخصوص دوری اور تعداد کے تسلسل کیساتھ بونے کی سہولت تھی جسکی وجہ سے اُگنے والے پودوں کو

مناسب مقدار میں دھوپ ہوااور جگہ مل جاتی تھی جس سے انکی نمو و ترقی بہتر ہوتی تھی۔اس ترکیب کااستعمال خاص طور پر کپاس کی کھیتی میں کیاجاتا تھا۔

9.6.1 کھاد (Fertiliser)

مٹی کی زرخیزی کو برقرار رکھنےاوراس میں اضافے کے لیے کھیتوں میں مختلف قسم کی کھادوں کااستعمال ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے ہوتاآرہاہے۔ارتھ شاستر میں گوبر، جانوروں کی ہڈیوں، ہری پتیوں اور مچھلیوں سے تیار شدہ کھادوں کے استعمال کاتذکرہ ملتاہے۔اس بنیاد پر یہ اندازہ لگانامشکل نہیں کہ مغلیہ ھند میں بھی اسی قسم کی کھادوں کااستعمال زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لیے کیاجاتاہوگا۔ جسکی تائید مختلف حقائق سے بھی ہوتی ہے۔خاص طور پر مویشیوں کے گوبر کھیتوں کی زرخیزی کو بنائے رکھنے کے لیے استعمال کیاجاتاتھا۔راجستھانی ماخذوں سے اس طرح کے حوالے ملتے ہیں کہ بھیڑ، بکریوں کے جھنڈ کو کچھ راتوں تک کھیتوں میں چھوڑ دیاجاتاتھا جس سے اچھی مقدار میں کھاد حاصل ہو جاتی تھی۔ایل۔اے۔اولیو کے مطابق ایک کنی (132 ایکڑ) زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھنے کے لیے تقریباًایک ہزار بھیڑ بکریوں کے جھنڈ کو پانچ سے سات راتیں گذارناکافی ہوتی تھی۔اسکی وجہ سے زمین کی زرخیزی چھ سات سالوں تک برقرار رہتی تھی۔اس طریقے میں اکثر مویشی پالک کاشتکاروں سے زیادہ رقم کامطالبہ کرتے تھے لہٰذا یہ طریقہ چھوٹےاور کمزور طبقے کے کاشتکاروں کے لیے ناقابل برداشت ہوتاتھا۔ دکن اور جنوبی ھند کے نم اور کالی مٹی کے علاقوں میں کھاد کی ضرورت کم ہی پڑتی تھی جبکہ لال اور بھوری مٹی والے علاقوں میں کھاد کی ضرورت زیادہ ہوتی تھی۔اس کے علاوہ ساحلی علاقوں جیسے گجرات میں گنےاور کونکن میں ناریل کی کھیتی کے لیے مچھلی کی کھاد کاخاص طور پر استعمال ہوتاتھا۔

کھیتوں میں کھادڈالنے کاطریقہ بھی اہمیت کاحامل تھا۔ مٹیاور فصلوں کی نوعیت کے لحاظ سے ہی کھاد کی قسماور مقدار کاتعین کیاجاتا تھا۔ عمومیت سے کھیتوں میں کھادڈالنے کے دو طریقے رائج تھے۔اول یہ کہ کھاداور بیج کوایک ساتھ ہی ملاکر بوائی کی جاتی تھی تاکہ بیج سے پودوں کی پیدائش بہتر ہو۔ دوئم کھیتوں میں بیج ڈالنےاوراس کے پھوٹنے کے بعد کھادڈالی جاتی تھی۔اس کے علاوہ سالوں بھر کھیت کے زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اسکی زرخیزی برقرار رکھنے کے لیے فصلوں کی ادلابدلی(crop rotation)کا بھی طریقہ رائج تھا۔ زراعت کے میدان میں ہندوستانی کاشتکاروں نے نسلوں کے تجربے سے فصلوں کی ادلابدلی کے ذریعہ مٹی کی زرخیزی بحال رکھنے کے تعلق سے بہتر علم حاصل کرلیاتھا۔انھیں اس بات کابخوبی علم تھاکہ کس فصل کے بعد کون سی فصل اگائی جائے جس سے زمین کی قوت پیداوار برقرار رہے۔ لہٰذافرہنگ یاسین کے مطابق بنگال میں ڈنکا-ٹنکاقسم کی زمین میں سلسلہ سے چاول (دھان)، تمباکواور کپاس کی کاشت کی جاتی تھی۔

9.6.2 فصلوں کی حفاظت (The Protection of Crops)

مغل عہد کے کھیت جیساکہ عرفان حبیب بھی تائید کرتے ہیں، عام طور پر ویسے ہی تھے جیسے آج نظر آتے ہیں۔ جو کھیت آبادی سے

قریب ہوتے تھے اُن کے چاروں طرف حفاظت کے خیال سے مینڈ یا کانٹے دار پودوں کی باڑ لگائی جاتی تھی لیکن آبادی سے دور کے کھیتوں کی مینڈھ یا بار نہیں ہوتے تھے۔ جب کہ یوروپی سیاح ٹیری (Terry) اپنی تصنیف ''ارلی ٹریویلس'' میں بیان کرتا ہے کہ ہندوستانی ''کھیتوں کی گھیرابندی نہیں کی جاتی تھی جب تک کہ یہ گاؤں یا شہر کے قریب نہ ہوں''۔ عہد مغلیہ کے ماخذوں سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ کھیتوں میں کیڑے مار اشیاء کا استعمال کتنا اور کیسے ہوتا تھا تاہم اس حقیقت کے پیش نظر کہ زمانہ قدیم سے ہی کیڑوں اور چوہوں سے فصلوں کی حفاظت کے لیے کچھ طریقے استعمال کئے جاتے رہے ہیں، مغل عہد میں بھی انکا استعمال جاری رہا ہوگا۔ عام طور پر فصلوں کو کیڑوں سے بچانے کے لیے کچھ خاص قسم کے پیڑوں اور پودوں کی پتیوں اور گوبر کے کنڈے کی راکھ کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ فصلوں کو چڑیوں سے بچانے کے لیے کھیتوں میں انسانی ڈھانچوں کے جیسے پتلوں کو کھڑا کرنے کا رواج عام تھا۔

9.6.3 فصلوں کی کٹائی اور تیاری (Harvesting and the Preparation of Crops)

کھیتوں میں بیج بونے کے فوراً بعد کھیت کی سطح کو ہموار کرنے اور بیجوں کو اچھی طرح مٹی سے ڈھکنے کی غرض سے لکڑی کے چوکور لٹھے جسے پٹیلہ یا پاٹا کہتے تھے، کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے کھینچنے کے لیے بھی بیلوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ پنجاب میں اس اوزار کو سہاگ کہا جاتا تھا۔ بیج سے انکور نکلنے کے بعد پودوں کے تھوڑا بڑا ہونے پر ان کی نکونی کا عمل انجام دیا جاتا تھا۔ یہ کام کھرپی یا کھرپا نام کے چھوٹے اوزار سے کیا جاتا تھا۔ اس کام میں پودوں کی جڑوں کے پاس کی مٹی کو احتیاط کے ساتھ کھود کر ہلکا کر دیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی کھیتوں میں فصلوں کے پودے کے ساتھ اُگ جانے والے انچاہے گھاس پھوس کو بھی اکھاڑ کر باہر کر دیا جاتا تھا۔ عام طور پر نکونی کا عمل فصلوں کی تیاری کی ابتدا میں دو بار انجام دیا جاتا تھا۔ ربیع کی فصلیں عام طور پر مصنوعی آبپاشی پر منحصر ہوتی تھیں لہٰذا اُن میں دو سے تین بار آبپاشی کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔ فصل کے پک جانے پر انہیں کاٹ کر کھیتوں سے باہر لا کر اُن سے اناج الگ کرنیکا کام کیا جاتا تھا۔ فصلوں کے پکے اور سوکھے پودوں کو مخصوص انداز میں ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر یا مویشیوں کی قطار اُن کے اوپر لگاتار کچھ وقت تک چلا کر اناج الگ کئے جاتے تھے۔ یہ روایتی طریقہ ہندوستان کے تمام علاقوں میں یکساں طور پر رائج تھا۔

9.7 آبپاشی کے ذرائع (Sources of Irrigation)

تاریخی طور پر ہندوستانی زراعت عمومیت سے بارش پر منحصر رہی ہے۔ شمالی ہندوستان میں جہاں خریف کی فصلیں عام طور پر مانسون (بارش) پر منحصر تھیں وہیں ربیع کی فصلیں اکثر مصنوعی طریقہ آبپاشی پر۔ بابر نے اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہندوستان میں زیادہ تر فصلیں بارش اور مصنوعی آبپاشی پر منحصر تھیں آب رواں یا بہتے پانی (ندی اور نہروں) کی کمیابی پر مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ وہیں زین الدین خواف نے آبپاشی کے مقصد سے ندیوں سے نکالی گئی نہروں کی موجودگی پر روشنی ڈالی ہے۔ آئین میں کئی محال اور گاؤں کا تذکرہ ملتا ہے جو ندیوں کے کنارے آباد تھے اور اپنی گھریلو اور زراعت کی آبی ضرورتیں انہیں ندیوں سے پورا کرتے تھے۔ بہر کیف اس سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ مغل عہد میں بارش کے علاوہ آبپاشی کے اور بھی کئی طریقے رائج تھے۔ مصنوعی طریقہ آبپاشی کی مغل حکمرانوں نے فصلوں کی بہتر پیداوار کے مد نظر خاطر

خواہ حوصلہ افزائی کی تھی۔

9.7.1 کنواں (Wells)

آبپاشی کے نہایت عام طریقوں میں کنوئوں کا مقام اہم تھا اور اس کا استعمال مغلیہ ہند کے بیشتر علاقوں میں وسیع پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ بابر لاہور اور دیپالپور میں ایرانی رہٹ (Persian Wheel) اور جمنا کے مشرقی علاقوں میں دیسی چرس کے ذریعہ آبپاشی کا تذکرہ کرتا ہے۔ چرس چمڑے کا ایک بڑا تھیلا ہوتا تھا جو گجرات میں 'کوسا' کے نام سے پکارا جاتا تھا، جس کا استعمال کنویں سے پانی نکالنے کے علاوہ ندیوں کے کنارے پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ رَسک داس کو جاری فرمان میں اورنگ زیب نے اس بات پر بھی زور دیا کہ غیر استعمال کنوئوں کی مرمت کی جائے اور نئے کنویں بھی کھدوائے جائیں تاکہ کاشت کاری کو فروغ ملے اور جنس کامل (اعلیٰ قسم کی فصل) کی پیداوار بہتر ہو۔ مسنوت نینسی نے بھی وِگت میں آبپاشی کے لئے استعمال ہونے والے کنوئوں کا ذکر کیا ہے۔

کنویں دو قسم کے ہوتے تھے۔ پختہ کنویں اور کچے کنویں۔ پختہ کنویں پکی اینٹوں یا پتھروں کی دیوار تعمیر کر کے بنائے جاتے تھے۔ اِن کنوئوں کی گہرائی زیادہ ہوتی تھی جس کی وجہ سے اُن میں سالوں بھر پانی موجود رہتا تھا۔ پختہ کنوئوں میں سے بعض بعض میں دیوار کے ساتھ سیڑھیاں بھی تعمیر کر دی جاتی تھیں جس کے ذریعہ کنویں کے اندر پانی کی سطح تک پہونچنا ممکن ہو جاتا تھا۔ ایسے زینے دار کنویں کو باولی کہا جاتا تھا۔ پختہ کنویں کی تعمیر ایک خرچیلا کام تھا جس کی وجہ سے اس کی تعمیر آسان نہیں تھا۔ حکومت کی مدد یا کاشتکاروں کی اجتماعی حصے داری سے ہی ایسے پختہ کنوئوں کی تعمیر ممکن ہو پاتی تھی۔ بابر نے اپنی سوانح میں ذکر کیا ہے کہ اُس نے آگرہ کے قلعے میں ایک زینے دار کنواں تعمیر کروایا تھا۔ اس کنوے کی تجدید کاری کا کام اکبر کے زمانے میں کیا گیا تھا۔ شمالی ہند کے میدانی علاقوں میں آب پاشی کے لئے عام طور پر کچے کنویں کھودے جاتے تھے جو ایک دو موسم سے زیادہ استعمال نہیں ہو پاتے تھے کچے کنوئوں کی گہرائی کم ہوتی تھی جس کی وجہ سے اس میں پانی کی مقدار زیادہ نہیں رہتی تھی۔ دونوں قسم کے کنوئوں کے کھودنے میں اخراجات کا جتنا بڑا فرق تھا اسی تناسب میں ان کی تعداد میں بھی فرق نظر آتا تھا۔ 1660ء میں راجستھان کے میڑتا پرگنے کے چھ ہزار کنوؤں میں سے صرف بیس کنویں پختہ تھے۔ سترھویں صدی کے اواخر میں مشرقی راجستھان کے اٹھارہ گاؤوں کے 528 کنوؤں میں سے صرف اکتالیس کنویں ہی پختہ تھے۔ کنوئوں اور دیگر آبی ذخریے سے پانی نکال کر کھیتوں تک پہونچانے کے لیے کئی طریقے رائج تھے۔

1. کنوؤں سے پانی نکالنے کا سب سے عام اور روایتی طریقہ رسی اور ڈول کے استعمال کا تھا۔ ایک چھوٹے ڈول کو لمبی رسی میں باندھ کر کنویں میں ٹکایا جاتا تھا یہاں تک کہ وہ پانی کی سطح تک پہونچ کر اسمیں ڈوب جائے پھر رسی کو آہستہ آہستہ باہر کی طرف کھینچ لیتے تھے یہاں تک کہ پانی سے بھرا ڈول ہاتھوں تک آجاتا تھا۔ اس طرح سے پانی نکالنے کی رفتار نہایت سست ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ طریقہ بڑے کھیتوں کی آبپاشی کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس طریقے سے بہت ہی چھوٹے کھیتوں کی آبپاشی اور گھریلو ضرورت ہی پوری ہوتی تھی۔
2. مذکورہ بالا طریقے میں جب ایک چرخی کا اضافہ ہو جاتا تھا تب کم توانائی کے استعمال سے پانی نکالنے کی رفتار بڑھ جاتی تھی۔ اس طریقے میں کنویں کی منڈیر پر ایک چرخی (Pully) اس طرح نصب کی جاتی تھی کہ ڈول میں بندھی رسی چرخی کے اوپر سے گذرتی ہوئی پانی

بھرنے والے شخص کے ہاتھ تک آجاتی تھی اور ڈول اس رسّی کے دوسرے سرے سے بندھا ہوا کنویں کے اندر لٹکا ہوتا تھا۔ چرخی کے استعمال سے پانی نکالنے والے شخص کو کم محنت کرنا پڑتی تھی۔ دوسرے اس طریقے میں ڈول کا سائز بڑھ جاتا تھا اور پانی نکالنے کی رفتار بھی بڑھ جاتی تھی۔ لیکن یہ طریقہ بھی چھوٹے کھیتوں کی آبپاشی کے لئے موزوں تھا۔

3. اوپر بیان کئے گئے طریقے میں جب رسی کو کھینچنے کا کام انسان کی جگہ بیل کرنے لگتے تھے تو ڈول کا سائز اور بڑا ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے پانی نکالنے کی رفتار اور بڑھ جاتی تھی۔ حیوانی توانائی کے استعمال سے اب درمیانے سائز کے کھیتوں کی آبپاشی ممکن ہو سکی تھی۔ اس طریقے میں لوہے کے ڈول کی جگہ چرمی ڈول جیسے چرس بھی کہتے تھے، کا استعمال ہوتا تھا۔

4. ایسے کنویں جن میں پانی کی سطح اونچی ہوتی تھی یا ایسے آبی ذخیرے جن میں پانی کی سطح کھیت سے زیادہ گہری نہیں ہوتی تھی، سے پانی نکالنے کا طریقہ لیور کے اصول پر مبنی تھا۔ اس میں ڈھینکلی کا استعمال کیا جاتا تھا۔

5. پانچویں طریقہ آبپاشی میں ایک پہیے کا استعمال ہوتا تھا جس کے کنارے (ریم) پر اسطوانی (Cylindrical) برتن جڑے ہوتے تھے۔ یہ پہیہ ایک دھوری سے جُڑا ہوتا تھا جس کو گھمانے کے لئے حیوانی توانائی کا استعمال ہوتا تھا۔ اس تکنیک میں پہیے کو عمودی طور پر ایک افقی دھوری سے جوڑ دیا جاتا تھا اور اس دھوری کو استحکام دینے کے لئے اس کو کسی مضبوط کھمبے سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ اس ڈھانچے کو تالاب، ندی یا جہاں پانی کی سطح کھیت کی سطح کے قریب ہوتی تھی کچھ اس طرح نصب کیا جاتا تھا کہ پہیئے کا نچلا حصہ ہمیشہ پانی کی سطح کے اندر رہے۔ جب دھوری کو حیوانی توانائی کے ذریعہ گردش دی جاتی تھی تو نتیجے میں پہیہ بھی ایک سمت میں گردش کرتا تھا اور پانی اسطوانی ڈبوں میں بھر بھر کر نالیوں میں خالی ہونے لگتا تھا۔ یہ طریقہ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ یہ صرف وہاں کامیاب تھا جہاں پانی کی سطح کھیت کی سطح کے قریب ہوتی تھی۔

6. کنویں اور گہری سطح سے پانی نکالنے کا سب سے پیچیدہ مگر معروف طریقہ ایرانی رہٹ یا ساقیہ (Persian Wheel) تھا۔ یہ مشین پن ڈرم گیئرنگ (Pin-drum gearing) کے اصول پر کام کرتی تھی۔ مغل عہد میں لاہور، دیپالپور اور سرہند میں اس کا وسیع پیمانے پر استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستان میں ایرانی رہٹ کی آمد تیرہویں یا چودھویں صدی میں مانی جاتی ہے۔ لیکن اسکا تفصیلی تذکرہ سولہویں صدی میں بابر کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ شروع شروع میں لکڑی کی اس مشین پر صرف دولتمند کاشتکاروں کا ہی قبضہ رہا لیکن رفتہ رفتہ ایک صدی آخر تک یہ عام کسانوں کی پہونچ میں آگیا تھا۔ رہٹ کے ذریعے پانی نکالنے کا عمل یہ تھا کہ کنویں کی گہرائی کے مطابق ایک بیلٹ پر بہت سے مٹی کے گھڑے ایک سمت میں باندھ دیئے جاتے تھے۔ اس برتن لگے بیلٹ کو اس چرخی یا پہیے پر چڑھا کر کنویں کے اندر لٹکا دیا جاتا تھا اور اس پہیئے کو ایک دھوری (Axle) کے ذریعے ایک عمودی گیئر سے جوڑا جاتا تھا اور اس گیئر کو ایک دوسری افقی گیئر سے اس طرح منسلک کیا جاتا تھا کہ دونوں کے دانت ایک دوسرے میں پھنس جائیں۔ یہ افقی گیئر ایک دوسرے عمودی دھوری سے جڑے ہوتے تھے اس عمودی دھوری کو بیل کے ذریعہ گھمایا جاتا تھا جس کے نتیجہ میں کنویں کے اوپر لگا ہوا پہیہ بھی گردش کرنے لگتا تھا اور ساتھ میں بیلٹ سے جڑے برتنوں میں پانی بھر بھر اوپر آنے لگتا تھا۔ اس پانی کو کنویں کی اوپری سطح پر لگے کھٹوتے میں گرایا جاتا تھا جو کنویں کے باہر بنی نالی کے ذریعہ کھیتوں تک پہونچتا تھا۔ آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والی اس اہم مشین نے آبپاشی کے امکانات

میں زبردست اضافہ کر دیا تھا۔ رہٹ کے استعمال سے بڑے کھیتوں کی آبپاشی آسان ہو گئی تھی۔

ابوالفضل جو مغل عہد کی زرعی سرگرمیوں پر تفصیلی معلومات فراہم کرتا ہے حیرت انگیز طور پر مصنوعی آبپاشی کے موضوع پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہے کہ ''لاہور صوبے میں کھیتوں کی آبپاشی کے لیے بڑے پیمانے پر کنویں کا استعمال کیا جاتا تھا'' جس کی تصدیق قریب کی ایک صدی بعد سجان رائے، بھنڈاری جو خود لاہور کا باشندہ تھا کرتا ہے۔

9.7.2 باندہ، تالاب، جھیل اور دیگر آبی ذخائر (Dams, Ponds, Lakes and Other Water Bodies)

آبپاشی کے لیے بارش کے علاوہ عمومیت سے باندھ، جھیل، تالاب اور دیگر آبی ذخائر کا استعمال تقریباً پورے مغلیہ ہند اور جنوبی ہند میں یکساں طور پر کیا جاتا تھا جس کی تائید و تصدیق بابر اور زین الدین خواف کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ جنوبی ہند میں یہ آبی ذخائر آبپاشی کا سب سے وسیع اور معروف طریقہ تھا۔ یہاں ندیوں کے اوپر باندھ یا پشتہ بنا کر ڈیم بنائی گئیں تھیں۔ کیونکہ باندھوں یا ڈیموں کی تعمیر کے لئے بڑی مقدار میں رقم کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا انفرادی سطح پر اس کی تعمیر ممکن نہیں تھی۔ لہٰذا یہ حکومت کی ذمہ داری تھی کہ زرعی خوشحالی کے لیے مناسب مقامات پر ڈیم کی تعمیر کرے۔ اس سلسلہ میں آثار قدیمہ کے باقیات جنوبی ہند میں بڑے ڈیموں کی موجودگی کی تصدیق کرتے ہیں۔ وجے نگر کے حکمرانوں کے ذریعے پندرہویں سولہویں صدی میں تعمیر کردہ مڈگ جھیل پر ڈیم کے باقیات کا مطالعہ اُس زمانے کی تعمیراتی انجینئرنگ کا بہت ہی دلکش نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ ڈیم تنگ بھدر ندی (Tungabhadra) پر مٹی کے تین بڑے باندھ بنا کر تیار کیا گیا تھا۔ ہر باندھ میں یہ بڑے بڑے تراشیدہ پتھروں کے موری بند پھاٹک (Sluice gate) لگائے گئے تھے۔ جن کے ذریعہ ضرورت کے مطابق پانی بہانے کا نظم تھا۔ پانی سے پوری طرح بھر جانے پر اس کے دائرے کی طوالت قریب پندرہ میل ہو جاتی تھی۔ مغلیہ دور میں تعمیر شدہ یہ ڈیم نہ تو اپنے آپ میں اکلوتی تھی نہ صرف جنوبی ہند میں موجود تھی بلکہ مغلیہ ھند کے اور بھی دیگر علاقوں میں ایسے ڈیموں کی موجودگی دیکھی جاسکتی ہے۔ شمالی ہند میں اور خصوصیت سے راجستھان میں زرعی استعمال کے لیے تعمیر شدہ چھوٹی بڑی جھیلوں اور ان کے مہانوں پر بنے ڈیم کی موجودگی کے وافر شواہدات موجود ہیں۔ اِن میں آئین کے مطابق میواڑ کی دھیبر جھیل، اُودئے ساگر، راج ساگر یا راج سمند اور جئے سمند جیسی جھیلوں کی تعمیر سولہویں صدی کے اواخر سے سترہویں صدی کے وسط تک ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ماڑواڑ میں بلسان جھیل اور آمیر میں مان ساگر کی تعمیر بھی کی گئی تھی۔ ان میں سے بعض جھیلیں تاحال موجود ہیں۔

شمالی ہند میں سیلاب اور بارش کے پانی کو بہتر طریقے سے زرعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے باندھوں کا استعمال بہت ہی کارگر طریقہ تھا۔ اتر پردیش کے چندیل حکمرانوں کے ذریعہ تعمیر کردہ باندھوں کے ذریعہ چندریر بھاندی سے بہہ کر آنے والے سیلابی پانی کو اکٹھا کر کے خشکی اور گرم موسم میں کھیتوں کی آبپاشی کے لیے کارگر طریقے سے کیا جاتا تھا۔ یہ باندھ انسویں صدی کے اواخر تک موجود رہے۔ کھڑگپور کے حکمراں بہروز سنگھ نے سترہویں صدی کے وسط میں کھڑگپور کے جنوب مغرب میں بھیم باندھ کو تعمیر کرایا تھا جن کے ذریعہ پہاڑیوں سے نیچے آنے والے بارش کے پانی کا بہت ہی مہارت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ راجا بہروز نے بارش کے پانی کی تقسیم کا بہت ہی دلچسپ اور کارآمد

منصوبہ تیار کیا تھا۔ باندھ سے پانی نکال کر کھیتوں تک پہونچانے کے لئے اونچے اونچے چبوترے پر بڑی بڑی نالیاں بنوائی تھیں اور پانی کی اس طرح تقسیم کی گئی تھی کہ پورے سال کھیتوں تک پانی کی رسد بنی رہے۔ راجا بہروز نے کھڑگپور پہاڑیوں کے مشرق سمت میں اس طرح کا ایک آبی ذخیرہ ''راجارانی'' کے نام سے بنوایا تھا۔ ان آبی ذخائر میں سالوں بھر پانی موجود رہتا تھا جن سے بہت بڑے علاقے کے کھیتوں کی مناسب طور پر آبپاشی ہوتی تھی۔

مغل عہد میں خصوصیت سے جزیرہ نماہند (Indian Peninsula) کے تقریباً ہر گاؤں میں چھوٹے بڑے آب ذخریرے اور تالابوں کی موجودگی درج کی گئی ہے جس میں بارش کا پانی جمع ہوا کرتا تھا اور اسی پانی کا استعمال زرعی آبپاشی کے لئے کیا جاتا تھا۔ ان میں سے اکثر تالابوں کی کھدائی اور دیکھ ریکھ اجتماعی طور پر علاقے کے کاشتکاروں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ عصری ماخذوں کے مطابق شاہ جہاں کے عہد حکومت میں خاندیس اور برار کے کاشتکاروں کو آبپاشی کے لیے آبی ذخیروں کی تعمیر کے لیے چالیس پچاس ہزار روپیہ تک کی رقم فراہم کرنے کی پیش کش کی گئی تھی۔ اور یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ آج بھی خاندیس کے علاقے میں چھوٹی چھوٹی ڈیم اور دیگر آبی ذخائر کا ایک وسیع نیٹ ورک موجود ہے جو وہاں کی پانچ ندیوں (موسام، کین، پنجبرا، گیرنا اور شیوان) کی وادیوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تال تالاب اور دیگر چھوٹے آبی ذخائر مغلیہ ہند کی زرعی زندگی کا اہم حصہ تھے۔ ٹیورنیئر (Tavernier) کے بیان کے مطابق گولکنڈہ کی زراعت اسلئے ممکن ہو سکی تھی کہ وہاں بڑی تعداد میں تالاب موجود تھے۔

9.7.3 ندی اور نہریں (The Rivers and Canals)

شمالی ہند قدرتی طور پر ہمالیائی ندیوں کی موجودگی کی وجہ سے زراعت کے لیے پانی کی وافر دستیابی کے معاملے میں خوش قسمت رہا ہے۔ ایک طرف جہاں دریائے سندھ، بیاس، ستلج، راوی اور چناب شمال مغربی ہند کے لیے خوشحالی کی ضامن تھیں وہیں گنگا، جمنا، سریو، گھاگھرا، گنڈک، برہمپتر اور کوسی شمالی اور شمال مشرقی خطے کے لیے خوش بختی کی علامت تھیں۔ ان ندیوں کی سالانہ طغیانی اور سیلاب کی وجہ شمالی ہند کی زرعی سرگرمیوں میں کچھ پریشانیاں ہوتی تھی وہیں بڑا فائدہ یہ تھا کہ زرعی آبپاشی کے لئے بڑی مقدار میں نہ صرف پانی دستیاب ہو جاتا تھا بلکہ سیلاب کی وجہ سے کھیتوں میں نئی مٹی (گادھ) کی پرت جمع ہو جاتی تھی جو مٹی کی زرخیزی کے لیے قدرتی کھاد کا کام کرتی تھی۔

ندیوں کی اتنی بڑی تعداد کے باوجود یہ ممکن نہیں تھا کہ پورے شمالی ہند کی زرعی آبپاشی مکمل طور پر انھیں ندیوں سے ہو جائے۔ لہٰذا زمانہ قدیم سے ہی یہاں نہروں کی کھدائی اور اسکی دیکھ ریکھ کا سلسلہ پایا جاتا رہا ہے۔ عہد وسطی میں چودھویں صدی میں محمد بن تغلق نے بڑی ندیوں سے نہریں نکالنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جو فیروز تغلق کے عہد میں اپنے کمال کو پہونچ چکا تھا۔ لہٰذا مغل عہد تک آتے آتے شمالی ہند میں طویل نہروں کی موجودگی پائی جاتی ہے جو یا تو کھودی گئی تھی یا قدیم نہروں کی تجدید کاری کی گئی تھی۔ ابوالفضل کے مطابق فیروز تغلق کے وقت کی نہروں کی تجدید کاری اکبر کے عہد میں دو بار 1560ء اور 1570ء میں کی گئی تھی۔ شاہجہاں کے دور حکومت میں مشرقی جمنا نہر اور نہر بہشت یا نہر فیض کھودی گئی تھی جو نہ صرف شاہجہاں کے نوآباد شہر دارالحکومت شاہجہاں آباد کو پانی فراہم کرتی تھیں بلکہ تقریباً اسی میل

کی طوالت میں بہت بڑے علاقے کی زراعت کی معاونت کرتی تھیں۔ مغل دستاویزات سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ حکومت نہروں کے ذریعہ زرعی آبپاشی کے لیے پانی کی فراہمی کے سلسلے میں کافی سنجیدہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس سے متعلق باضابطہ محکمے تشکیل دیئے گئے تھے۔ جس کا افسر اعلیٰ ''میر بہر'' یا ''میر آب'' کہلاتا تھا۔ لہٰذا ملتان سرکار سے متعلق ایک شاہی فرمان کے مطابق وہاں ایک ''میر آب'' کی تقرری کا عمل انجام دیئے جانے کا حوالہ ملتا ہے جس میں اس منصب پر فائز ہونے والے افسر کے فرائض میں نئی نہریں کھدوانا، قدیم نہروں کی صفائی اور تجدید کاری، سیل بند تعمیر کروانے اور کاشتکاروں کے درمیان حسب ضرورت پانی کی تقسیم کے عمل کی نگہداشت کرنا تھی۔

اس طرح مغل عہد میں آبپاشی اور گھریلو استعمال کے لیے پانی کی فراہمی کی غرض سے بہت بڑے علاقے میں نہروں کا جال تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اِن نہروں کی ایک کمی تھی جسکی طرف عرفان حبیب نے اشارہ بھی کیا ہے کہ ''یہ نہریں میدانی علاقوں کی سطح سے اوپر نہیں اُٹھ پائی تھیں جسکی وجہ سے اُن سے آبپاشی کے لیے پانی نکالنے کے لیے مختلف ذرائع کا انتظام و استعمال کرنا پڑتا تھا۔ نتیجے میں اِن سے دستیاب ہونے والے پانی کا زرعی استعمال بھی محدود ہو جاتا تھا''۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے رُو گردانی ممکن نہیں کہ مغل عہد میں نہروں نے زرعی پیداوار کے اضافے کو یقینی بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

9.8 فصلیں (Crops)

ہندوستان کو اپنی وسیع تر زرخیز زمین، مختلف قسم کی مٹی، آبپاشی کے قدرتی اور مصنوعی وسائل کی دستیابی، موافق آب و ہوا اور موسموں کی وجہ سے کثیر تعداد میں زرعی اجناس اور فصلوں کی پیداوار کے معاملے میں ہمیشہ امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔ آئین اکبری کے مطابق مغل عہد میں صوبہ آگرہ کے تقریباً تمام محصولاتی حدود (Revenue Circles) میں ربیع کے موسم میں سولہ اور خریف میں پچیس اجناس کی پیداوار ہوتی تھی۔ ان میں سے محض ایک یا دو فصل ایسی تھی جو تمام محصولاتی حدود میں نہیں اگائی جاتی تھی۔ اس طرح صوبۂ آگرہ میں موٹے طور پر دونوں موسموں میں مجموعی طور پر کم از کم اکتالیس (41) فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ صوبۂ دہلی میں ربیع کے موسم میں سترہ (17) اور خریف میں چھبیس (26) اجناس کی پیداوار ہوتی تھی۔ یعنی سال بھر میں قریب تینتالیس (43) اجناس کی فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ اسی طرح گجرات، سندھ، راجستھان، اودھ، بہار، بنگال اور آسام صوبہ جات میں دونوں موسموں میں اگائی جانے والی فصلوں کی تعداد اوسطاً چالیس تھی۔ لہٰذا بقول عرفان حبیب ''مغل عہد کے کاشت کار زرعی علم و ہنر میں اتنے ماہر تھے کہ وہ گرم اور مرطوب آب و ہوا والے علاقے میں کثیر تعداد میں زرعی اجناس کی پیداوار کو ممکن بنا سکے''۔

9.8.1 غذائی فصلیں (Food Crops)

مغل عہد میں اُگائی جانے والی فصلوں کو انکی نوعیت کے لحاظ سے موٹے طور پر تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ غذائی فصلیں، نقدی فصلیں اور پھل سبزی، مسالے وغیرہ۔ غذائی اجناس کی پیداوار کے معاملے میں مغلیہ ہند کی علاقائی تقسیم چاول (دھان) اور گندم-جوار کی علاقہ وار پیداوار کی بنیاد پر ویسے ہی تھی جیسی کہ موجودہ دور میں ہے۔ آسام کی وادیوں سے لیکر بنگال، اڑیسہ مشرقی ساحلی پٹی، تمل علاقے۔

مغربی ساحلی علاقے اور کشمیر میں اہمیت کے ساتھ بڑی مقدار میں دھان کی پیداوار ہوتی تھی جبکہ بہار، الٰہ آباد، اودھ اور خاندیش کے علاقوں میں دھان کی پیداوار ہوتی تو تھی لیکن اس فصل کو دوسری فصلوں پر برتری حاصل نہیں تھی۔ دھان کی فصل گجرات میں اور خاص طور پر جنوبی ساحلی علاقوں میں اچھی ہوتی تھی یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی کے ایک مصنف کا دعوی ہے کہ ''ان علاقوں میں چاول کی معیاری قیمتوں کی پیداوار میں گزشتہ ادوار کے مقابلے کافی ترقی ہوئی ہے''۔ شمال مغربی خطے کے خشک علاقوں میں بھی چاول کی پیداوار ویسے ہی ہوتی تھی جیسا کہ دور حاضر میں۔ دریائے سندھ اور اس کی معاون ندیوں نے چاول کی کاشت کے لیے صوبہ سندھ میں کافی موافق حالات پیدا کر دئے تھے جس کی وجہ سے چاول وہاں مخصوص جنس کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ صوبۂ لاہور میں چاول کی بہت ہی معیاری قسموں کی پیداوار نے اس علاقے کی زرعی اہمیت میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ جنوبی ہند میں یہاں کی نم مٹی میں چاول کی دو فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ پہلی فصل جون-جولائی سے دسمبر-جنوری کے درمیان اگنے کی تھی۔ اسے کڈپاکر (Kudappakar) کہتے تھے جبکہ دوسری فصل جنوری-فروری سے اپریل-مئی کے درمیان اگائی جاتی تھی اور اس فصل کو سمبا پیشانم (Samba peshanam) کہتے تھے۔

گندم یا گیہوں کی کاشت مغلیہ ہند کے تقریباً تمام علاقوں میں کی جاتی تھی۔ اس کی شرح پیداوار اور معیار علاقہ بہ علاقہ مختلف ہوتے تھے۔ یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہیں کہ گندم کی کاشت بنگال تک جا پہنچی تھی گو کہ معیار کے لحاظ سے یہ گندم کم تر تھے لیکن اس کی پیداوار آج کے مقابلے میں مغل عہد کے بنگال میں زیادہ ہوتی تھی۔ گندم کے ساتھ جَو (Barley) بھی مغلیہ ہند کے میدانی علاقوں اور گجرات میں کافی مقدار میں پیدا کیے جاتے تھے لیکن یہ بنگال میں بہت کم اُگتے تھے۔ ''جو'' کی پیداوار کنارا، تمل ناڈو اور کشمیر میں بالکل نہیں ہوتی تھی۔ آئین کے مطابق ''جو'' کی پیداوار عمومیت سے الہ آباد، اودھ، اجمیر، دہلی، لاہور اور ملتان میں بھی کثرت سے ہوتی تھی۔

جوار، باجرہ: عام طور پر گندم والے علاقوں میں پیدا ہوتے تھے لیکن ان کی پیداوار خشک علاقوں میں زیادہ ہوتی تھی۔ لہذا دیپال پور کے علاقے میں یہ خریف کی اہم فصل تھی۔ گجرات، اجمیر اور خاندیش جیسے صوبوں میں ان کی پیداوار معیاری اور کثیر ہوتی تھی۔

دال: دال کی پیداوار کے سلسلے میں عرفان حبیب کے مطابق مغل عہد اور 1900ء کے درمیان کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ دالوں کی فصلوں میں عام طور پر چنا، ارہر، مونگ، مسور یا ملکا، اُرد، کھیساری وغیرہ کی کاشت خصوصیت سے کی جاتی تھی۔

مکئی یا مکہ: مکئی یا مکہ کے تعلق سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا علم ہندوستان میں سترہویں صدی تک نہیں تھا۔ لیکن آثار قدیمہ کی تحقیقات نے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ عرفان حبیب اسے مغل عہد کی زراعت میں ایک نئے اضافے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ گوڈے کی تحقیقات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مکئی کی پیداوار مہاراشٹر اور دکن میں سترہویں صدی میں ہوتی تھی۔ راجستھان کے محصولاتی دستاویزات سے اس کی مزید تائید ہو جاتی ہے۔ جن میں 1664ء سے یہ جنس محصولاتی فصلوں کی فہرست میں شامل ہو جاتی ہے۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ سترہویں صدی تک اس سلسلے میں تاریخی ماخذ کی کمی یا عدم دستیابی کے باعث یہ خیال کیا گیا ہو کہ مغلیہ ہند میں مکئی کا علم نہیں تھا۔ اس طرح مغل عہد میں غذائی اجناس کی فصلوں کی تعداد اور پیداوار کے سلسلے میں مورلینڈ، شیریں موسوی اور دیگر جدید تحقیقات اور آئین سے حاصل شدہ اعداد و شمار کی بنیاد پر عرفان حبیب کے مطابق مکئی کے علاوہ تمام اہم اور بڑی فصلوں کی علاقائی تقسیم اور شرح پیداوار سولہویں صدی سے انیس ویں صدی

کے اختتام تک کم و بیش یکساں ہی رہی تھی۔

9.8.2 نقدی فصلیں (Cash Crops)

وہ فصلیں جو عمومیت سے بازار کے لیے پیدا کی جاتی تھیں نقدی فصلیں شمار کی جاتی تھیں۔ مغل ریکارڈز میں ان فصلوں کا ذکر ''جنس کامل'' یا ''جنس اعلیٰ'' کے طور پر کیا گیا ہے۔ غذائی فصلوں کے مقابلے ان فصلوں کی تیاری میں زیادہ وقت لگتا تھا اور یہ کھیتوں میں لمبے وقت تک لگی ہوتی تھیں۔ ان میں خاص طور پر گنا، کپاس، نیل اور افیون کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جو کم و بیش مغل ہند کے تمام علاقوں میں پیدا کی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ تیلہن (تیل آور بیج) سن یا پیٹ سن، تمباکو، کافی (Coffee)، پان، زعفران مختلف قسم کے پھل سبزی اور ریشم وغیرہ بھی نقدی فصلوں کے زمرے میں شامل تھیں۔ یہ تمام فصلیں گو کہ ہندوستان کے ہر تاریخی دور میں پائی جاتی تھیں تاہم سترہویں صدی تک آتے آتے ان کی مصنوعات اور کاروباری سرگرمیوں میں اضافے کے سبب بازاروں میں ان کی مانگ کافی بڑھ گئی تھی اور مغلیہ ہند کے کاشتکاروں نے ان کی بڑھتی مانگ کے پیش نظر ان کی پیداوار بڑھانے کی سمت خاص توجہ دینا شروع کر دیا تھا۔

گنّا: جس سے چینی اور دیگر میٹھے مصنوعات تیار کیے جاتے تھے مغلیہ ہند میں سب سے زیادہ پیدا ہونے والی نقدی فصل تھی۔ آئین کے مطابق گنے کی پیداوار آگرہ، اودھ، الہ آباد، بنگال، لاہور، ملتان، مالوہ، خاندیس، برار اور جنوبی ہند کے تمام دستوری حدود میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی لیکن بنگال کے گنے کا معیار سب سے بہتر تھا۔

کپاس: دوسری نقدی فصل جو کم و بیش پورے مغلیہ ہند میں پیدا کی جاتی تھی وہ تھی کپاس جس سے کپڑا اور دیگر مصنوعات تیار کی جاتی تھی۔ اس کی پیداوار مہاراشٹر، گجرات اور بنگال میں کثرت سے ہوتی تھی۔ عصری حوالوں کے مطابق کپاس کی پیداوار اجمیر، اودھ، راجستھان، بہار، ملتان، ٹھٹہ (سندھ) لاہور اور دہلی وغیرہ میں بھی ہوتی تھی۔

نیل: جس سے ایک مخصوص رنگ تیار کیا جاتا تھا۔ مغلیہ ہند کی اہم نقد فصلوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس سے تیار شدہ رنگ کی مانگ نہ صرف ہندوستانی بازاروں میں بلکہ یورپی بازاروں میں بھی بڑے پیمانے پر تھی۔ اس کی پیداوار کے حوالے عمومیت سے اودھ، الہ آباد، آگرہ، اجمیر، دہلی، لاہور، ملتان اور سندھ جیسے صوبہ جات کے محصولاتی دستاویزات کے علاوہ غیر ملکی سیاحوں کے سفر ناموں میں خوب ملتے ہیں۔ اس کی کھیتی متذکرہ بالا علاقوں کے علاوہ گجرات، بہار، بنگال، مالوہ، دکن اور جنوبی ہند میں بھی کی جاتی تھی۔ اعلیٰ معیار کے نیل جن کا مطالبہ زیادہ تھا بیانا اور سرکھیج کے علاقوں میں پیدا ہوتے تھے۔ آگرہ کے نزدیک بیانا میں پیدا ہونے والے نیل قیمت کے معاملے میں سب سے مہنگے ہوتے تھے۔ جب کہ احمد آباد گجرات کے نزدیک سرکھیج میں اُگنے والے نیل معیار میں دوسرے مقام پر تھے۔ اس کے علاوہ معیاری نیل کی پیداوار کے لیے اتر پردیش کا خورجہ اور علی گڑھ، سندھ صوبے میں سہوان اور دکن میں تلنگانہ شہرت رکھتے تھے۔

افیون (Opium): افیون کی کاشت کے حوالے مغل دستاویزات میں پورے ہندوستان کے لیے پائے جاتے ہیں لیکن اپنی مقدار و معیار کے لحاظ سے بہار اور مالوہ میں پیدا ہونے والے افیون کی فصل کو برتری حاصل تھی۔ اس کے علاوہ افیون کی پیداوار اودھ، آگرہ، دہلی، لاہور، راجستھان، گجرات اور ملتان میں بھی ہوتی تھی۔ ان علاقوں میں افیون کے ساتھ ہی سندھی یا بھنگ کی کھیتی کے حوالے بھی مغل دستاویزوں

میں پائے جاتے ہیں۔ گجرات کے دیوان کو ارسال شدہ اورنگ زیب کے 1659ء کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ منشیات کے طور پر اس کے بڑھتے استعمال کو روکنے کی غرض سے ان فصلوں کی کاشت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی لیکن حکومت کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔

تمباکو (Tobacco): جو ہندوستان میں پرتگالیوں کے ذریعے سولہویں صدی کے اختتام پر بطور نقدی جنس کے متعارف ہوا تھا۔ بڑی تیزی سے ہندوستان کے بڑے علاقے میں پھیل گیا۔ آئین کے زمانہ تالیف میں غالباً یہ اپنی ابتدائی مرحلے میں رہا ہوگا یہی وجہ ہے کہ اس میں تمباکو کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ لیکن بعد کے مغل دستاویزات میں تمباکو کا ذکر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اور سترہویں صدی میں اس نے ہندوستانی زراعت میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور کم و بیش مغلیہ ہند کے تمام علاقوں میں اس کی کاشت ہونے لگی تھی اپنے معیار و مقدار کے لحاظ سے بہار اور گجرات کے تمباکو کو برتری حاصل تھی۔

کافی یا قہوہ (Coffee): کافی یا قہوہ بطور مشروب کے سترہویں صدی میں ہندوستانی امراء و شرفاء اور شاہی محلوں و دربار میں متعارف ہو چکا تھا۔ عرفان حبیب کے مطابق اورنگ زیب کے عہد میں کافی شاہی دربار اور مغل امراء کے درمیان بطور 'جنس تحفہ' متعارف ہو کر مقبول عام ہو چکا تھا۔ اس کی درآمد جزیرہ نما عرب اور حبشہ سے ہوا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کافی کی کاشت سترہویں صدی کے نصف دوم میں ہندوستانی زراعت میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو پائی تھی کیونکہ اس عہد کے فیکٹری دستاویزات میں مہاراشٹر میں کافی کی پیداوار کے حوالے ملتے ہیں۔

سن یا پٹسن: سن یا پٹسن جو اپنے مخصوص قسم کے ریشوں کی وجہ سے اہمیت کا حامل تھا، کی کاشت آئین کے مطابق مغلیہ ہند کے تمام ضبطی صوبہ جات میں ہوتی تھی۔ اس کی پیداوار سب سے بڑی مقدار میں صوبۂ بنگال میں ہوتی تھی۔ جس کی کھپت عام طور پر مقامی بازاروں میں ہی ہو جاتی تھی۔ انیس ویں صدی تک آتے آتے اس جنس کے پھیلتے کاروبار نے اس کی کاشت کو بنگال میں اتنی وسعت عطا کی کہ یہ غذائی اجناس جیسے چاول اور گنّے کی پیداوار میں زبردست گراوٹ کا سبب بنا دیا۔ اور شاید انیسویں صدی میں بنگال میں غذائی اجناس کی کمی کا سبب سن یا پٹسن کی پھیلتی کاشکاری تھی جس نے کھیتی میں غذائی فصلوں کی جگہ لے لی تھی۔ بنگال کے علاوہ اس کی پیداوار اودھ، الہ آباد، اگرہ، اجمیر اور لاہور میں بھی ہوتی تھی۔

ریشم پروری: ریشم پروری کا تذکرہ یورپی سیاحوں کی تحریروں میں تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کی پیداوار آسام، بنگال، کشمیر اور مغربی ساحلی علاقوں میں ہوتی تھی۔ لیکن مقدار و معیار کے لحاظ سے بنگال میں ریشم کی پیداوار سب سے بہتر ہوتی تھی۔

تلہن: ایسی فصلیں جن کے بیجوں سے تیل نکالا جاتا تھا۔ غذائی اور نقدی دونوں زمروں میں شمار کی جاتی تھیں۔ ان فصلوں میں سرسوں، رائی، تل، السی، اور ارنڈ وغیرہ اہم تھیں۔ سرسوں، رائی اور تل جن کے تیل کھانے میں استعمال کیے جاتے تھے سب سے اہم فصلیں تھیں۔ ان تیلہنوں (تیل آور بیج) کی پیداوار الہ آباد سے ملتان تک تمام مغلیہ صوبہ جات میں ہوتی تھی۔ لیکن ان میں بنگال کو فوقیت حاصل تھی۔ ان تیل آور فصلوں کی پیداوار دیگر غذائی اجناس کے مقابلے کافی کم ہوتی تھی۔

کالی مرچ (Pepper): مغل عہد میں استعمال ہونے والے مسالوں میں کاروباری طور پر سب سے اہم تھا لیکن اس کی پیداوار مغل

حکومت کی حدود سے باہر ہی ہوتی تھی۔ عام طور پر مسالوں کی پیداوار جنوبی ہند کے مغربی گاؤں سے متصل علاقوں میں ہوتی تھی۔ کالی مرچ کی پیداوار بہار کے چمپارن علاقے میں خودرو جنگلی پودے کی شکل میں بھی ہوتی تھی۔ شملہ مرچ جو آج ہندوستانی کھانوں کا اہم حصہ بن چکا ہے مغل عہد میں مفقود تھی۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی پیداوار اٹھارہویں صدی کے وسط میں شروع ہوئی ہوگی جس نے آگے چل کر ہندوستانی زراعت میں اہم مقام حاصل کر لیا۔

پان: ہندوستانی تہذیب میں عہد وسطی کے ابتدائی دور سے جانا جاتا ہے۔ اس کی پیداوار آج بھی ویسے ہی ہوتی ہے جیسے کہ عہد وسطی میں کی جاتی تھی اور اس کی پیداوار پورے مغلیہ ہند میں ہوتی تھی۔ البیرونی بیان کرتا ہے کہ پان کا استعمال ہندوستان میں عام تھا۔ امیر خسرو نے اعجاز خسروی میں پان کی تقریباً 42 قسموں کا ذکر کیا ہے۔ بہار مگہی پان کی پیداوار کے لیے مشہور تھا۔ عرفان حبیب کا اندازہ ہے کہ شاید رسل و رسائل کے بہتر انتظام نے اس کی پیداوار کی وسعت میں معاونت دی ہو تاہم ابھی تک اس کے قطعی شواہد موجود نہیں ہیں۔

زعفران: ایک ایسی جنس تھی جو خالصتاً بازار کے لیے پیدا کی جاتی تھی۔ اس کی پیداوار کشمیر تک ہی محدود تھی لیکن اس کی پیداوار سے متعلق اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک اس میں کافی گراوٹ آگئی تھی۔

گلاب کی کھیتی: گلاب کی کھیتی کے سلسلے میں اندازہ ہوتا ہے کہ سترہویں صدی میں عرق گلاب اور عطر گلاب اور نو ایجاد شدہ عطر جہانگیری کی بڑھتی مانگ نے اس کی کاشت کی بڑی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس کے علاوہ گلاب کی پنکھڑیوں سے بنایا جانے والا گل قند بھی مقبول عام تھا۔ ان وجوہات کی بنیاد پر گلاب کی کھیتی کو وسعت حاصل ہوئی۔

9.8.3 پھل اور سبزی (Fruits and Vegetables)

مغل عہد میں نخل بندی اور باغبانی کو زراعت کے میدان میں نہ صرف اہمیت حاصل ہوئی بلکہ اس نے ترقی کی نئی اونچائیوں تک مقام حاصل کر لیا۔ مغل حکمرانوں اور ان کے اُمراء نے پھلوں کے بڑے بڑے باغات لگوانے کا اہتمام کیا تھا۔ کم و بیش تمام بڑے امراء نے اپنی اپنی عملداریوں میں مختلف قسم کے پھلوں کے باغات لگوائے تھے۔ باغات کے لیے بہت ہی مہارت کے ساتھ منصوبہ بندی کی جاتی تھی۔ چودھویں صدی میں ابن بطوطہ اور سترہویں صدی میں برنیئر آموں کی مختلف قسموں کی پیداوار کا تعریفی الفاظ میں تذکرہ کرتا ہے جو بنگال گولکنڈہ اور دہلی میں پیدا کیے جاتے تھے۔ آج کے زمانے میں پیدا ہونے والے پھلوں میں سے اکثر سولہویں-سترہویں صدی میں ہندوستان میں متعارف ہو کر مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ انناس اور کاجو ایسے ہی پھل تھے جو پرتگالیوں کے ذریعے لاطینی امریکہ یا نئی دنیا سے لا کر ہندوستان میں متعارف ہوئے تھے اور بہت ہی مختصر مدت میں اس کی پیداوار کثرت سے ہونے لگی تھی۔

پپیتا، لیچی اور امرود: مغل عہد کے آخری دور میں ہندوستانی زراعت کا حصہ بن سکے تھے۔ لیکن بہت جلد مقبول ہوئے اور ان کی پیداوار کثرت سے ہونے لگی تھی۔ شاہ دانا یا ولایتی مکوہ (Cherries) کی مختلف قسمیں کابل سے لائی گئی تھیں اور کشمیر میں قلم کاری کے ذریعے اس کی معیاری قسموں کی پیداوار کی گئی تھی۔ قلم کاری کی تکنیک کا استعمال کر کے کئی قسم کے پھلوں، خصوصیت سے آموں، سنتروں، خوبانی وغیرہ

کے معیاری قسموں کی ایجاد کی گئی تھی۔ ابتدا میں قلم کاری کی تکنیک کا استعمال شاہی اور امراء کے باغات تک ہی محدود تھا لیکن شاہجہاں کے عہد میں اس پر لگی پابندی ہٹادی گئی جس کی وجہ سے یہ عام کاشتکاروں کی پہنچ میں آگئی۔ کونکن کے ساحلی علاقے میں ناریل، سپاری، مونگ پھلی، کھجور، کٹہل، شکر قند اور اناس وغیرہ کی پیداوار ہوتی تھی۔

مغل حکمرانوں اور ان کے امراء کی ہمیشہ یہ کوشش رہی تھی کہ وہ ہر قسم کے خوش ذائقہ پھل اپنے باغات میں اگائیں جس کا سلسلہ بابر کے وقت سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف قسم کے پھلوں کے بیج اور ان کی کاشت کرنے والے ماہرین کابل اور مرکزی ایشیاء سے درآمد کیے جاتے تھے۔ ان میں خربوزے اور انگور اہم ترین پھلوں میں تھے جو وہاں سے لاکر مغل باغات میں لگائے جاتے تھے۔ سبزیوں کے معاملے میں مغلیہ ہند کے کاشت کار اور دیہی سماج کے لوگ خود کفیل تھے۔ بازاروں کے لیے پیدا کی جانے والی سبزیوں کے مراکز عمومیت سے شہروں کے قریب ہوتے تھے۔ ان مراکز پر ہندوستانی سماج کی ایک ذات جو 'مالی' کے نام سے اپنی پہچان بنا چکی تھی سبزیوں کی کاشت کے لیے مہارت رکھتی تھی۔ عمومیت سے 'مالی ذات' کے لوگ ہی شہروں کے نزدیک والے علاقوں میں مختلف قسم کی سبزیاں پیدا کرتے تھے اور شہروں تک پہنچاتے تھے۔ ابو الفضل نے آئین میں سبزیوں کی طویل فہرست فراہم کی ہے جن میں سے اکثر اج بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ نئی سبزیوں میں آلو میٹھا آلو یا شکر قند، ٹماٹر وغیرہ خاص ہیں۔ یہ سولہوی صدی میں ہندوستان میں متعارف ہوئیں اور جلد ہی مقبول عام ہو گئیں۔ صدیوں سے ہندوستان اپنے مسالوں کے لیے مشہور رہا ہے۔ جنوبی ہند کے ساحلی علاقے ان مسالوں کی وجہ سے اکثر ایشیائی اور یوروپی ممالک میں شہرت پا چکے تھے۔ ان مسالوں میں کالی یا سیاہ مرچ، لونگ، الائچی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ سونف، زیرہ، ہلدی، لہسن، ادرک، اجوائن وغیرہ کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی جن کی برآمدات بھی بڑے پیمانے پر پرتگالیوں اور ولندیزیوں کے ذریعے یورپی ممالک میں کی جاتی تھی۔ کشمیر کا زعفران اپنے رنگ و بو کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھا۔

9.8.4 مویشی پروری (Cattle Herding)

مغل عہد میں زرعی پیداوار کے حصول کے لیے مویشیوں کی، خصوصیت سے بیلوں کی ضرورت پر پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے۔ مویشیوں کا استعمال کھیت جوتنے رہٹ چلانے یا فصلوں سے اناج کو الگ کرنے کے لیے کیا جاتا تھا وہیں اس کا استعمال سامان ڈھونے اور دودھ اور کھیتوں کی زرخیزی کے لیے گوبر کی کھاد حاصل کرنے کے لیے بھی اہم تھا۔ عرفان حبیب کے مطابق سترہویں صدی کے ہندوستانی کاشتکاروں کو مویشی اور باربردار جانوروں کے معاملے میں برتری حاصل تھی۔ چونکہ زرعی سرگرمیوں میں مویشیوں کا وسیع استعمال ہوتا تھا اور جنگل وچراگاہیں آسانی سے دستیاب تھے۔ لہذا یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مغل عہد میں مویشی پروری بھی زرعی سرگرمیوں کا اہم حصہ تھی۔ مویشی پروری کا کام اکثر تمام کاشت کار انفرادی سطح پر کرتے تھے۔ لیکن اس کے لیے کچھ مخصوص ذات اور قبیلے بھی تھے۔ جو اس پیشے میں مناسب مہارت رکھتے تھے۔ یہ ذات یا قبیلے جنگلی اور سیلابی علاقوں میں جہاں کاشت کاری مشکل یا ناممکن ہوتی تھی مویشی پروری کرتے تھے اور اپنی ضروریات زندگی کے لیے اسی پر انحصار کرتے تھے۔

زراعت کے لیے مویشیوں کا وسیع استعمال اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ان کی تعداد بھی بڑی رہی ہو گی۔ اور ان کے لیے چراہ گاہوں کی موجودگی بھی لازمی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں بڑی بڑی چراگاہوں کی موجودگی کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ان چراہ گاہوں کے علاوہ کھیتوں میں بڑی تعداد میں مویشیوں کی موجودگی بھی درج کی ہے۔ عرفان حبیب نے مختلف اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ اندازہ لگایا ہے کہ مغل عہد میں فی کس مویشیوں کی تعداد موجودہ دور سے کہیں زیادہ تھی۔ چونکہ غذائی اشیاء میں گھی، مکھن اور دودھ کو اہم مقام حاصل تھا۔ جس کی وافر دستیابی کے لیے بھی مویشیوں کی اچھی خاصی تعداد کا موجود ہونا لازمی تھا۔ بیلوں اور نر بھینسوں کا استعمال نہ صرف ہل چلانے کے لیے بلکہ بار برداری کے لیے بھی کیا جاتا تھا۔ ہمیں بنجاروں اور غلے کے تاجروں کے ذریعے بڑی تعداد میں ان جانوروں سے بار برداری کروانے کے حوالے ملتے ہیں۔ یہ بنجارے اور تاجر سو سے ہزار تک کی تعداد میں بار بردار جانور کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

9.9 شرح پیداوار (The Rate of Production)

شیرین موسوی نے مغلیہ ہند میں پیدا ہونے والی کچھ اہم فصلوں کی فی بیگہ شرح پیداوار کا تخمینہ ابوالفضل کے ذریعے فراہم کیے گئے ضبطی صوبہ جات لاہور، ملتان، آگرہ، الہ آباد اور دلی کی شرح پیداوار اور شرح محصولات کے اعداد و شمار کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ہر فصل کے لیے فی بیگہ پیداوار کو الگ الگ تین درجوں اعلی، درمیانی اور ادنی شرحوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک اوسط شرح پیداوار کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ لیکن ابو فضل کے ذریعے پیش کردہ اعداد و شمار سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شرح پیداوار کی درجہ بندی کن بنیادوں پر کی گئی ہے۔ بہر کیف مغل دستاویزات کی چھان بین اور تجربے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نچلی سطح کی پیداوار کی شماریات غیر آبپاشی والی زمینوں کے لئے جبکہ اعلی اور درمیانی پیداوار کے شماریات آبپاشی والی زمینوں کے لیے دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں شیریں موسوی نے سولہویں صدی کے دستاویزات سے مختلف اعداد و شمار حاصل کر کے مغلیہ ہند کے کچھ اہم فصلوں کی شرع پیداوار کا اندازہ لگایا ہے۔ ان کے مطابق فصلوں کی اوسطاً فی بیگہ پیداوار کچھ اس طرح تھی۔ شیریں موسوی نے ان شرح پیداوار کا موازنہ انیس ویں صدی کے اختتام پر دستیاب اعداد و شمار سے بھی کیا ہے اور واضح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مجموعی طور پر دونوں ادوار کے درمیان غذائی اجناس کی شرح پیداوار میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن نقدی فصلوں کی شرح پیداوار میں انیس ویں صدی کے اختتام تک آتے آتے قطعی طور پر قابل قدر اضافہ ہو گیا تھا۔

9.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغل عہد کی زراعت کی خصوصیات میں زرعی اراضیات اور آبادی کا موافق تناسب، مویشیوں اور چراہ گاہوں کی مناسب تعداد، مٹی کی مختلف اقسام، آبپاشی کے قدرتی اور مصنوعی وسائل کی دستیابی، زرعی کاریگروں اور مزدوروں کی موجودگی، کثیر تعداد میں غذائی اور نقدی اجناس کی پیداوار، کاشتکاروں کے ذریعے موافق زرعی تبدیلیوں کو اپنانے کا رجحان اور حکومت کی جانب سے زراعت کی توسیع و ترقی کے لیے ہمہ گیر کوشش وغیرہ اہم ہیں۔ ان موافق خصوصیات کی وجہ سے مغل عہد کی زراعت میں مجموعی طور پر ترقی پذیری کا رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔ گو کہ زرعی پیداوار سے متعلق اعداد و شمار کی کمی ہے تاہم یہ اتنے کم بھی نہیں کہ موٹے طور پر مغل عہد کی زرعی سرگرمیوں کے تعلق سے کوئی

رائے قائم نہ کی جاسکے۔ زراعت کے لیے نہ صرف وافر اراضیات دستیاب تھی بلکہ ان کے رقبات میں بتدریج اضافہ بھی ہوتا رہا تھا جو بیسویں صدی تک آتے آتے دوگنا ہو گیا تھا۔ زرعی پیداوار کے ضروری وسائل میں کاشتکاروں کے کئی درجے تھے جو مختلف سطحوں پر اپنی صلاحیتوں ہنر مندی اور مقامی حالات کے مطابق زرعی سرگرمیوں کو انجام دے کر زیادہ سے زیادہ پیداوار کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ ایک طرف جہاں اکثر حکومت کی کوشش ہوتی تھی کہ اسے پیداوار کا زیادہ سے زیادہ حصہ محصولات کی شکل میں حاصل ہو جائے تو دوسری طرف وہ یہ بھی جوکھم اٹھانے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی کہ محصولات کے بیجا بوجھ کی وجہ سے کاشت کاری کا عمل مجروح ہو اور حکومت کی آمدنی کم ہو جائے۔ لہٰذا پورے مغلیہ دور میں وقتاً فوقتاً کاشتکاروں کو مختلف سہولیات و مراعات بھی دی جاتی تھی جس کا فائدہ اکثر کاشت کار اٹھاتے تھے۔ زراعت کے میدان میں متعارف ہونے والی نئی تکنیکوں اور فصلوں کو اپنانے اور استعمال کرنے کا رجحان زیر مطالعہ عہد کے کاشتکاروں میں پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں آبپاشی کی مختلف طریقے، بیج کی بوائی اور قلم کاری کے ذریعے نئی نئی فصلوں کی بہتر اور معیاری پیداوار کے ثبوت ملتے ہیں۔ غذائی اور نقدی فصلوں کی تعداد اور مقدار مغلیہ ہند میں دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے کہیں زیادہ تھی۔ مجموعی طور پر مغل عہد کی زراعت میں ترقی تنوع کا رجحان صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ عصری تکنیکوں اوزاروں اور دیگر ضروری وسائل اور صدیوں کے زرعی تجربات کے مناسب استعمال سے مغل عہد کے کاشت کار کھیتوں سے اچھی پیداوار حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے

9.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

خود کاشت	:	وہ کاشت کار جو اپنی زمین پر خود ہی کاشت کاری کرتے تھے۔
رعیت کاشت	:	ویسے کاشت کار جو اپنی موروثی اراضیات پر کھیتی کرتے تھے۔
ریزہ رعایا	:	وہ چھوٹے کاشت کار جو وسائل کی کمی کے باعث چھوٹے چھوٹے رقبات پر کھیتی کرتے تھے۔
بٹائی	:	مزدور پیشہ کاشت کاروں کے ذریعہ کسی دوسرے کی زمین پر کی جانے والی کاشت کو بٹائی کہتے تھے۔
بٹائی دار	:	بٹائی کے ذریعہ فصلوں کو پیدا کرنے والے کاشت کار کو بٹائی دار کہتے ہیں۔
رہٹ/ساقیہ	:	ایرانی طریقہ آب پاشی۔
چراگاہ	:	مویشیوں کے چرنے کے لئے چھوڑی گئی اراضیات۔
قلم کاری	:	Grafting
پاہی کاشت	:	وہ کاشتکار جو اپنے علاقۂ سکونت کے باہر دوسرے علاقوں کی اراضیات پر چند شرائط کے ساتھ کھیتی کرتے تھے۔

9.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

9.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. زرخیزی کے لحاظ سے پولاج قسم کی زمین کا درجہ کیا تھا؟
2. زمین کو تیار کرنے اور بیج بونے کے بعد مٹی کو برابر کرنے کے لیے لکڑی سے بنے اوزار کو کیا کہا جاتا تھا؟
3. مغلیہ ہند کے مشرقی علاقے میں بھوری مٹی کس فصل کے لئے موزوں تھی؟
4. مغلیہ عہد میں فصلیں کی بہتر پیداوار کے لئے کون سی قدرتی کھاد کثرت سے استعمال کی جاتی تھی؟
5. فصلوں کو نقصان پہونچانے والے کیڑے مکوڑوں سے حفاظت کے لیے کون کون سی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں؟
6. آبپاشی کے لئے استعمال ہونے والا 'چرس' کیا تھا؟
7. کنویں اور گہری سطح سے پانی نکالنے کے لئے معروف مشین کا نام کیا تھا؟
8. ٹیورنیئر کے مطابق گولکنڈہ کی زراعت کس وجہ سے ممکن ہو سکی؟
9. گلاب کی کھیتی سترہویں صدی میں کس زرعی مصنوعات کی وجہ سے وسیع ہو گئی؟
10. مغلوں نے کون کون سے اعلیٰ معیار کے پھل، افغانستان اور مرکزی ایشیاء سے درآمد کئے؟

9.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پاہی یا پائی کاشت زمرے کے کاشتکاروں کا تعارف اور کردار پیش کیجئے۔
2. مغل عہد میں کھیتی میں استعمال ہونے والے اوزاروں کا تعارف پیش کیجئے۔
3. زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے کیا طریقے استعمال کئے جاتے تھے؟
4. مغل عہد میں مویشی پروری پر مختصر نوٹ تحریر کیجئے۔
5. مغل عہد کی نقدی فصلوں کا مختصر تعارف پیش کیجئے۔

9.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغلیہ عہد کے کاشتکاروں کا تفصیلی خاکہ پیش کیجئے۔
2. مغلیہ عہد میں غذائی اجناس کا تعارف اور ان کی پیداوار پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔
3. مغلیہ نظام زراعت میں آبپاشی کے انتظامات کا جائزہ لیں۔
4. نقدی اجناس کا تفصیلی جائزہ پیش کریں۔

9.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).
3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
4. Chandra, Satish, *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans*, Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta, 1986.
5. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
6. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
7. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1997).
8. Hasan, Saiyid Nurul, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, New Delhi, 1990 (first pub. in 1973).
9. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
10. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black, Ranikhet, 2016.
11. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*, *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers Pvt., Ltd., New Delhi, 1995 (first pub. 1983).
12. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. in 1923).
13. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *Mughals and Franks*, Oxford University Press, New Delhi, 2014 (first pub. in 2005).
14. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *From the Tagus to the Ganges*, Oxford University Press, New Delhi, 2011 (first pub. in 2005).
15. Shivram, Balkrishan, *Jagirdars in the Mughal Empire during the Reign of Akbar*, Manohar, New Delhi, 2008.

اکائی 10۔زرعی مالگزاری اور تشخیص وادائیگی کے طریقے

(Agrarian Taxation and Mode of Assessment and Payment)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 اکبر سے پہلے زرعی محصولات کا نظام

10.3 زرعی محصولات کی تخمینہ کاری کے طریقے

10.3.1 غلہ بخشی

10.3.2 ہست وبود

10.3.3 کنکوت/دانہ بندی

10.3.4 ضبط

10.3.5 نسق

10.3.6 اجارہ

10.4 مقدارِ مطالبۂ زرعی محصولات

10.5 محصول کی ادائیگی کا طریقہ

10.6 زرعی محصولات کی وصولیابی

10.7 راحتی اقدامات

10.8 نظام زرعی محصول کا ڈھانچہ

10.8.1 شقدار

10.8.2 کروڑی

10.8.3 امین

10.8.4 فوطہ دار یا خزانہ دار

10.8.5 کارکن یا بتکچی
10.8.6 گماشتہ
10.8.7 قانون گو
10.8.8 چودھری
10.8.9 پٹواری
10.8.10 واقعہ نویس
10.8.11 دیوان
10.8.12 فوجدار
10.9 اکتسابی نتائج
10.10 کلیدی الفاظ
10.11 نمونہ امتحانی سوالات
10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید (Introduction)

تاریخِ عالم پر اگر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو تاریخ کی ابتدا سے تاحال بلا تفریق زمان و مکان اور نوعیت و کردار، تمام حکومتوں کی ایک مشترکہ خصوصیت واضح طور پر آشکارہ ہوتی ہے کہ تمام حکومتیں اپنے انتظامی امور اور فلاحی و ترقیاتی منصوبوں کے اجراء کے لیے ضروری اخراجات کی دستیابی کے سلسلے میں مکمل طور پر عوام یا رعایا پر منحصر نظر آتی ہیں اور ایسے طریقے وضع کرتی نظر آتی ہیں جس کے ذریعہ عوام سے ان کی بقاء کو یقینی بناتے ہوئے زیادہ سے زیادہ رقم وصولی جاسکے۔اس ضمن میں جو طریقہ صدیوں سے اب تک رائج ہے وہ ٹیکس یا محصولات کا نظام ہے اس حقیقت کے پیش نظر مغل حکمرانوں کی عظیم مملکت ہند بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھی اور ان حکمرانوں نے بھی اپنی حکومت میں ایک مربوط اور مضبوط نظام محصول کی تشکیل و قیام کو ترجیح دی تھی۔ چونکہ حکومتوں اور حکمرانوں کا وجود و بقاء ان کی معیشت پر منحصر ہوتا ہے اور مغلیہ ہند کی معیشت کی بنیاد زراعت تھی لہذا مغل حکمرانوں کے لیے لازم تھا کہ زرعی محصولات کے لیے مستحکم نظام قائم کرے ۔ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے بانی ظہیر الدین بابر اور اس کے وارث ہمایوں کے عہد حکومت میں دہلی کے سلطانوں کے ذریعہ اپنایا گیا زرعی محصولات کا نظام ہی نافذ العمل رہا چونکہ بابر اپنے چار سالہ عہد حکومت میں اکثر جنگوں اور قیام حکومت کی سرگرمیوں میں مصروف رہا لہذا وہ نظام محصولات کی طرف توجہ نہ دے پایا۔ بابر کے انتقال کے بعد اس کے وارث ہمایوں نے بھی خود کو مختلف پریشانیوں میں گھرا پایا اور

اپنی شاہی زندگی کا بڑا حصہ جلاوطنی میں گزارا، اس لئے اسے بھی نظام محصولات کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ ملا اور انجام کار اس کام کو انجام دینے کا سہرا مغلیہ خاندان کے جلیل القدر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے سر جاتا ہے۔ نصاب کی اس اکائی میں ہم مغلیہ نظامِ محصول، خصوصیت سے زرعی محصول کے مختلف پہلوئوں پر بحث کریں گے جن میں طریقۂ تخمینہ محصول، مقدار محصول، طریقۂ حصولِ محصول، حکومت کے ذریعہ مشکل حالات میں راحتی اقدامات اور نظام محصول سے منسلک عہدیدار اور کارندوں پر خصوصی توجہ دیں گے۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغلیہ نظام محصول، بالخصوص زرعی محصول سے متعارف ہونگے۔
- سلطنت مغلیہ کے استحکام سے پہلے کے نظام محصول سے متعارف ہونگے۔
- زرعی محصولات کی تخمینہ کاری کے طریقوں کو سمجھ پائیں گے۔
- زرعی محصولات کی شرح اور مقدار مختلف بنیادوں پر کیا طے کی جاتی تھی، کا اندازہ کر پائیں گے۔
- زرعی نظامِ محصول کا ڈھانچہ اور عہدیدار و کارندوں سے متعارف ہونگے۔

10.2 اکبر سے پہلے زرعی محصولات کا نظام (Land Revenue System before Akbar)

ہمایوں اور اکبر کے ادوارِ حکومت کے درمیان شیر شاہ کی شکل میں ایک ایسا حکمراں تخت نشیں ہوا جس نے منطقی بنیاد پر ایک عمدہ اور منظم نظامِ محصول کی تشکیل کی ابتداء کی۔ سہسرام، خواص پور اور ٹانڈہ کے جاگیر دار کی حیثیت سے شیر شاہ نے نہ صرف زرعی محصولات سے متعلق معلومات حاصل کی تھی بلکہ کچھ عمدہ تجربے بھی کئے تھے اور جب وہ بحیثیت بادشاہ تخت نشیں ہوا تو اس نے ان تجربات کو ملکی سطح پر لاگو کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اس نے زمینوں کی پیمائش اور درجہ بندی یکساں معیار کے مطابق کرنے کا انتظام کیا۔ تمام قابل کاشت زمینیں تین درجوں ''اعلیٰ (عمدہ)، اوسط اور ادنیٰ (معمولی)'' میں تقسیم کی گئی اور ان تینوں قسم کی زمینوں کی الگ الگ فصلوں کے لیے فی بیگہ پیداوار کی شرح معلوم کرنے کے بعد ان کا اوسط نکالا گیا۔ اس طرح جو نتیجہ برآمد ہوا وہی تمام زمینوں کی اوسط شرح پیداوار مان لی گئی اس شرح پیداوار کو ریع کہا گیا۔ اس طرح کل پیداوار کا تخمینہ نکال کر اس کا ایک تہائی (3/1) حصہ حکومت کے محصول کے طور پر وصول کیا جانے لگا۔ یہ محصول جنس اور نقد دونوں شکلوں میں ادا کی جاسکتی تھی تاہم آخر الذکر کو ترجیح دی جاتی تھی۔ متعینہ ایک تہائی پیداوار بطور محصول ادا کرنے کے ساتھ ہی ہر کاشت کار کو کل محصول کا ڈھائی فیصد الگ سے ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس کے بدلے کاشتکاروں کو حکومت قدرتی آفات یا قحط سالی کے دوران سستی قیمتوں پر غلہ اور اناج فراہم کرتی تھی۔ محصول کی ادائیگی کاشت کار یا تو سیدھے پرگنے کے سرکاری خزانے میں یا مقدم کے ذریعے کرتے تھے۔ شیر شاہ نے کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کی طرف پوری سنجیدگی سے توجہ دی اور قدرتی آفات یا قحط کے زمانے میں یا تو محصول کی مقدار میں تخفیف کر دی یا کبھی بحالت ضرورت پورا محصول بھی واپس کر دیا۔ اس نے اپنے محصولاتی عہدیداروں اور کارندوں کو فصلوں کی

پیائش اور تخمینہ کاری کے عمل میں کاشتکاروں کے تئیں پوری ہمدردی اور دیانتداری کا مظاہرہ کرنے کے احکامات جاری کئے تھے۔ لیکن جب تخمینہ کاری کا عمل ایک بار مکمل ہو جاتا تھا تب محصولات کی وصولیابی میں حکومت کی طرف سے پوری ایمانداری اور سختی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ شیر شاہ اپنے عہدیداروں اور کارندوں کی سرگرمیوں پر سخت نگاہ رکھتا تھا تاکہ وہ کاشتکاروں پہ ظلم و جبر کرنے سے باز رہیں۔ اس نے ان سپاہیوں کو سخت سزائیں دی جنہوں نے مہم جوئی کے دوران فصلوں کو تباہ کیا تھا۔ اس طرح شیر شاہ کے ذریعہ تشکیل شدہ نظام محصولات مؤثر اور لچیلا تھا۔ شیر شاہ کے انتقال کے بعد ہندوستان انتظامی طور پر سخت بد نظمی کا شکار ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر شیر شاہ کے ذریعہ تشکیل شدہ محصولاتی نظام بھی اپنی ابتدا کے کچھ ہی دنوں بعد انحطاط کا شکار ہو گیا۔ اکبر جسے ہمایوں کی جانشینی حاصل ہوئی اپنی تخت نشینی کے وقت لڑکپن کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی اسے اپنے مقام و مرتبے اور اس کی اہمیت کا احساس ہوا وہ سب سے پہلے اپنی مملکت کے اقامت و استحکام اور حفاظت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سمت میں قابل قدر کامیابی حاصل کرنے اور مغلیہ تخت پر اپنی گرفت مضبوط کر لینے کے بعد اکبر نے پوری سنجیدگی سے اپنی توجہ ملک کے محصولاتی نظام کی طرف ڈالی اور شیر شاہ کے ذریعہ چھوڑے گئے محصولاتی نظام میں کامیاب اصلاحات اور کئی نئے تجربات کی بنیاد پر ایک بہترین نظام محصولات کی تشکیل اور نفاذ میں کامیابی حاصل کی جس میں اکبر کو مظفر خان، اعتماد خان اور راجہ ٹوڈر مل جیسے ماہرین کا تعاون حاصل رہا۔ یہی نظام کچھ معمولی پھیر بدل کے ساتھ پورے مغلیہ عہد میں لاگو رہا۔ اکبر کے عہد میں تشکیل شدہ نظام محصولات، خصوصا زرعی محصولات پر تفصیلی بحث ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

10.3 زرعی محصولات کی تخمینہ کاری کے طریقے
(Methods of estimation of agricultural revenue)

ہندوستان میں برٹش حکومت کے ابتدائی حکمرانوں نے زرعی محصولات کو زمین کے کرائے (Rent of the Soil) کے طور پر دیکھا کیونکہ ان کے خیال سے بادشاہ یا حکمراں ہی تمام زمینوں کا مالک ہوتا تھا۔ لیکن ان کے اس نظریہ کی بعد کی تحقیق اور مطالعے سے تردید ہو گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ مغلوں کے ذریعہ نافذ العمل زرعی محصول، زمین پر نہیں بلکہ فصلوں کی پیداوار پر تھا۔ لہذا یہ کرایۂ زمین (Rent of the Soil) سے مختلف تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس سلسلے میں یہ جواز پیش کیا ہے کہ محصولات کا نفاذ دراصل انصاف و تحفظ فراہم کرنے کی اجرت یا معاوضہ ہے۔ زرعی محصولات کے لئے مغلیہ حکومت میں فارسی اصطلاح ''مالِ واجب'' یا ''مال'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ ''خراج'' کی اصطلاح بھی بعض بعض ماخز میں نظر آجاتی ہے۔ تاہم یہ اصطلاح عمومی طور پر مستعمل نہیں تھی۔ زرعی محصولات کی وصولیابی کا عمل دو مرحلوں میں منقسم تھا۔

1۔ تشخیص یا جمع (Assessment)　　2۔ حاصل (Actual Collection)

(1) تشخیص کے تحت حکومت کے مطالبے کا تعین کیا جاتا تھا اور اسی تشخیص کی بنیاد پر محصول کی حقیقی وصولیابی خریف اور ربیع کی فصلوں کے لیے الگ الگ کی جاتی تھی۔

(2) جمع کی اصطلاح ''حاصل'' کے حقیقی وصولیابی محصول کے مقابلے میں تخمینہ کاری یا تشخیص کے نتیجے میں طے کی گئی مقدارِ محصول تھی۔

ہندوستان میں کھیتی یا زراعت کی موسمی تقسیم کے پیش نظر خریف اور ربیع کی فصلوں کی تخمینہ کاری یا تشخیص کا عمل الگ الگ کیا جاتا تھا۔ جب تخمینہ کاری کا عمل پورا ہو جاتا تھا تب حکومت کی جانب سے ایک دستاویز جاری کیا جاتا تھا۔ جسے پٹہ، ''قول'' یا ''قول قرار'' کہا جاتا تھا۔ جس میں محصول کی شرح اور مقدار درج ہوتی تھی۔ اس کے جواب میں تشخیص الیہ (Assessee) کو قبولیت (Acceptance) تحریر کرنا ہوتا تھا جس میں طے شدہ شرائط کے علاوہ یہ درج ہوتا تھا کہ وہ کب اور کیسے محصولات کی ادائیگی کریگا۔ مغلیہ ہند میں تشخیص یا تخمینہ کاری کے کئی طریقے رائج تھے ان میں سے عام طور پر رائج کچھ طریقوں کا ذکر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

10.3.1 غلہ بخشی

(Crop Sharing) اسے ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ''بٹائی'' یا ''بھاولی'' بھی کہا جاتا تھا۔ ابوالفضل نے آئین میں غلہ بخشی کے تین طریقے درج کئے ہیں۔

1. بٹائی: فصلوں کے کٹائی کے بعد ان سے غلہ یا اناج الگ کر کے دونوں فریقین (حکومت کے نمائندے یا اہلکار اور کاشت کار) کی موجودگی میں طے شدہ شرائط اور شرح کے مطابق فصل کا بٹوارہ کر لیا جاتا تھا.
2. کھیت بٹائی: اس طریقے کے مطابق حکومت اور کاشت کار کے حصوں کا بٹوارہ کھیت میں کھڑی فصل کے وقت ہی کر لی جاتی تھی۔
3. لانگ بٹائی: اس طریقے میں فصل کی کٹائی کے بعد بغیر اناج الگ کئے ہی قول قرار کی شرائط اور شرح کے مطابق ڈھیر لگا کر حصے تقسیم کر لئے جاتے تھے۔

غلہ بخشی کا طریقۂ تشخیص عرفان حبیب کے مطابق ''اصل میں طریقۂ تشخیص نہیں بلکہ طریقۂ دستیابی محصول ہے۔'' تاہم دفتری دستاویز ''نگارنامۂ منشی'' کے مطابق غلہ بخشی زرعی محصولات کی تشخیص اور حصولیابی کا سب سے بہتر طریقہ تھا۔ کیونکہ اس میں کاشت کار اور ریاست (حکومت) دونوں موسمی ایزار سانی کا جوکھم برابر اٹھاتے تھے۔ ''نگارنامۂ منشی'' اور ''احکامات عالمگیری'' کے مطابق حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کسی مخصوص گاؤں کی پیداواری صلاحیت کی پڑتال کے لیے مناسب طریقہ تھا۔ فرہنگ کاردانی کے مطابق یہ طریقہ اس وقت فائدہ مند ہو جاتا تھا جب بازاروں میں اناج کی قیمت بڑھ جاتی تھی۔ ابوالفضل کے مطابق حکومت کے نظرئے سے یہ طریقہ بہت مہنگا تھا ۔ کیونکہ اس میں بڑی تعداد میں مستعد اور چوکنے نگہبانوں کی ضرورت پڑتی تھی ورنہ اس میں بے ایمان اور غیر دیانتدار اہلکاروں کے ذریعہ وصولیابی میں بدعنوانی کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔ لہذا ''آداب عالمگیری'' کے مطابق جب اورنگ زیب نے اس طریقے کو دکن میں لاگو کیا تو محصولات کی وصولیابی کا خرچ، چاق و چوبند نگہبانی کے وسیع انتظام کے سبب دوگنا ہو گیا۔

10.3.2 ہست و بود (*Hast-o-Bud*)

یہ زرعی محصولات کی تشخیص کے طریقوں میں سب سے سہل اور مختصر طریقہ تھا۔ اس کے تحت تشخیص کار (Assessor) گاؤں کا معائنہ کر کے اچھی اور بری زمین کے رقبات کا اندازہ کر کے کل پیداوار کا تخمینہ لگاتا تھا۔ اور اس کی بنیاد پر محصولات

کا تعین کرا دیتا تھا۔ اسی طرح ایک اور بہت ہی آسان اور سر سری طریقہ یہ تھا کہ ہلوں کی تعداد کا شمار کر کے علاقے میں رائج شرح کے مطابق محصولات کا تعین کیا جاتا تھا۔ ان دونوں طریقوں کی کمیاں صاف نظر آتی ہیں۔ پہلے طریقے میں ہر چیز تشخیص کار کی ایمانداری اور تجربے پر منحصر ہوتا تھا۔ اور دوسرے میں مطالبات محصول کی عدم یکسانیت نظر آتی ہے۔

10.3.3 کنکوت/دانہ بندی (*Kankut*)

ہست و بود طریقۂ تشخیص کی کمیوں کی اصلاح کچھ حد تک ایک نئے طریقے ''کنکوت'' کے نفاذ سے دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طریقے کو ''دانہ بندی'' بھی کہا گیا ہے۔ ابوالفضل اور دیگر عصری تحریروں کے مطابق ''کنکوت'' دو لفظوں ''کن'' اور ''کوت'' کا مرکب ہے۔ ''کن'' کے معنی ''اناج'' اور ''کوت'' کا مطلب ''پیمائش'' ہے۔ اسی طرح ''دانہ'' یعنی اناج اور ''بندی'' یعنی پیمائش ہے۔ اسی طریقے میں مطالبات محصول کا تعین دو مراحل میں کیا جاتا تھا۔ پہلے زمین کی پیمائش جریب (رسی) یا قدموں سے ناپ کر کی جاتی تھی۔ اس کے بعد ہر فصل کے لیے الگ الگ شرح پیداوار کا تخمینہ نکال کر پوری فصل زمین پر مقدار محصول کا تعین کر لیا جاتا تھا۔ اگر تشخیص کار کو محض معائنہ کی بنیاد پر شرح پیداوار کا تخمینہ نکالنے میں کسی طرح کی دقت معلوم ہوتی تھی تو وہ عمدہ، اوسط اور ادنی زمینوں کی شرح پیداوار کے نمونوں کی پیمائش کر کے ایک اوسط شرح پیداوار کا تخمینہ نکال لیتا تھا۔ ابوالفضل کے مطابق طریقۂ کنکوت کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ بنیادی طور پر اس میں مطالبات محصول کا تعین جنس میں کیا جاتا تھا۔ لہذا ''دستور العمل نویسندگی'' اور ''خلاصۃ السیاق'' کے مطابق طریقہ کنکوت میں پہلے پوری فصل کی شرح پیداوار کی بنیاد پر تشخیص کر لی جاتی تھی پھر اس میں سے ''کاشت کار کا حصہ'' نکال لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد بچے ہوئے حصے، (محصول) کو الگ الگ فصلوں کے لیے نرخ بازار کی فہرست (schedule of prices) کے مطابق نقد میں منتقل کر لیا جاتا تھا۔

اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ طریقہ کنکوت یا دانہ بندی حقیقی پیداوار پر مبنی ہونے کی وجہ سے بہت حد تک طریقۂ غلہ بخشی سے مشابہ ہے لیکن اس میں نگہبانی اور فصلوں سے اناج الگ کرنے کی عدم ضرورت کی وجہ سے یہ کافی سستا تھا۔ جبکہ پیمائشی درستگی کے لحاظ سے بہت کارگر بھی تھا۔ پھر بھی اس طریقے میں تشخیص کار کو شرح پیداوار کا تعین کرنے کے وسیع اختیارات کی وجہ سے بدعنوان ہونے کے امکانات موجود تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بھکر کے گورنر نے 76-1575ء میں وہاں کے تشخیص کار کو وسیع تر اختیارات سے محروم کرنے کے لئے حکم جاری کیا کہ ''طریقہ کنکوت کے تحت محصول کی شرح یکساں طور پر پانچ من فی بیگہ کے حساب سے طے کی جائے''۔ اس طریقے کے نفاذ کی وجہ سے ہر فصل کے لئے ہر موسم میں پیمائش کی ضرورت بہت حد تک کم ہو گئی۔ اس کی وجہ سے مغلیہ حکومت کا زرعی محصولات کا نظام طریقۂ ضبطی کی سرحد کے قریب پہنچ گیا۔ عرفان حبیب کے مطابق لفظ ''ضبط'' کو ہندوستانی محصولاتی تحریروں میں ایک تکنیکی معنی میں لیا جاتا ہے۔ جو عصری لغات میں موجود نہیں ہے۔ یہ جریب یا عمل جریب کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جن کی بنیاد پر پیمائش اور تشخیص کا عمل انجام دیا جاتا تھا۔ لہذا بقول عرفان حبیب ''کنکوت'' بطور ''ضبط کنکوت'' نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ تشخیص شدہ زمین کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن اصلا ضبط ''اپنے آپ میں ایک الگ ہی طریقۂ تشخیص تھا''۔

10.3.4 ضبط (*Zabti*)

مغل عہد کے زرعی محصولات کی تخمینہ کاری کا اہم ترین اور موثر طریقہ 'ضبط' تھا۔ اس طریقۂ تشخیص کی ابتداء شیر شاہ کے حکومت میں ہوئی تھی۔ جسے غالباً اکبر نے اپنی حکومت کی ابتدائی زمانے میں نہ صرف نافذ کیا بلکہ اس میں سلسلہ وار تجربات اور اصلاحات کر کے کمال تک پہنچادیا۔ اس کی ابتداء، ارتقائ، اور انتہاء تک پہنچنے کی تفصیل ابوالفضل کی آئین اکبری اور سترہویں صدی کے متعدد تحریروں سے حاصل ہوتی ہے۔ آئین کے مطابق شیر شاہ اور اس کے وارث اسلام شاہ کے عہد میں پورا 'ہندوستان' ضبط کے تحت لایا گیا تھا۔ مغل عہد کی عصری تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ نے پولج اور پروتی قسم کی زمینوں کے لئے جو عام طور پر بے کاشت نہیں ہوتی تھیں۔ شرح پیداوار (Crop Rate) کا تعین کر دیا تھا۔ جسے ''ریع'' کہا جاتا تھا۔ یہ 'ریع' تین قسم کی شرح پیداوار اعلیٰ، اوسط، اور ادنی درجوں کی پیداوار پر مبنی ہوتی تھی۔ ان تینوں شرحوں کا اوسط ہی پیداوار کی عام شرح کے طور پر قبول کر لی گئی تھی۔ اور اس کا ایک تہائی حصہ زرعی محصول کی مقدار کے طور پر طے کر دیا گیا تھا۔ ابتداء میں اکبر نے شیر شاہ کے ذریعہ طے شدہ ریع کو ہی نافذ العمل رکھا۔ اپنی تخت نشینی اور اس کے نتیجے میں اٹھنے والے سیاسی غبار کے چھٹنے کے بعد جب اکبر نے مغلیہ تخت پر اپنی گرفت مستحکم کر لی تو اپنی توجہ مالی معاملات خصوصاً زرعی محصولات کی طرف ڈالی ۔ اکبر کے ذریعہ تشکیل شدہ نظام محصول خصوصاً زرعی محصولات کے ارتقاء کو دو، ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور اکبر کے آٹھویں سن جلوس (Regnal year) 1563ء سے انیسویں سن جلوس 75-1574ء تک ہے۔ جس دوران زرعی نظام محصول میں کئی چھوٹے چھوٹے تجربات نظر آتے ہیں۔ دوسرا دور 75-1574ء سے لیکر 81-1580ء تک کا ہے۔ جس میں زرعی محصول کی شرحوں کو دائمی شکل دینے کی کوشش کی گئی اور جس کا نتیجہ ''نظام ضبط'' کے طور پر سامنے آیا۔

اس سلسلے میں پہلا قدم اکبر کے آٹھویں سن جلوس 1563ء میں اٹھایا گیا جب اعتماد خان کو ''خالصہ اراضیات'' کا انتظام سونپا گیا۔ اس نے جاگیر داری اراضیات کی تفتیش کی اور اس سے خالصہ کو نہ صرف الگ کرنے کا کام کیا گیا بلکہ جاگیر داری اراضیات سے تمام زائد زمینوں کی شناخت کر کے انہیں خالصہ میں شامل کیا گیا۔ یعنی اعتماد خان نے خالصہ اور جاگیر کی زمینوں کی تفصیلی حد بندی کر دی۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اکبر کے نویں سن جلوس 1564ء میں مظفر خان تُربتی کو ''دیوانِ کل'' کے طور پر مقرر کیا گیا۔ ان کے ساتھ ہی راجہ ٹوڈر مل کو بطور معاون مقرر کیا گیا۔ اکبر کے دسویں سن جلوس 66-1565ء میں مظفر خان نے مقامی قانون گویان سے ان کے علاقے کی زرعی تفصیلات - رقبہ اراضیات، شرح پیداوار، مقامی بازار میں اناج کی قیمتیں وغیرہ طلب کی اور گیارہویں سن جلوس 67-1566ء میں کچھ اصلاحات کی گئیں۔ اس کے تحت مقامی محصولاتی عہدیداروں کو حکم دیا گیا کہ حاصل شدہ شماریات کی بنیاد پر شرح محصول کا تعین کریں۔ انیسویں سن جلوس 75-1574ء تک آتے آتے حکومت کے پاس تقریباً پورے مغلیہ ہندوستان کے بڑے علاقے کی زرعی شماریات جمع ہو چکی تھی۔ جس کی بنیاد پر اوسط شرح پیداوار کا تعین کر کے اوسط شرحِ محصول کا تعین کر دیا گیا۔

75–1574ء میں اکبر نے ایک نئے تجربہ کی شروعات کی جو 'کروڑی تجربہ' کے نام سے معروف ہے۔ اس کے تحت پورے 'ہندوستان' کو جاگیر سے نکال کر خالصہ کے تحت لایا گیا۔ اور شمالی ہند کے تقریباً تمام علاقے میں 'کروڑی' کے نام سے عہدیدار کی تقرری کی

گئی۔ جنہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اپنے اپنے متعینہ علاقے سے حقیقی پیداوار، فصلوں کی علاقائی قیمتیں، زمین کی پیداواری صلاحیت وغیرہ کے سال بہ سال تفصیلی اعداد و شمار جمع کریں۔ 1580ء میں ان اعداد و شمار کی بنیاد پر اکبر نے ''آئین دہ سالہ'' کو متعارف کرایا اس کے تحت 1580 سے قبل کے دس سال کے اعداد و شمار کی بنیاد پر الگ الگ فصلوں کے لیے اوسط شرح پیداوار اور اوسط قیمتوں کے شماریات کی بنیاد پر اوسط مجموعی پیداوار کا تعین کیا گیا۔ اس کا ایک تہائی حصہ حکومت کا کمترین مطالبۂ محصول تھا۔ 'کروڑی' تجربہ کے تحت تمام صوبہ جات کی پیائش کی گئی۔ رَسّی کی جریب کی جگہ لوہے کے چھلے لگے بانس کے ڈنڈے جنہیں ''طناب'' کہا جاتا تھا استعمال کیا گیا۔ الگ الگ علاقوں کی شرح پیداوار اور رائج قیمتوں کی یکسانیت کی بنیاد پر ہر صوبہ کو الگ الگ محصولاتی حدود (Revenue Circles) میں تقسیم کر دیا گیا انہیں محال بھی کہا گیا ہے۔ جو پرگنے سے مختلف ''محصولاتی اکائی'' تھی چونکہ ہر محال کی شرح پیداوار اور فصلوں کی قیمتیں مختلف تھیں۔ لہذا ہر محال کے لیے وہاں کی شرح پیداوار اور رائج قیمتوں کی بنیاد پر ہر فصل کے لئے علاحدہ علاحدہ نقد شرح محصول طے کر دی گئیں۔ اسی نقد شرح محصول کو ''دستور'' یا ''دستور العمل'' کہا گیا ہے۔ اس طرح یہ طریقۂ تشخیص اپنے تجرباتی سفر کے اختتام پر پہنچا اور ''طریقہ ضبط'' کی اصطلاح سے معروف ہوا۔ اس طریقہ کی اہم عملی خصوصیات مختصراً درج ذیل ہیں۔

- اس طریقۂ تشخیص میں زمین کی پیائش لازمی تھی۔
- ہر فصل کے لئے نقد محصول کی شرح متعین تھی۔ جس کو دستور العمل یا دستور کہا جاتا تھا۔
- محصولات کی وصولی نقد رقم میں کی جاتی تھی۔
- متعینہ دستور کی وجہ سے محصولات کی وصولی کرنے والے مقامی عہدیداروں کو اپنی من مانی کرنے کا موقع نہیں تھا۔
- دائمی دستور کے تعین سے مطالبات حصول کی وصولی اور ادائیگی میں غیر یقینی اتار چڑھاؤ کی کیفیت بہت حد تک کم ہو گئی تھی۔

ان خصوصیات کے باوجود یہ طریقۂ تشخیص نقص و قیود سے خالی نہیں تھا۔ جن کی نشاندہی ذیل میں کی جاتی ہے۔

- یہ طریقۂ تشخیص ان علاقوں کے لئے موزوں نہیں تھا جہاں کی زمینوں کی پیداواری صلاحیت یکساں نہیں تھی۔
- زمین کی پیداوار میں اگر کسی بھی وجہ سے کمی آتی تھی تو اس کا خمیازہ کاشتکاروں کو بھگتنا پڑتا تھا۔
- کاشتکاروں کے نظریہ سے یہ طریقہ مہنگا تھا۔ کیونکہ انہیں پورے محصول کا ایک فیصد الگ سے تشخیص کار اہلکاروں کے اخراجات کے لئے دینا پڑتا تھا۔
- اس طریقہ میں پیائش اور پیداوار کی تشخیص کرنے والے اہلکاروں کو بدعنوانی کرنے کے زیادہ امکانات تھے۔

''ضبط'' کا نفاذ مغلیہ سلطنت کے چھ صوبہ جات دہلی، الٰہ آباد، اودھ، آگرہ، لاہور اور ملتان میں کیا گیا تھا۔ تاہم ملک کے دیگر علاقوں کے ساتھ ساتھ متذکرہ چھ صوبوں میں بھی علاقائی حالات کی مناسبت سے دیگر طریقہ تشخیص کو بھی عملی طور پر رائج رکھا گیا۔

10.3.5 نسق

غلہ بخشی، کنکوت، ہست وبود، اور ضبط جیسے طریقۂ تشخیص کے علاوہ ایک اور طریقہ مغل عہد کی محصولاتی تحریروں میں نظر آتا ہے اور جس کی نوعیت واستعمال پر مؤرخین اور دانشوروں کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ہے ''نسق''۔ لفظ ''نسق'' کا ادبی مطلب نظم یا انتظام سے ہے۔ ابوالفضل نے اس اصطلاح کا استعمال اپنی تحریروں میں متعدد مقامات پر کیا ہے لیکن کہیں بھی اس کا مطلب واضح نہیں کیا ہے۔ عہد جدید کے مؤرخین نے اس پر کافی مباحثہ کیا ہے۔ لیکن ان کے ذریعہ اخذ کئے گئے مطالب کو یقینی طور پر قبول کرنا مشکل ہے۔ نسق سے متعلق ابوالفضل کی تحریروں کے اقتباسات کو یکجا کر کے عرفان حبیب نے جو تجزیہ کیا ہے اس کے مطابق نسق اپنے آپ میں قطعی طور پر کوئی نرالا طریقہ تشخیص نہیں تھا۔ بلکہ رائج طریقہ تشخیص کا ذیلی یا معاون قاعدہ تھا۔ مثلاً ہندوستان میں یہ طریقہ ضبط کا معاون اور کشمیر میں طریقہ غلہ بخشی کا معاون نظر آتا ہے۔ اس طرح یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نسق ایک ایسا قاعدہ تھا۔ جو کسی بھی بنیادی طریقہ تشخیص کے ساتھ بطور معاون جوڑ کر استعمال کیا جاسکتا تھا۔ لہذا ابوالفضل نے اس ضمن میں جو اصطلاح بطور ''نسق ضبطی'' یا ''نسق غلہ بخشی'' استعمال کی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نسق خود میں کوئی آزاد طریقہ تشخیص نہیں تھا۔ چونکہ طریقہ ضبط میں مختلف فصلوں کی زیر کاشت زمینوں کی پیائش سال بہ سال کیے جانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ جو ایک پریشان کن عمل تھا۔ لہذا کاشت کار اور حکومت دونوں کے حق میں تھا کہ ہر سال پیائش سے نجات حاصل ہو جائے۔ اس لئے بلا تفریق طریقہ تشخیص کچھ ترمیمات کے ساتھ گزشتہ سال کے پیائشی شماریات کو ہی موجودہ سال کی فصلوں کے محصول کا حساب لگانے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ اس سلسلہ میں عرفان حبیب نے اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ '' اگر ہم ان تمام معلومات کو مجموعی طور پر دیکھیں جو ابوالفضل نے نسق کی مختلف صورتوں میں استعمال کے سلسلہ میں فراہم کی ہے۔ تو بلا تفریق شکل نسق، جزوی یا مکمل طور پر تشخیص کاری کا عمل ہر سال نئے سرے سے نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ ایک بار حاصل کیے گئے شماریات کا ہی استعمال سال بہ سال کیا جاتا تھا۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ابتدائی تشخیص زمین کے رقباتی شماریات، نقد کی مقدار، غلے یا اناج کی مقدار، یا ہلوں کی تعداد میں سے کس کی بنیاد پر کی گئی تھی یا کس کو دہرایا گیا تھا۔ لہذا طریقہ تشخیص کے قطع نظر موجودہ سال میں محصول کے تعین کے لئے گزشتہ برسوں کے اعداد وشمار یا شرحوں کی قبولیت کا قاعدہ ہی نسق تھا۔''

10.3.6 اجارہ (Revenue Farming)

مغل عہد کے محصولاتی دستاویزات میں متذکرہ بالا مختلف طریقہ تشخیص کے علاوہ ایک اور اصطلاح نظر گزار ہوتی ہے۔ اس کا استعمال ایک منفرد طریقہ تشخیص وحصول کے طور پر کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ تھا ''اِجارہ'' یا ''اجارہ داری'' اس سے مراد زرعی محصولات کے تعین کا ایسا طریقہ ہے جس کے تحت کوئی گاؤں یا جاگیر یا کوئی خاص علاقہ کسی فرد (اجارہ دار) کو ایک مخصوص مقدارِ محصول کے عوض متعینہ مدت کے لئے دیدیا جائے اور اجارہ دار کو اس علاقے کے کاشتکاروں سے تشخیص شدہ شرح کے مطابق محصولات کی وصولی کا اختیار تفویض کر دیا جائے۔ یہ طریقہ گو کہ انتظامی نقطہ نگاہ سے آسان اور فائدہ مند نظر آتا ہے۔ کیون کہ اس کے تحت حکومت کو یکمشت محصولات کے پیشگی حصول کا امکان ہوتا تھا۔ لیکن عملی طور پر اس کی باطنی خرابیوں کے پیش نظر مغلیہ حکومت نے عام طور پر نہ تو اس کی حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی اسے دائرۂ قانون میں شامل کیا۔ پھر بھی یہ طریقہ عملی طور پر مغل عہد کے محصولاتی نظام میں جابہ جا نظر آجاتا ہے۔ محصولاتی تحریروں کا جائزہ لینے پر

معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقے کا استعمام عام طور پر ویران شدہ علاقوں کی زرعی تجدید کاری، نئے علاقوں کو زیر کاشت لانے یا ان علاقوں جہاں کے کاشت کار قدرتی آفات یا قحط سالی کی وجہ سے صلاحیتِ کاشت سے محروم ہو جاتے تھے، کی زرعی سرگرمیوں کو بحال کرنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ لیکن کسی بھی حالت میں کسی محصولاتی عہدیدار یا اہلکار، چودھری، قانون گو، مقدم یا ان کے کوئی رشتہ دار یا تعلقاتی کو اجارہ داری حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اصولی طور پر کسی اجارہ دار کو کاشتکاروں سے تشخیص شدہ شرح سے زیادہ محصول کا مطالبہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ لیکن عرفان حبیب کو اس میں شبہہ ہے کہ اجارہ دار کبھی ان معیاری اصولوں کی پاسداری کرتے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجارہ داری کا رواج ضبطی صوبہ جات، گجرات، مغلیہ دکن اور علاقات خالصہ میں نہیں تھا۔ لیکن علاقات جاگیر میں یہ آہستہ آہستہ عام ہو گیا تھا اور سترہویں صدی کے اختتام تک اکثر بڑے جاگیر دار محصول کی یکمشت وصول یابی کے عوض اپنی جاگیروں کو نیلامی کے ذریعہ سب سے زیادہ بولی لگانے والے اجارہ دار کو اجارہ کرنے لگے تھے۔ کہیں کہیں بڑے اجارہ داروں نے اپنے علاقے کے کچھ حصوں کو اپنے ماتحتوں یا سپاہیوں کو ذیلی اجارہ کے طور پر تفویض کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اٹھارویں صدی میں اجارہ داری کا طریقہ محصول کی تشخیص اور حصول کے لئے بہت ہی عام ہو گیا تھا۔

10.4 مقدار مطالبۂ زرعی محصول (Quantity of Land Revenue Demand)

عہد مغلیہ کے زرعی نظام کی مرکزی خصوصیت تھی حکومت کے ذریعہ کاشتکاروں کی پیداوار سے اس تمام زائد حصہ کا (زرعی محصولات کی شکل میں) وصول کر لیا جانا جو اس کے خاندان کی بقائے زندگی سے فاضل ہوتا تھا۔ یہی زرعی محصولات مغلیہ حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ جس کی وصول یابی کے معاملے میں حکومت کی طرف سے ہمیشہ سختی کا مظاہرہ کیا جاتا ہوگا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مغلیہ حکومت کے عام کاشت کار وسائلِ بقائے زندگانی کی دستیابی کے تعلق سے پستی کی سب سے نچلی سطح پر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ''ولندیزی کاروباری تاجر (Dutch Factor)'' گیلنسن جون کے مطابق کاشتکاروں پر زرعی محصولات کا اتنا زیادہ بوجھ تھا کہ ''وہ اپنی معمولی گزر بسر سے زیادہ کچھ بھی بچا نہیں پاتا تھا... اور ان کے حصہ میں اتنا کم بچتا تھا کہ عام طور پر اسے سنبھال کر رکھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا تھا''۔ پھر دوسرا ولندیزی (Dutch) تاجر پلسارٹ مغل عہد کے تفویضِ محصولاتِ اراضی (Land Revenue Assignment) کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ''کاشتکاروں سے کتنا کشید کر لیا جاتا ہے کہ پیٹ بھرنے کے لئے اس کے پاس سوکھی روٹی بھی کبھی کبھار میسر ہوتی تھی''، حقیقت میں زرعی محصولات اور فاضل پیداوار (Surplus Produce) کا موازنہ حکومت کے دفتری فلسفے کا حصہ نہیں تھا۔ اس پر عرفان حبیب تبصرہ کرتے ہیں کہ ''مطالبۂ محصول دیگر ٹیکسوں اور عہدیداروں کے مستقل و غیر مستقل مطالبات کے ساتھ مل کر کاشتکاروں پر بڑا بوجھ تھے''۔

یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ مغل عہد میں فاضل پیداوار کی مقدار اور کل حقیقی پیداوار کا تناسب کیا تھا۔ لیکن یہ اندازہ لگانا ممکن ہے کہ زمین کی پیداواری صلاحیت آب و ہوا اور سماجی حالات کی تفریق کے لحاظ سے ٹیکس دھندگان (کاشت کار) کی بقائے زندگی کے لئے لازمی وسائل (زرعی پیداوار میں ضروری حصہ) کی مقدار بھی علاقہ بہ علاقہ مختلف رہی ہوگی۔ اگر یہ مان لینا درست ہے کہ زرعی محصولات کی مقدار

عمومیت سے کاشتکاروں کی فاضل پیداوار سے زیادہ نہیں ہوتی تھی تو یہ بھی قبول کرنا پڑے گا کہ حکومت کی طرف سے شرح محصول اس طرح طے کی جاتی ہوگی جو علاقے کی مروجہ شرح سے مطابقت رکھتی ہوگی یا اس سے کم ہوگی۔ مغل عہد کی تحریروں میں اکثر ایسے بیانات درج ہیں جو زرعی محصول کی مقدار کے کل پیداوار کا خاص حصہ بتاتے ہیں۔ لیکن کل زرعی پیداوار مطالبۂ محصول (فاضل پیداوار) اور کاشتکاروں کی بقائے زندگی کے لئے لازمی پیداوار کی مقدار کے تناسب کے تعلق سے عرفان حبیب تبصرہ کرتے ہیں کہ 'مقدارِ مطالبۂ محصول اور کل حقیقی پیداوار کے درمیان کوئی راست رشتہ یا تناسب نہیں تھا۔' لیکن ابوالفضل جس کو شاہی نظریات کا معتبر اور مستند ترجمان سمجھا جاتا ہے واضح طور پر یہ کہتا ہے کہ ''حکمراں کے تئیں رعایا کی مالی ذمہ داریوں کے تعلق سے کوئی اخلاقی حد طے نہیں کی جاسکتی کیونکہ حکمراں ہی رعایا کی زندگی اور عزت وآبرو کا محافظ ہوتا ہے۔ لہذا رعایا کو اس کی تمام تر پیداوار حکمراں کی نظر کرنے کی صورت میں بھی انہیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' لیکن یہ ترجمان اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہنے سے باز نہیں آتا کہ ''ایک عادل حکمراں اپنی رعایا سے ضرورت سے زیادہ کا طلب گار نہیں ہوتا جس کا تعین وہ خود کرتا ہے''۔ تب اگر مطلوبہ محصولات کی مقدار فاضل پیداوار سے تجاوز نہیں کرتی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ٹیکس دھندہ کے بڑے پیمانے پر تباہی سے مستقبل میں محصولات میں بھاری کمی آجاتی جو حکومت کے پورے انتظامی ڈھانچے کے مقصدِ وجود کو خود ہی شکست دیدیتا اس سلسلہ میں اورنگ زیب واضح طور پر کہتا ہے کہ محصول کی وصولی شریعت کے مطابق کی جانی چاہیے جو کل پیداوار کے نصف حصہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔

زمین کی پیداواری صلاحیت کی بنیاد پر شیر شاہ نے الگ الگ فصلوں کے لئے تین الگ الگ شرحوں کا تعین کیا پھر ان کے اوسط شرح کا شمار کرکے اس کا ایک تہائی شرح محصول کی شکل میں لازم کردیا۔ ابوالفضل کے مطابق عہد اکبری میں شیر شاہ کے ذریعہ طے کیا گیا کل پیداوار کا ایک تہائی حصہ محصول کی سب سے کم شرح تھی۔ جدید تحقیقات کی بنیاد پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغل عہد میں زرعی محصولات کی شرح کل پیداوار کی ایک تہائی (1/3) سے نصف (1/2) کے درمیان اور کہیں کہیں تین چوتھائی (3/4) تک بھی ہوتی تھی۔ تاہم محصولاتی نظام کے باریک مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ پورے مغلیہ ہند میں مطالباتِ زرعی محصول کی شرح صوبہ بہ صوبہ اور محال بہ محال تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ کشمیر میں یہ مطالبہ اصولی طور پر کل پیداوار کا ایک تہائی تھا لیکن عملی طور پر یہ دو تہائی (2/3) تک وصول کرلیا جاتا تھا۔ اکبر نے احکامات جاری کئے تھے کہ محصول کی شکل میں کل پیداوار کا صرف نصف حصہ ہی طلب کیا جائے۔

صوبۂ سندھ کے ٹھٹہ علاقے میں کل پیداوار کے ایک تہائی کے شرح سے محصول کی وصولی کی جاتی تھی۔ سترہویں صدی کی 1634ء میں تصنیف کردہ ''مظہر شاہ جہانی'' میں اس کا مصنف یوسف میرک بیان کرتا ہے کہ آئین اکبری کی تالیف کے زمانے میں ٹھٹہ کے ترخان جاگیر دار وہاں کے کاشتکاروں سے کل پیداوار کے نصف کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور بعض بعض معاملات میں یہ شرح دو تہائی یہاں تک کہ تین چوتھائی تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ صوبۂ اجمیر میں مطالباتِ محصول کی مختلف شرحیں پائی جاتی ہیں۔ مشرقی راجستھان جیسے زرخیز علاقے میں یہ شرح کل پیداوار کا ایک تہائی سے نصف تک ہوتی تھی۔ آئین میں دستیاب شماریات کی بنیاد پر عرفان حبیب یہ واضح کرتے ہیں کہ ریگستانی علاقوں میں محصول کی شرح کل پیداوار کا ساتواں (1/7) یا آٹھواں (1/8) حصہ تھے۔ جیسلمیر کے علاقوں میں ربیع کی فصلوں کی کل پیداوار

کا پانچواں اور خریف کی فصلوں کی کل پیداوار کا چوتھائی حصہ بطور محصول وصول کیا جاتا تھا۔ وہیں اٹھارویں صدی کے ابتدائی سالوں کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آمیر کے علاقے میں کل پیداوار کا چالیس پینتالیس فی صد تک محصول کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔ مرکزی ہندوستان (صوبۂ مالوہ) میں زرعی محصول کی شرح کل پیداوار کا نصف (1/2) سے (2/5) پنجبروئی تک تھی۔ مغلیہ دکن میں عام طور پر کل پیداوار کا نصف بطور محصول وصول کیا جاتا تھا۔ وہیں چاہی فصلوں (کنویں سے آب یاری کی گئی) زمینوں سے ایک تہائی اور جنس کامل (cash crops) کی پیداوار سے ایک چوتھائی کی شرح پر محصول کی وصولی کی جاتی تھی۔

رسک داس کو جاری کئے گئے فرمان میں اورنگ زیب یہ واضح کرتا ہے کہ پریشان حال کاشت کاروں کے معاملہ میں جب محصولاتی عملہ طریقۂ غلہ بخشی کا نفاذ کریں تو کاشتکاروں کی حالت کے پیش نظر محصول کی شرح کل پیداوار کا نصف یا ایک تہائی یا پنجبروئی (پانچ میں سے دو حصے 2/5) رکھی جائے یوں تو محصول کی شرح اورنگ زیب کے عہد میں اکبر کے عہد کے مقابلے زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن یہ شاید اس وجہ سے ہوا تھا کہ اورنگ زیب کے عہد تک پہنچتے پہنچتے زرعی پیداوار کی قیمتوں میں عام طور پر اضافہ ہو چکا تھا لیکن موٹے طور پر مطالبہ محصول کی شرحوں میں اکبر سے اورنگ زیب تک کوئی قابل قدر تبدیلی یا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ مغل عہد کے زرعی نظام کی ایک منفرد خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ زرعی محصولات کی شرح کا تعین کاشتکاروں کی سماجی حیثیت پر بھی منحصر تھا۔ جو ان کے سماجی مرتبہ یعنی ان کی ذات اور طبقے سے مطابقت رکھتا تھا۔ مثلاً مشرقی راجستھان کے زرعی نظام کے مطالعہ کی بنیاد پر ستیش چندر اور دلباغ سنگھ نے اس حقیقت کی توثیق کر دی ہے۔ کہ کچھ پرگنوں میں کچھ مخصوص ذات سے تعلق رکھنے والے کاشت کار (برہمن، بنیا، راجپوت وغیرہ) محصول کی ادائیگی رعایتی شرحوں پر کرتے تھے۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں محتاط اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغل عہد میں زرعی محصولات کی شرح کا تعین زمین کی پیداواری صلاحیت، فصلوں کی جنس، آبپاشی کے طریقے، علاقائی رسم و رواج اور کاشتکاروں کی سماجی حیثیت کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ جس کی مقدار کل حقیقی پیداوار کا نصف سے ایک تہائی تک متعین تھی۔ اس کے ساتھ ہی کاشتکاروں سے مختلف چھوٹے ٹیکس جس میں محصولاتی عملے کے اخراجات، مقامی عہدیداروں اور دیہی تنظیموں کے مطالبات شامل تھے۔ اور جن کے لئے ابواب کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، وصول کئے جاتے تھے۔ یہ سب مل کر کاشتکاروں کی زرعی پیداوار پر بہت بڑا بوجھ ڈالدیتے تھے۔ ایسی حالت میں بڑے کاشتکاروں پر کم اور چھوٹے کاشتکاروں (جنکی تعداد زیادہ تھی) پر زیادہ بوجھ پڑتا تھا۔ لہذا عرفان حبیب کا یہ تبصرہ حق بجانب ہے کہ ''اگر حکومت تمام متعینہ مطالبات اور بقایاجات کی وصولی کے سلسلے میں اپنے پورے حقوق و اختیارات کے حوالے سے اصرار کرے اور مناسب اوقات و حالات میں کسی بھی طرح کی رعایت کی ممانعت کر دے تو موصولہ مقدارِ محصول خطرے کا نشان پار کر کے کاشتکاروں کی بقائے زندگی کے لازمی حصہ تک تجاوز کر جائیگی''۔

10.5 محصول کی ادائیگی کا طریقہ (Methods of Revenue Collection)

شمالی ہند کے کاشت کار شاید تیرہویں صدی سے ہی محصولات کی نقد ادائیگی کرتے رہے تھے۔ مغل عہد کے شمالی ہند میں نافذ العمل طریقۂ تشخیص (ضبط اور نسق ضبط) کے تحت محصول کی مقدار کا تعین نقد (رقم) میں ہی کیا جاتا تھا۔ جن علاقوں میں غلہ بخشی یا کنکوت کا نفاذ

ہوتا تھا وہاں بھی علاقائی بازار کی رائج نرخ کی بنیاد پر محصول کا مبادلہ نقد میں کر لیا جاتا تھا۔ نقد رقم کے ذریعہ محصول کی ادائیگی کا رواج خصوصا شمالی ہند کے ضبطی صوبہ جات میں اتنا عام تھا کہ حکومت کے پاس قحط اور قدرتی آفات کی حالت میں استعمال کئے جانے کے لائق اناج اور غلہ جمع نہیں ہوتا تھا۔ اس ضمن میں اکبر کو ایک خاص حکم جاری کرنا پڑا جس کی رو سے کل محصول کا کم از کم دس سیر فی بیگہ کی درسے جنس میں وصول کیا جائے تاکہ قحط اور قدرتی آفات کی حالت میں اناج کی فراہمی یقینی بنائی جا سکے۔ الہ آباد سے حاصل شدہ دستاویز کے مطابق ایک پورے گاؤں سے محصول کی ادائیگی نقد میں کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ بال کرشن برہمن کے ذریعہ ہریانہ کے پرگنہ سرسا کے تین گاؤں کی زرعی تفصیلات کی بنیاد پر عرفان حبیب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''اگر محصول کی وصولی جنس میں کی جاتی تھی تو اکثر یہ ضروری ہوتا تھا کہ اسے بازار میں بیچ کر نقد رقم حاصل کر لی جائے''۔

کشمیر میں ایک مخصوص قسم کا نسق رائج تھا جس کے تحت زرعی محصول کا تعین چاول سے لدے گدھے (Ass Loads) کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مختلف قسم کے ''ابواب'' کی مقدار کا تعین بھی چاول میں کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل بیان کرتا ہے کہ ''بڑا ظلم ہو اجب غلہ بخشی کے تحت ایک علاقے میں جاگیرداروں نے محصول کی ادائیگی سونے اور چاندی میں کرنے کا مطالبہ کیا لیکن فوراً ہی اکبر نے ان جاگیرداروں کی سرزنش کی اور اس طرح کے مطالبات کی سخت ممانعت کر دی''۔

تھٹّہ اور اجمیر کے کچھ حصوں میں غلہ بخشی کا طریقہ رائج تھا جس کی توسیع بعد میں ملتان اور بھکّر کی سرکاروں تک ہو گئی۔ یہاں بھی محصول کی ادائیگی جنس کا مبادلہ بازار بھاؤ پر نقد میں کر کے کی جاتی تھی۔ گجرات میں محصول کی ادائیگی عام طور پر قدیم پیمائشی طریقے اور نسق کی بنیاد پر کی جاتی تھی لیکن جو علاقے غلہ بخشی کے تحت آتے تھے وہاں جنس میں ہی وصولی ہوتی تھی۔ مغلیہ دکن میں ایک معمولی طریقۂ تشخیص کے تحت محصولات کی ادائیگی نقد رقم میں ہی کی جاتی تھی۔ یہ اس علاقے میں رائج قدیم طریقہ تھا۔ فیکٹری رکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مرشد علی خاں کے ذریعہ کچھ مدت کے لیے غلہ بخشی کا طریقہ نافذ کیا گیا تھا لیکن اس کے بعد پھر سے پیمائشی بنیاد پر محصول کا تعین نقد رقم میں ہی کیا جانے لگا۔ مرکزی ہندوستان (صوبۂ مالوہ) کے گڈھ علاقے میں ائین اکبری کے مطابق کاشت کار محصول کی ادائیگی سونے کی مہروں اور تانبے کے سکوں کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔ مشرقی ہندوستان کے کچھ حصوں میں خاص طور پر اوڑیسہ کے دیہاتوں میں دھات کے سکوں کا چلن نہیں تھا بلکہ وہاں کے لوگ لین دین کے لیے کوڑیوں کا استعمال کرتے تھے۔ لہذا ان علاقوں کے سلسلہ میں یقین سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ محصول کی ادائیگی کس طرح کی جاتی تھی۔ بنگال میں کاشت کار عمومیت سے محصول کی ادائیگی نقد رقم میں ہی کرتے تھے۔ لیکن کہیں کہیں غلہ بخشی کا طریقہ بھی رائج تھا۔ تزک جہانگیری سے معلوم ہوتا ہے کہ سلہٹ کے علاقے میں کاشت کار محصول کی ادائیگی اپنے بچوں کو پیش کر کے کرتے تھے جنہیں غالبا ہیجڑے یا خواجہ سرا کے طور پر پروان چڑھایا جاتا تھا۔ امراء کے حرم میں ان کی کافی مانگ تھی۔ لہذا محصول وصول کرنے والوں کے لیے یہ نقد رقم حاصل کرنے کا سود مند ذریعہ تھے۔

متذکرہ بالا معلومات کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کشمیر اور اوڑیسہ اور راجستھان کے کچھ دور دراز کے علاقوں کو چھوڑ کر پورے مغلیہ ہند میں محصول کی ادائیگی نقد رقم میں کی جاتی تھی۔ نقد رقم میں محصول کی ادائیگی کی ترویج کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ عمومیت سے

کاشتکاروں کو مطالبات محصولات کی ادائیگی کے لئے اپنی فاضل پیداوار فصلوں کی تیاری کے وقت ہی بازار میں فروخت کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا تھا جس کے نتیجے میں کاروباری یا بازاری معیشت کی شروعات ہوتی نظر آتی ہے۔

10.6 زرعی محصولات کی وصولیابی (The Collection of Land Revenue)

طریقۂ غلہ بخشی کے علاوہ تشخیصِ محصول اور وصولیِ محصول دو مختلف کام تھے۔ غلہ بخشی کے تحت عمومیت سے زرعی پیداوار سے حکومت کا محصول اور کاشت کار کا حصہ فصل کی کٹائی یا تیاری کے وقت ہی کھیت یا کھلیان میں تقسیم کر لیا جاتا تھا۔ لہذا اس میں الگ سے تشخیص کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ دیگر طریقوں میں تشخیص کا کام فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے درمیان کی مدت میں کیا جاتا تھا۔ لیکن محصول کی وصول یابی کا کام بلا تفریق نقد و جنس عمومیت سے فصل کی کٹائی اور تیاریوں کے وقت کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل کے مطابق ''عمل گزار (محصول وصول کرنے والے کارندے) کو ربیع کی فصلوں کی حصول یابی کا عمل ہولی (مارچ میں آنے والے تہوار کے دن) سے اور خریف کی فصلوں کا دشہرہ (اکتوبر میں آنے والا تہوار) سے شروع کر دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی گئی تھی کہ محصولات کی وصولیابی قاعدے کے مطابق فصلوں کی تیاری کے وقت ہی کر لی جائے، آئندہ سال کے لئے نہ چھوڑا جائے۔ خریف کی مختلف فصلوں کی تیاری چوں کہ مختلف وقتوں پر ہوتی تھی لہذا اسی مناسبت سے محصولات کی وصولی تین مرحلوں میں کی جاتی تھی۔ اس طرح خریف کی فصلوں کے محصولات کی وصولی مرحلہ وار (قسطوں میں) کرنا ایک ضرورت تھی فصلوں کی نوعیت کے لحاظ سے اس کی تائید و توثیق رسک داس کو جاری کئے گئے اورنگ زیب کے فرمان سے بھی ہوتی ہے۔

چونکہ ربیع کی فصلوں کی کٹائی اور تیاری بہت کم وقت میں ہوتی تھی۔ لہذا ''سیاق نامہ'' کے مطابق محصولاتی عملے اکثر فصلوں کی تیاری اور انہیں کھیتوں کھلیانوں سے اٹھنے سے قبل ہی محصولات کی وصولیابی کرنے کو بے قرار رہتے تھے۔ محصولاتی عملے کی مسلسل عجلت اور بے قراری کے نتیجے میں کاشتکاروں کو محصول ادا کرنے سے قبل فصلوں کی کٹائی اور تیاری کرنے سے روکنے کا رواج عام ہو گیا۔ اس کی توثیق اورنگ زیب کے دستورالعمل ''سیاق نامہ'' اور برٹش تاجر پیٹر منڈی کی تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد پر عرفان حبیب کا تبصرہ ہے کہ ''یہ حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فصلوں کی تیاری سے پہلے ہی کاشتکاروں سے محصولات کا مطالبہ کرنا کس قدر ظالمانہ فعل تھا۔ وہ بھی تب جبکہ اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچتا تھا''۔ محصول کی رقم عام طور پر عمل گزاروں یا عاملوں (Revenue Collectors) کے ذریعہ سرکاری مال خانے (Treasury) میں جمع کی جاتی تھی لیکن اکبر نامہ کے مطابق ٹوڈرمل نے یہ تجویز رکھی تھی کہ کاشت کار خود براہ راست محصول کی رقم سرکاری مال خانے میں جمع کرنے کو ترجیح دیں۔ کاشت کار یا ان کے نمائندے یا گاؤوں کے کارندے کو محصول کی رقم یا جنسیں فوطہ خانے (مال خانے) میں جمع کرتے وقت فوطہ دار یا محصول حاصل کرنے والے عہدیداروں سے قاعدہ کے مطابق رسید حاصل کرنے کا حق حاصل تھا۔ دوسری طرف خزانہ دار (Treasurer) کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ محصولات کے رجسٹر میں پٹواری سے محصول کی رقم کی توثیق کرالے یہ تمام قاعدے حکومت کی محصولاتی آمدنی اور کاشتکاروں کی مالی حفاظت کے مقصد سے احتیاطی تدابیر کی شکل میں نافذ العمل تھے۔

10.7 راحتی اقدامات (The Relief Measures)

مغلیہ زرعی نظام کا بنیادی مقصد لگاتار بڑھتے ہوئے زرعی محصول کی حصول یابی تھا۔ لیکن جو زراعت عمومیت سے مختلف قدرتی وسائل پر منحصر ہو اس میں پیداوار کا اتار چڑھاؤ ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مغلیہ حکومت میں زرعی محصول جو فاضل پیداوار (Surplus Produce) کا بڑا حصہ ہوتا تھا، کی مقدار کس طرح سال بہ سال یکساں رہ سکتی تھی؟ محصول کا تعین نقد رقم میں ہو جانے کی وجہ سے بہت حد تک مقدارِ محصول میں اتار چڑھاؤ کے رجحان کو کم کر لیا گیا تھا۔ تاہم زرعی اجناس کی قیمتوں کا انحصار بھی پیداوار کی مقدار پر تھا۔ ایسے حالات کے پیش نظر مغلیہ حکومت کے لئے لازم تھا کہ وہ زرعی محصول کی تشخیص و حصول یابی کے ساتھ ساتھ یہ بھی یقینی بنائے کہ کسی وجہ سے زراعت کے نقصان کی صورت میں کاشت کاروں کی راحت رسانی کا بھی اہتمام ہو ورنہ حکومت زبردست مالی خسارے کا شکار ہو سکتی تھی۔

اس سلسلہ میں تشخیص کے ہر طریقے میں کچھ ایسے انتظام ضرور تھے جس کے تحت فصلوں کے خراب ہونے کی صورت میں راحت رسانی کی جاتی تھی۔ چونکہ ''غلہ بخشی'' اور ''کنکوت'' کے تحت حقیقی پیداوار سے ہی حکومت کے محصول اور کاشتکاروں کے حصہ تقسیم کر دیے جاتے تھے۔ لہذا پیداوار کے اتار چڑھاؤ کا سیدھا اثر دونوں فریقین کے حصوں پر یکساں آتا تھا۔ یعنی کسی بھی طرح کے اتار چڑھاؤ کی حالت میں حکومت اور کاشت کار دونوں کو جوکھم برداشت کرنے میں برابر شریک ہونا پڑتا تھا۔ لیکن طریقہ ''ضبط'' اور اس سے منسلک ''نسق'' کے تحت چوں کہ محصول کی شرح کا تعین دائمی اوسط شرط کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اس صورت میں زرعی پیداوار میں کمی کا اثر سیدھے کاشتکاروں پر پڑتا تھا۔ لہذا اس طریقے میں راحت راسانی کے لئے حالات کے مطابق کچھ انتظام کیا جانا لازم تھا۔ لہذا فصلوں کے خراب یا تباہ ہو جانے کی صورت میں زمینوں کے ان حصوں کو محصول کے شمار سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ یعنی خراب فصل والے یا تباہ شدہ کھیتوں کے رقبات کو پیمائش شدہ کل رقبات سے الگ کر کے محصولات کا تعین کیا جاتا تھا۔ زمین کے ایسے حصوں کو ''نابود'' کہا جاتا تھا۔ جس میں فصل تو بوئی گئی تھی لیکن فصل خراب یا تباہ ہو گئی۔

عباس خان شروانی کے مطابق شیر شاہ نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ محصول کی مقدار کی تشخیص کے وقت تو رعایتیں دی جا سکتی تھیں لیکن وصولی کے وقت نہیں۔ ٹوڈر مل کی تجویزات کے مطابق ایک بار محصول کی شرح کا تعین ہو جانے کے بعد یہ عامل یا عمل گزار کی ذمہ داری تھی کے وہ پورا پورا محصول وصول کرے اور کچھ بھی باقی نہ چھوڑے۔ محمد ہاشم کو جاری اورنگ زیب کے ایک فرمان کے مطابق فصلوں کی کٹائی کے بعد محصول کی مقدار میں کسی طرح کی تخفیف نہیں کی جا سکتی تھی۔ حکومت کی طرف سے یہ سخت موقف ایک احتیاطی قدم کے طور پر مانا جا سکتا ہے۔ تاکہ کاشت کار محصول کی ادائیگی کے وقت حیلے بہانے کے ذریعہ ادائیگی سے بچ نہ جائیں لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں لگتا کہ ہمیشہ محصول کی وصولی پوری پوری کر لی جاتی تھی۔ یا کاشت کار ہمیشہ پورا پورا محصول ادا کر دیتا تھا۔ لہذا رواں سال کے محصولات میں سے بقایا مقدار آئندہ سال کے محصولات کے ساتھ وصول کیا جاتا تھا۔ ایک سال کی خراب یا برباد فصل کاشتکاروں کے اوپر محصولات کی بقایا جات کا ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیتی تھی۔ جس میں مسلسل اضافہ ایک فطری خصوصیت تھی۔ جس کے نتیجے میں کاشتکاروں کے اوپر کئی کئی

برسوں کے بقایاجات کا بوجھ پڑ جاتا تھا۔ لہذا اورنگ زیب کے ایک فرمان کے مطابق بقایاجات میں ایک تفریق کی گئی۔ رواں سال سے پہلے سال کا جو بقایا تھا۔ وہ تو اس سال کے محصول کے ساتھ ہی ادا کیا جاتا تھا۔ لیکن پچھلے سال سے پیچھے کے سالوں کے بقایاجات جسے ''سنوات باقی'' کہا گیا ہے، کی وصولی قسطوں میں کی جاتی تھی جس کی مقدار رواں سال کے کل جمع کی پانچ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ یعنی حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کو یہ رعایت دی گئی تھی۔ کہ وہ بقایا محصولات کی رقم کے بوجھ کو قسطوں میں اتار سکے۔

ایسی بھی معلومات حاصل ہوتی ہے کہ بھاگے ہوئے یا فوت شدہ کاشتکاروں کے بقایا محصولات کی رقم کی وصولی ان کے پڑوسیوں سے کئے جانے کا ایک عام رواج تھا جسے حکومت نے منسوخ کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ ''نگارنامۂ منشی'' میں شامل 1672-78ء کے ''حسب الحکم'' کے ذریعہ اورنگ زیب نے اس رواج پر پابندی عائد کر دی تھی۔ یعنی ایک کاشت کار کے بقایا محصول کی ادائیگی کے لیے اس کے پڑوسی کاشتکار کو مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ قدرتی آفات اور قحط سالی کی حالت میں بڑے پیمانہ پر محصول کی رقم میں تخفیف کے حوالے ملتے ہیں۔ 32-1630ء کی عظیم قحط سالی کے وقت شاہجہاں نے گجرات اور دکن کو ستر لاکھ روپیہ کی چھوٹ دی تھی۔ 1642ء مین کشمیر اور 1651ء میں صوبہ لاہور وغیرہ میں قحط کے دوران محصولات میں بھاری تخفیف کی گئی تھی۔

اس طرح کی راحت رسانی کے علاوہ زراعت کی ترقی و توسیع کے سلسلے میں کیے گئے اقدامات جو نہ صرف حکومت کی آمدنی میں اضافے کے مقصد سے اٹھائے گئے تھے بلکہ اس سے کاشتکاروں کو بھی عمومیت سے فائدہ پہونچا تھا۔ مغل حکمرانوں کے زراعت سے متعلق ترقیاتی اقدامات کے دو مقاصد نظر آتے ہیں۔ اول قابل کاشت اراضیات کے رقبات کی توسیع۔ دوئم جنس کامل (Cash crops) کی کاشت میں توسیع واضافہ۔ ان مقاصد کے پیش نظر مغلیہ حکومت نے نئے قابل کاشت علاقوں کو زیرِ کاشت لانے، ویران علاقوں کی زرعی تجدید کاری، جنس کامل کی زرعی توسیع، اور ذریعہ آبپاشی جیسے کنویں، تالاب وغیرہ کی مرمت اور کھدائی کے لیے کئی قسم کی رعایتیں دئے جانے کا انتظام کیا تھا، جو عمومیت سے کاشتکاروں کو راحت پہونچانے کی سمت بہتر اقدامات تھے۔

اس کے علاوہ زرعی ترقی کے لیے کاشتکاروں کو متحرک کرنے کے مقصد سے کئی طرح کے غیر نقدی رعایتوں کی تجویز بھی کی گئی تھی۔ مثلاً بنجر زمینوں کو زیر کاشت لا کر اسے قابل کاشت بنانے پر کاشت کار کو اپنی مرضی سے طریقہ تشخیص چن لینے کا اختیار تھا۔ اگر کسی گاؤں میں بنجر زمین ختم ہو چکی تھی اور کاشت کار کو مزید زمین جوتنے کی صلاحیت ہوتی تھی تو علاقے کے عمل گزار کو یہ ہدایت تھی کہ وہ اس کاشت کار کو دوسرے علاقے میں زمین فراہم کرے۔ نقدی فصلوں کی توسیع کئے جانے کی صورت میں کاشتکاروں کو ابتدائی چار پانچ برسوں تک غذائی فصلوں کی شرح سے ہی محصول ادا کرنے کی اجازت تھی۔ زراعت کو مضبوط کرنے کے مقصد سے حکومت نے کاشتکاروں کو تقاوی (قوت افزا) قرض دینے کا انتظام بھی کیا تھا۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ عمل گزار کو چاہیے کہ وہ تنگ دست کاشتکاروں کو قرض دیکر ان کی مدد کرے۔ ٹوڈرمل کی تجویزات میں یہ شق شامل ہے کہ بدحال کاشتکاروں کو مویشی اور اچھے بیج حاصل کرنے کے لیے تقاوی قرض دیا جائے 'ہدایت القواعد' کے مطابق امین (Assessor) کی ذمے داری ہے کہ وہ کاشتکاروں کو بیل اور بیج وغیرہ خریدنے کے لیے تقاوی قرض کا انتظام کرائے۔ صادق خان کے مطابق زرعی ترقی کے مقصد سے تقاوی قرض کا انتظام مرشد قلی خان کے ذریعہ دکن میں کی گئی اصلاحات کا اہم

حصہ تھا۔ ''آداب عالمگیری'' کے مطابق خاندیس اور برابر کے علاقوں میں زرعی ترقی کے مقصد سے آبپاشی کے لیے بند (Dam) کی تعمیر کے لیے اس علاقے کے کاشتکاروں کو چالیس سے پچاس ہزار روپے بطور تقاوی پیش کیا گیا تھا۔ اصولی طور پر تقاوی قرض چودھری، دیشمکھ ،مقدم یا پٹیل وغیرہ کے ذریعہ دئے جاتے تھے جو اسے کاشتکاروں کو فرداً فرداً تقسیم کرتے تھے اور اسکی واپسی کی ضمانت بھی لیتے تھے۔ گاؤں کے مقدم مکھیا یا پردھان کے ذریعہ دیا جانے والا قرض بھی تقاوی کے زمرے میں آتا تھا۔ اس قرض کی واپسی کے تعلق سے ابوالفضل کہتا ہے کہ: ''اسے آہستہ آہستہ واپس لیا جائے'' ٹوڈرمل اور ملطفت خان اس قرض کی ادائیگی قسطوں میں کرنے کی تجویز کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس قرض کا سب سے اہم اور خوبصورت پہلو یہ ہے کہ اس پر کوئی سود نہیں لیا جاتا تھا۔

10.8 نظام زرعی محصول کا ڈھانچہ (The Structure of Land Revenue System)

انتظامی سہولیات کی غرض سے مغل حکمرانوں نے پورے ملک کو مختلف علاقائی اکائیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان میں سب سے بڑی اکائی صوبہ (Province) تھی ہر صوبے کو کئی سرکاروں میں اور ہر سرکار کو کئی پرگنوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر پرگنہ کئی کئی گاؤں پر مشتمل ہوتا تھا۔ جن کی تعداد کے تعین کا کوئی خاص طریقہ وضع نہیں کیا گیا تھا۔ گاؤں سب سے چھوٹی اور بنیادی اکائی تھی۔ ملک میں امن خوشحالی اور ترقی قائم کرنے کے لیے عظیم حکمرانوں نے ہر سطح پر بہتر سے بہتر انتظامی بندوبست کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ زرعی محصولات مغلیہ حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ لہذا اس کے بہتر انتظام وانصرام کے لیے حکومت ہمیشہ کوشاں رہتی تھی۔ اس انتظامِ محصول کی اہم خصوصیت ٹیکس دہندگان خصوصاً کاشتکاروں کا زیادہ سے زیادہ مالی استحصال تھی۔ اس کے لیے مغل حکمرانوں نے پورے ملک کو الگ الگ علاقائی حدود میں اپنے محصولاتی اختیارات سماج کے خاص افراد کو تفویض کر دیے تھے۔ ایسے محدود علاقوں کو جاگیر کہا جاتا تھا اور جس فرد کو بادشاہ اپنی طرف سے وہاں کے محصولاتی اختیارات منتقل کرتا تھا۔ وہ جاگیر دار کہلاتا تھا۔ یہ جاگیر دار اکثر شاہی خاندان کے افراد یا حکومت کے اعلی عہدوں پر فائز ''عہدے دار'' یا ''منصب دار'' ہوتے تھے۔ حکومت کی آمدنی کے علاوہ جاگیر داروں اور ان کے انتظامی اہلکاروں اور عملے کی تنخواہیں اور معاوضے انہیں جاگیر داروں سے حاصل ہونے والے محصولات سے ادا کی جاتی تھی۔ اب اگر پورے ملک کو مختلف علاقائی حدود میں تقسیم کئے جانے کے تناظر میں دیکھیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی تمام تر اراضیات کو موٹے طور پر تین زمروں میں رکھا گیا تھا۔

جاگیر: یہ وہ محدود علاقے ہوتے تھے جن سے محصولات کے حصول کے اختیارات حکومت کے بڑے عہدیداروں یا منصب داروں اور سماج کے معزز افراد کو تفویض کیے جاتے تھے۔

خالصہ : یہ وہ علاقے تھے جو سیدھے مرکزی شاہی حکومت کے زیر انتظام ہوتے تھے۔ شاہی خاندان کے افراد کو انہی علاقوں سے جاگیریں دی جاتی تھیں۔ ان جاگیروں کو ''خالصہ شریفہ'' کہا جاتا تھا۔

پائے باقی: وہ علاقے جو بطور جاگیر تفویض کئے جانے کے انتظار میں رکھے جاتے تھے ''پائے باقی'' کہلاتے تھے یہ اکثر خالصہ کا ہی حصہ ہوتے تھے۔ اس طرح پورے ملک سے شاہی اصول وضوابط کے مطابق محصولات کی حصولیابی کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ حکومت کے محصولاتی نظام کے نفاذ کا مقصد ایک طرف جہاں زیادہ سے زیادہ محصول کی حصولیابی تھا وہیں دوسری طرف جاگیر داروں پر مکمل کنٹرول

رکھنے کا بھی تھا۔ اس کے علاوہ جاگیر داری منصب داری کے نظام میں جاگیر داروں کے تبادلے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں متواتر ہوتے رہتے تھے اور کئی بار انہیں اپنی جاگیروں سے کافی دور دراز علاقے میں تعینات کر دیا جاتا تھا۔ لہذا انہیں اتنا وقت حاصل نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ اپنے علاقۂ جاگیر کا مناسب بندوبست کر سکے۔ اس لیے مقامی سطح پر محصولات کے حصول کو یقینی بنائے رکھنے کے لیے مستقل بندوبست لازمی تھا۔ ان سب سے اہم ضرورت تھی کہ پورے نظام پر شاہی حکومت کی مضبوط گرفت ہو، جس کے لیے صوبائی اور مرکزی سطح پر وسیع اختیارات کے ساتھ بڑے عہدیدار مقرر کیے گئے تھے اور محکمے بھی تشکیل دیے گئے تھے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے مغلیہ حکومت میں ایک سہ سطحی (three tier) انتظامی بندوبست نظر آتا ہے۔ جو فرائض و اختیارات کے لحاظ سے مختلف عہدیداروں اور اہلکاروں اور کارندوں پر مشتمل تھا۔

1. جاگیر دار (خواہ خالصہ کا ہو، یا جاگیر کا) کا عملہ، اور عہدیدار، جن میں شقدار، کروڑی، عامل، منصف، فوطہ دار، یا خزانہ دار، کارکن، یا بخشی، اور گماشتہ شامل تھے۔ یہ تمام پرگنے سطح کے عہدے دار اور اہلکار تھے۔
2. مستقل مقامی اہلکار جن میں گاؤں کی سطح پر مقدم، پٹواری، قانون گو، چودھری، پرگنے کی سطح پر واقعہ نویس یا سوانح نگار شامل تھے۔
3. شاہی حکومت کے عہدار جن میں دیوان، فوجدار، اور امین شامل تھے یہ تمام صوبائی سطح کے عہدے دار تھے۔

10.8.1 شقدار (*Shiqdar*)

دہلی کے سلطانوں کے عہد میں شقدار ایک بڑی علاقائی اکائی کا حاکم اعلیٰ تھا جس کے پاس محصولات کی وصولیابی کے علاوہ دیگر انتظامی اختیارات بھی تھے۔ شیر شاہ کے عہد حکومت میں ہر پرگنے میں محصولات کی وصولی اور امن قانون قائم رکھنے کے اختیارات کے ساتھ ایک شقدار ہوتا تھا اس کے ماتحت ایک منصف یا امین ہوتا تھا جس کے ذمیداری غالباً محصولات کی تشخیص کرنا تھی۔ اکبر کے عہد کی ابتدائی تحریروں میں پرگنہ سطح پر شقدار، منصف اور امین کا خوب تذکرہ پایا جاتا ہے۔ لیکن بعد کی تحریروں میں ان کا تذکرہ معدوم ہوتا نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعد میں چل کر محصولاتی نظام میں لگاتار ہونے والے تجربوں اور تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی اہمیت کم ہو گئی ہو۔ لہذا اکبر کے کروڑی تجربے کے بعد یہ کروڑی کے ماتحت کم مرتبے کا محصولاتی عہدار نظر آتا ہے۔ شِقدار کی تنخواہ یا معاوضے کے متعلق وضاحت کے ساتھ کچھ معلوم نہیں ہوتا، لیکن اتنا قطعی طور پر درست ہے کہ اس کے علاقۂ تعیناتی سے حاصل ہونے والے محصول سے ہی اس کے معاوضے کی ادائیگی ہوتی تھی۔

10.8.2 کروڑی (*Karori*)

مغل عہد کے نظام محصول کے انتظامی ڈھانچے میں 75-1574ء میں انقلابی تبدیلی لائی گئی جب تین صوبوں کے علاوہ پورا مغلیہ ہندوستان خالصہ کے تحت لایا گیا۔ تمام تر علاقوں کو محالوں (districts) میں اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ہر محال سے ایک کروڑ ٹنکہ بطور محصول حاصل ہو۔ ہر محال میں ایک عامل یا عمل گزار کو مقرر کیا گیا جو کروڑی کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ عملی طور پر اسے بڑے وسیع اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ جس کی وجہ سے بقول عبدالقدیر بدایونی، یہ جبر و استبداد کے مجرم بھی ٹھہرائے گئے۔ کروڑی کی اہم ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اپنی عمل داری سے ایک کروڑ ٹنکہ کی وصولیابی کو یقین بنائے۔ اس میں کسی طرح کی کمی یا گراوٹ کی جواب دہی بھی کروڑی کے اوپر تھی

۔جب تجربہ کروڑی مکمل ہو گیااور جاگیریں پھر سے تفویض کی جانے لگی تب بھی کروڑی کی پہچان خالصے کے عامل یا عمل گزار کے مترادف کے طور پر قائم رہی۔ لیکن اب ان کی عملداری (jurisdictions) محال سے چھوٹی ہو کر پرگنہ کی سطح پر آگئی اور ان کا دائرہ اختیار تشخیصِ محصول اور حصولِ محصول تک محدود ہو گیا۔ دوسری اہم تبدیلی شاہجہاں کے عہد میں آئی۔ جب دیوان اسلام خان نے ہر محال میں ایک ''امین'' مقرر کیااور تشخیصِ محصول کے اختیارات کروڑی سے لے کر اس نئے عہدیدار کو دے دیے گئے۔ اسی وجہ سے اب کروڑی کے پاس ''امین'' کے ذریعے تشخیص شدہ محصولات کی وصولیابی کا اہم اختیار باقی بچا۔ شاہجہاں کے عہد کے آخری سالوں میں دیوان سعد اللہ خان نے کروڑی اور فوجدار کے اختیارات (جو ابھی تک ایک ہی فرد کو تفویض کئے جاتے تھے) کو الگ الگ کر کے کروڑی کا دائرہ اختیار اور کم کر دیا ۔ایک قدیم علاقائی اکائی ''چکلہ'' (جو کئی محالوں پر مشتمل ہوتی تھی) کی تجدید کی گئی اور اس کے حاکم اعلی کے طور پر ایک امین فوجدار مقرر کیا گیا نتیجتاً کروڑی کی حیثیت اس نئے عہدیدار کے ماتحت جیسی رہ گئی۔ عامل، عمل گزار یا کروڑی کے ذریعے موصولہ محصولات اور سرکاری خزانے میں پیش کردہ کاغذات کی بہت ہی باریکی سے پڑتال کی جاتی تھی۔ ان کاغذات کا مقابلہ اور توثیق پٹواری کے کاغذات خام سے کیے جانے کا عام رواج تھا۔ کسی بھی قسم کی گڑبڑی یا بدعنوانی کا انکشاف ہونے پر متعلقہ عہدیدار (کروڑی) اور اس کے عملے کی نہ صرف تنخواہ روک دی جاتی تھی بلکہ انہیں تب تک قید کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑتی تھیں جب تک کہ سارا حساب بے باق نہیں کر لیا جاتا تھا۔ آئین اکبری سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کروڑی (عامل یا عمل گزار) کو کتنی تنخواہ ملتی تھی؟ لیکن عہد شاہجہانی کے کچھ دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ کروڑی اور اس کے عملے کو مجموعی طور پر موصولہ محصولات کی کل مقدار کا آٹھ (8%) فیصد بطور معاوضہ دیا جاتا تھا۔ جس میں سے حکومت کی طرف سے (17%) فیصد کی شرح سے سائر (duty tax income) کاٹ لیا جاتا تھا۔ امین کے عہدے کے قیام کے بعد چونکہ کروڑی کے فرائض میں تخفیف ہو گئی تھی نتیجتاً اس کی تنخواہ یا معاوضے میں بھی تخفیف کر دی گئی اور اب اسے موصولہ محصولات کی کل مقدار کا پانچ 5 فیصد دیا جانے لگا۔

10.8.3 امین (*Amin*)

محصولاتی عہدیداروں میں کروڑی کے بعد ''امین'' دوسرا اہم عہدیدار تھا۔ یہ عُہدہ شاہجہاں کے عہد میں وجود میں آیا تھا۔ اس کی اہم ذمہ داری تھی محصولات کی تشخیص۔ اس تعلق سے امین پیمائشی عملے کا انچارج ہوتا تھا۔ زمینوں کی پیمائش کے علاوہ خالصہ اور جاگیروں میں شاہی اصول وضوابط کا نفاذ اور اس پر عمل آوری کی ذمہ داری بھی امین کے سر ہوتی تھی۔ اس کی تقرری دیوان کے ذریعے کی جاتی تھی۔ کروڑی اور فوجدار کے ساتھ مل کر محصولات کی رقم کو شاہی خزانے تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی تھی۔ صوبے کا فوجدار ان پر سخت نگاہ رکھتا تھا۔ مغل عہد کی تحریروں سے امین کی تنخواہ یا معاوضے کی مقدار کا کوئی واضح علم نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ ایک تنخواہ دار عہدہ تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں امین کے متبادل کے طور پر منصف بھی نظر آتا ہے۔ جو شاید مغل عہد کے ابتدائی دور کے بعد عام طور پر نظر نہیں آتا۔

10.8.4 فوطہ دار یا خزانہ دار (*Fotadar* or *Khazanadar*)

ہر سرکار اور پرگنے میں ایک خزانہ گھر ہوتا تھا۔ اس خزانہ گھر کے انچارج کو فوطہ دار یا خزانہ دار کہتے تھے۔ اس کے مخصوص فرائض

میں محصولات کی جمع اور حفاظت کے ساتھ اسے مرکزی خزانے تک پہنچانا شامل تھا۔ بطور خزانہ دار اس کی ذمہ داری تھی کہ عامل یا عمل گزار یا اس کے نمائندے کے ذریعے جمع کی گئی محصولات کی رقم کی وصولی کی رسید جاری کرے اور اس کا اندراج خزانہ گھر کے رجسٹر میں بھی پابندی کے ساتھ کرے۔ حکومت کی طرف سے اکثر یہ تاکید کی جاتی تھی۔ خزانہ دار حتی الامکان محصول جمع کرنے والوں پر کسی قسم کا بیجا بوجھ نہ ڈالیں اور نہ ہی کسی بہانے سے پریشان کریں۔ خزانے کی حفاظت کے لیے اسے فوجدار سے تعاون لینے کا اختیار تھا۔

10.8.5 کارکن یا بتکچی (*Karkun* or *Bitakchi*)

نظام محصول کے تحت ہر پرگنے میں ایک کارکن یا بتکچی ہوتا تھا۔ وہ ایک ماہر حساب داں ہوتا تھا جو کروڑی کے ماتحتی میں محصولات کا حساب رکھنے والے منتظم یا سوپرنٹنڈنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں ہر پرگنے میں دو کارکن یا بتکچی ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک فارسی میں اور دوسرا ہندوی میں پرگنے کے محصولات کے تمام تر حساب رکھتا تھا۔ لیکن 83-1582 عیسوی میں ٹوڈرمل کی تجویز کے مطابق فارسی کو محصولات کے حساب داری کی زبان طے کیے جانے کے بعد ہندوی والے کارکن کو ہٹا دیا گیا۔ پرگنے کے ہر گاؤں کے محصولات کا فردِ حساب قانون گو سے حاصل کر کے بتکچی اپنے پاس رکھتا تھا۔ پھر پورے پرگنے کا مجموعی فردِ حساب (Revenue Statement) تیار کر کے خزانچی اور شاہی دربار کو فراہم کرتا تھا۔ اس کے فردِ حساب میں ہر گاؤں کی سرحد، قابل کاشت اراضیات کا کل رقبہ، زیر کاشت زمینوں کے رقبات، الگ الگ فصلوں کی اوسط شرح پیداوار اور شرح محصول، تشخیص شدہ اور موصول شدہ حقیقی مقدارِ محصول وغیرہ کا اندراج کیا جاتا تھا۔ ان معلومات کی بنیاد پر وہ روزانہ اور ماہواری فردِ حساب تیار کر کے شاہی دربار کو روانہ کرتا تھا۔ جب محصولات کی رقم خزانے میں جمع کی جاتی تھی تو اس کو حصولیابی کی رسید بھی بتکچی متعلقہ کاشت کار یا مقدم کو جاری کرتا تھا۔ کارکنان یا بتکچی کی تنخواہ کے بارے میں قطعی طور پر تو معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ تاہم وہ ایک تنخواہ دار عہدہ تھا جسے موصولہ محصولات سے ہی معاوضہ ملتا تھا۔

10.8.6 گماشتہ (*Gumashta*)

چونکہ جاگیر دار اکثر اپنے فرائض منصبی میں مصروف ہوتا تھا یا اپنی جاگیر سے الگ کسی اور مقام پر تعینات ہوتا تھا لہذا اپنے علاقۂ جاگیر کے اکثر کام انجام دینے کے لیے وہ اپنا نمائندہ رکھا کرتا تھا۔ اسی نمائندہ یا ایجنٹ کو گماشتہ یا ''سہ بندی'' کہا جاتا تھا۔ یہ جاگیر دار کی طرف سے محصول کی وصولیابی اور دیگر ضروری معاملات کو انجام دینے کے لیے مقرر کیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاگیر دار عمومیت سے اپنے علاقۂ جاگیر سے محصولات کی حصولیابی کے لیے عامل پر انحصار کرتا تھا۔ یہ اس صورت میں مناسب تھا جب عامل کا علاقۂ جاگیر سے کوئی مقامی تعلق نہ ہو۔ اگر عامل علاقۂ جاگیر کا مقامی باشندہ ہو یا اسے علاقے سے کوئی ذاتی یا خاندانی رشتہ ہو تو جیسا کہ کچھ عصری تحریروں سے واضح ہوتا ہے، ممکن تھا کہ وہ مقامی زمینداروں سے ساز باز کر کے نہ صرف جاگیر دار کے مالی مفاد کو نقصان پہنچا سکتا تھا بلکہ حکومت کو بھی مالی اور انتظامی خسارے میں دھکیل سکتا تھا۔ اسی وجہ سے جاگیر اور خالصہ میں اکثر پرگنے کی سطح کے محصولاتی نظام سے منسلک عہدیداروں اور اہلکاروں کے بارے میں ان کی تقرری سے قبل ہی یہ معلومات حاصل کر لی جاتی تھی کہ وہ علاقۂ جاگیر سے کوئی رشتہ رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس سلسلے میں نہ صرف جاگیر دار بلکہ حکومت بھی محتاط رویہ اختیار کرتی تھی۔ لہذا جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد خالصہ اور جاگیر کے عاملوں کو یہ تاکید کی کہ وہ مقامی

باشندوں کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم نہ کریں۔اس طرح پر واضح ہوتا ہے کہ مقامی افراد کو عمومیت سے جاگیروں اور خالصہ کے محصولاتی نظام میں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔اس کے ساتھ ہی محصولاتی نظام سے منسلک عہدیداروں اور اہلکاروں کو مقامی افراد سے رشتہ ہموار کرنے سے باز رکھا جاتا تھا۔حالانکہ جاگیروں بشمول خالصہ کے محصولاتی بندوبست میں مقامی عناصر کی شمولیت کی اصولی طور پر حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔تاہم کچھ مقامی یا علاقائی اہلکاروں اور کارندوں کی شمولیت ناگزیر تھی۔ان مقامی اہلکاروں میں پرگنہ کی سطح پر قانون گو چودھری اور واقعہ نویس یا سوانح نگار جبکہ گاؤں کی سطح پر مقدم اور پٹواری نظر آتے ہیں۔ان مقامی اہلکاروں کی موجودگی مغل عہد کی زرعی محصولات کے نظام میں مستقل طور پر نظر آتی ہے۔

10.8.7 قانون گو (*Qanungo*)

قانون گو دکن میں (دیش پانڈے) پرگنہ سطح پر تشخیصِ محصول اور محصلاتی دستاویزات و کاغذات کا اہتمام کرنے والا عہدیدار تھا۔یہ اکثر حساب دانی (Accounts) میں ماہر اور کائیستھ یا کھتری قوم (ذات) سے تعلق رکھتے تھے۔یہ عہدہ گو کہ موروثی تھا، تاہم اس پر تقرری کے لیے شاہی فرمان لازمی تھا۔کسی قانون گو کے فوت ہونے کے بعد اس کے وارث کو قانون گوئی کا عہدہ حاصل کرنے کے لیے شاہی دربار میں درخواست پیش کر کے سند حاصل کرنا ضروری تھا۔سند جاری ہونے کے بعد قانون گو کا یہ عہدہ تاحیات برقرار رہتا تھا۔لیکن فرائض کی ادائیگی میں لاپرواہی، بدعنوانی میں ملوث ہونے یا متوفی قانون گو کے وارثین کی کثرت اور غیر ضروری اخراجات میں تخفیف کرنے کے مقصد سے شاہی فرمان جاری کر کے انہیں برخواست کیا جا سکتا تھا۔ شیر شاہ اور اکبر کے عہد میں ایک پرگنے میں صرف ایک قانون گو کی تقرری کی جاتی تھی۔لیکن اورنگ زیب کے عہد میں ''میرات احمدی'' کے مطابق ایک پرگنے میں دو سے زیادہ قانون گو کی تقرری نہیں کی جاتی تھی۔اور اگر کسی پرگنے میں دو سے زیادہ موجود تھے تو فاضل افراد کو برخاست کرنے کا حکم تھا۔

قانون گو کے ذریعے تیار شدہ کاغذات میں محصولاتی معاملات کے تفصیلی اعداد و شمار موجود ہوتے تھے۔جہاں سے شاہی حکومت کو جاگیروں کی قوت محصول (revenue capacity)، مقدارِ حقیقی محصول (actual revenue) اور رقباتِ اراضیات (area statistics) وغیرہ کی معتبر اور تفصیلی معلومات حاصل ہوتی تھی۔پرگنے کی تشخیصِ محصول کے لیے آنے والے امین اور اس کے عملے کو وہاں کے محصولاتی کاغذات، خصوصاً گذشتہ سالوں کے کاغذاتِ تشخیص ''(assessment papers) موازنہ دہ سالہ'' اور اپنی ذاتی معلومات کی فراہمی کرنا، کسی قانون گو کا اہم ذمہ تھا۔جب امین تشخیص کا عمل پورا کر کے محصول کی مقدار کا تعین کر دیتا تو ان سے متعلق کاغذات پر قانون گو بطور تصدیق اپنا دستخط کرنا لازمی تھا۔اس سلسلے میں چودھری اور مقدم کے ذریعے جاری کیے جانے والے قبولیت نامے پر بھی قانون گو کو دستخط کرنا ضروری تھا۔پرگنے کے عامل کے ذمہ داری تھی کہ وہ محصولات کی وصولی، بقایہ جات اور اخراجات کے پورے اعداد و شمار کی نقل قانون گو کو فراہم کرے تاکہ ان کا موازنہ و مقابلہ زمینداروں اور دیگر متعلقہ اہلکاروں کے ذریعے رکھے گئے کاغذات سے کر کے یہ تصدیق کر سکے کہ عامل نے تمام اندراج ٹھیک کیے ہیں۔عام طور پر قانون گو کو یہ یقینی بنانا تھا کہ جاگیر دار اور اس کے عملے شاہی اصول و ضوابط کی مکمل پاسداری کریں۔حکومت قانون گو سے یہ امید رکھتی تھی کہ وہ ''کاشتکاروں کے ہمدرد'' کے طور پر اپنی ذمہ داری پوری کرے گا

اور عاملوں کے ذریعے کسی بھی طرح کی ضابطہ شکنی کی اطلاع شاہی حکومت کو دے گا۔ ''نگار نامہ منشی''میں شامل ایک شاہی حکم کے مطابق قانون گو کی کے ذمہ داری تھی کہ وہ ''زیادہ سے زیادہ محصول''کی تشخیص (جمع کامل واکمل) کی راہ ہموار کرے۔

ابوالفضل کے مطابق اکبر کے عہد کے ابتدائی زمانے میں قانون گو کو معاوضے کے طور پر محصول کا ایک فیصد بطور وظیفہ مقرر تھا۔ لیکن بعد میں اکبر نے ان کی تنخواہ طے کر دی جو اکثر جاگیر لا محصول(Revenue-Free Jagir) کی شکل میں دی جاتی تھی۔اس کے علاوہ ''دستور العمل نویسند گی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ کے ساتھ ساتھ قانون گو کا وظیفہ (Allowance) 'نانکار' یا 'انعام' بھی جاری رہا اور یہ بھی اکثر لا محصول زمینوں کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ جاگیر دار اور اس کے عملے کے افراد علاقۂ جاگیر کے حالات اور رسم ورواج سے ناواقفیت کی وجہ سے اکثر قانون گو کے ذریعے فراہم کردہ معلومات پر انحصار کرتے تھے۔ لہذا کئی مرتبہ 'نگار نامہ منشی' اور 'وقائع اجمیر' کے مطابق، قانون گو اس حالت کا غلط فائدہ اٹھا کر عاملوں اور زمینداروں سے ساز باز کر کے نہ صرف جاگیر دار بلکہ شاہی حکومت اور کاشتکاروں کو بھی مالی نقصان پہنچانے کے جرم کا ارتکاب کرتے تھے اور اکثر کاشتکاروں کی ایزار سانی کی وجہ بھی بنتے تھے۔

10.8.8 چودھری (Chaudhary)

علاقۂ جاگیر کی تشخیصِ محصولات کا تعلق جہاں پرگنے کے قانون گو سے تھا وہیں تشخیص شدہ محصولات کی وصولیابی کا تعلق پرگنے کے چودھری سے تھا۔ یہ ایک نیم موروثی (Semi-Hereditary) عہدہ تھا۔ عام طور پر یہ پرگنے کا بڑا زمیندار ہوتا تھا۔ ان کو دکن میں ''دیشمکھ''اور گجرات میں ''دیسائی'' کہا جاتا تھا۔ جب جاگیر دار کا عملہ (امین-منصف-گماشتہ وغیرہ) محصولات کی تشخیص کا عمل پورا کر کے ''جمع ''کا تعین کر دیتے تھے تو اس سے متعلق کاغذات پر چودھری کے دستخط کرائے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی چودھری اپنی طرف سے ایک قبولیت نامہ تحریر کرتا تھا۔ جس میں علاقے کی محصولاتی تفصیل اور شرائط درج کی جاتی تھی جس کے مطابق اس کو محصول کی حصولیابی اور ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چودھری عام طور پر ہر گاؤں سے وہاں کے مقدم کے ذریعے محصول کی وصولی کراتا تھا اور اسے یکجا کر کے سرکاری خزانے میں جمع کر دیتا تھا۔ چودھری کے ذریعے محصولات کی حصولیابی میں لاپرواہی یا محصول کی مقدار میں کمی یا شاہی احکامات کی خلاف ورزی کی صورت میں حکومت کا موقف ہمیشہ سخت ہوتا تھا اور نتیجتاً ایسے چودھریوں کو سزائیں بھی دی جاتی تھیں۔

محصولات کی وصولیابی کی اہم ذمہ داری کے علاوہ چودھریوں کو اور بھی کئی چھوٹے موٹے کام انجام دینے پڑتے تھے۔ مثلاً تقاوی قرضوں کی تقسیم میں مقدم کو تعاون دینا اور کاشتکاروں کی طرف سے اس قرض کی دستور کے مطابق واپسی کی ضمانت لینا اور یہ یقینی بنانا کہ محصولات کی حصول یابی سے متعلق تمام کاغذات اور روداد متعینہ اوقات میں شاہی محکموں یا شاہی درباروں کو ارسال کر دیے گئے ہیں۔ چودھریوں کے معاوضے یا تنخواہ کے متعلق یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پورے مغل عہد کے دوران اس میں لگاتار اتار چڑھاؤ آتا رہا تھا۔ ''میرات احمدی'' کے مطابق اکبر کے عہد میں پرگنے کی کل حاصل شدہ محصولات کا ڈھائی 2.5 فیصد چودھری کو معاوضے کے طور پر دیا جاتا تھا۔ جس میں تخفیف کر کے 1.25 فیصد اور مزید تخفیف کر کے 0.625 فیصد کر دیا گیا۔ محصولاتی دستاویزات سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس

معاوضے کے علاوہ چودھری کو ''نانکار'' کی شکل میں وظیفہ بھی ملتا تھا لیکن اس کی مقدار بہت مختصر ہوتی تھی۔ لیکن یہ واضح ہوتا ہے کہ انہیں بڑی بڑی زمینوں کے ٹکڑے لا محصول انعام جاگیر (Revenue-Free *Inam*) کی شکل میں عطا کی جاتی تھی جن پر ان کا موروثی حق ہوتا تھا۔ تقاوی قرضوں کے تعلق سے کاشتکاروں کا ضامن بننے کے عوض چودھریوں کو کاشتکاروں پر عائد محصولات کا 5 فیصد کمیشن بھی ملتا تھا۔

10.8.9 مقدم اور پٹواری (*Muqaddam* and *Patwari*)

مقامی عہدداروں میں گاؤں کی سطح پر دو اہم نیم سرکاری عہدے دار نظر آتے ہیں۔ مقدم گاؤں کا مکھیا ہوتا تھا لیکن دیہی سماج میں اپنے اونچے رتبے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے عائد ذمہ داریوں کی ادائیگی بھی کرتا تھا۔ انتظامی نظریئے سے وہ ایک نیم سرکاری عہدیدار ہوتا تھا۔ محکمہ محصولات کے اہلکاروں کو محصولات کی تشخیص و حصولیابی کے عمل میں تعاون کرنا اور گاؤں کے کاشتکاروں سے محصولات کی رقم سرکاری خزانے میں جمع کرانا مقدم کے فرائض میں شامل تھا۔ دوسری طرف پٹواری گاؤوں کے سابقہ دستاویزوں اور زمین کی مالگزاری کا حساب رکھتا تھا اور سرکاری افسران کی وصولی میں مدد کرتا تھا۔

10.8.10 واقعہ نویس (*Waqia Navis*)

اپنے قیام کے بعد سے ہی مغلیہ حکومت نے مختلف اوقات میں انتظامی بندوبست کے تعلق سے مختلف تجربے اور تبدیلیوں کا اتار چڑھاؤ دیکھا تھا جس کا عکس ہمیں شاہی محکمہ جات اور ان کے عہدیداروں اور اہلکاروں کے بدلتے دائرۂ کار و دائرۂ اختیار میں صاف صاف نظر آتا ہے۔ ان سب کے درمیان شاہی حکومت میں ایک ایسا اہلکار تھا جس پر ان تبدیلیوں اور تجربوں کا کچھ خاص اثر نظر نہیں آتا۔ یہ اہلکار ''واقعہ نویس'' تھا۔ اسے ''واقعہ نگار'' یا ''سوانح نگار'' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ اہلکار اپنی حیثیت اور مرتبے کے لحاظ سے کچھ خاص اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا۔ لیکن اپنی کار گزاری کے لحاظ سے یہ ''شاہی حکومت کے کان اور آنکھ'' کا درجہ رکھتے تھے۔ تزکِ جہانگیری کے مطابق مغلیہ حکومت میں ایسے اہلکاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ جو پورے ملک کے گوشے گوشے سے وہاں کے ہر چھوٹے بڑے واقعات کی مسلسل رپورٹ شاہی دربار کو ارسال کرتے تھے۔ عصری تحریروں میں ان کے متعلق زیادہ تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہی حکومت کی طرف سے ان کی تقرری اور تعیناتی خاص طور پر ملک کے گوشے گوشے سے حکومت کے انتظامی بندوبست میں مختلف سطحوں پر ہونے والے بدعنوانی اور بے ضابطگی کی رپورٹ حاصل کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ لیکن یورپی سیاحوں برنیئر اور منوچی کے بیانات کے مطابق یہ اہلکار اپنی حرص و طمع اور بدعنوانی کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس کی تصدیق بھوپت رائے کے تصنیف ''اِنشائے روشن کلام'' سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے فرائض اور اختیارات کے بارے میں عصری تحریروں سے زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتی لیکن ان کی موجودگی پوری مغل عہد میں نظر آتی ہے۔

10.8.11 دیوان (*Diwan*)

مغلیہ ہند کے مالی نظام کی بنیاد پر بہت حد تک گاؤں اور پرگنے کی سطحوں کے محصولاتی عہدہ داروں، اہلکاروں اور کارندوں کے ذریعہ اپنی ذمہ داریوں کی ایماندارانہ ادائیگی پر ٹکی تھی۔ لہٰذا یہ امر لازم تھا کہ اس پورے نظام اور اس سے متعلق افراد پر صوبائی یا مرکزی سطح سے نہ

صرف مستقل نظر رکھی جائے بلکہ انہیں یہ احساس بھی دلایا جائے کہ وہ خود مختار نہیں تھے۔ لہذا قانون گویان اور چودھریوں کی بحالی و برخاستگی کے اختیارات حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی گرفت بنا رکھی تھی لیکن ان مقامی اور موروثی عہدیداروں کے علاوہ صوبائی سطح پر کچھ دیگر مستقل شاہی عہدیدار بھی تھے۔ جو مجموعی طور پر تمام تر جاگیرات اور جاگیر داروں، ان کے اہلکاروں وکارندوں کی تمام تر کارگذاریوں اور حرکات پر لگاتار نظر رکھتے تھے۔ یہ محصولاتی نظام کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے تیسرا گروپ تھا۔ ہر صوبے میں ایک محکمہ مال تھا جو صوبائی دیوان کی سرپرستی میں صوبے کے مالی نظام کو کارگزاریوں کو شاہی اصول وضوابط کے مطابق جاری رکھتا تھا۔ دیوان کا اولین فرض کاشتکاروں کو جاگیرداروں کے ظلم وجبر اور ایزارسانی سے محفوظ کرنا تھا۔ دیوان کو مالی بے ضابطگی اور لاقانونیت کو روکنے اور اس سلسلے میں مناسب اقدامات کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ اور اس کی رپورٹ شاہی دربار تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی تھی۔ چونکہ جاگیرداروں اور ان کے اہلکاروں اور کارندوں سے متعلق معاملات کی سنوائی دیوان اپنی کچہری میں کیا کرتا تھا۔ لہذا ان کے اوپر دیوان کا رعب ودبدبہ بھی خوب رہتا تھا۔

10.8.12 فوجدار (*Faujdar*)

مغل انتظامیہ میں فوجدار فوج یا پولیس کی نمائندگی کرتا تھا۔ بظاہر فوجدار اپنے دائرہ کار یا عمل داری میں قانون وانصاف کے قیام کے لیے ذمہ دار ہوتا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنیاد پر نظام محصول میں بھی فوجدار کے عمل دخل کی ضرورت پیش آجاتی تھی خاص کر تب جب زمیندار سرکش اور خود سر ہو جاتے تھے۔ اور محصولات کی ادائیگی نہیں کرتے تھے۔ ایسی حالت میں فوجدار کی مدد سے جاگیردار ان "زمینداران زور طلب" سے محصول کی وصولیابی کر پاتے تھے۔ عصری مآخزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے ہی بڑے جاگیرداروں کو ان کی عمل داریوں میں فوجداری کے اختیارات بھی تفویض کیے جاتے تھے۔ جو اورنگ زیب کے زمانے میں عام ہو گیا تھا۔ جاگیرداروں پر اس طرح کے شاہی عنایات نے شاہی فوجداروں کے اختیارات کو کافی حد تک کم کر دیا کیونکہ اسے جاگیردار کی عملداری میں دخیل ہونے کا اختیار نہیں تھا۔

10.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغلیہ حکومت اپنی سیاسی وانتظامی توسیع، شاہی خاندان اور ان کے وزرائ، اُمراء اور اعلیٰ منصب داروں کی عیش وعشرت سے پُر زندگی، بے نظیر وسیع وعریض عمارتوں، قلعوں اور باغات وغیرہ کی تعمیرات اور عظیم الشان فوجی تنصیبات وانتظامی بندوبست کے اخراجات کے تعلق سے مکمل طور پر محصولات سے ہونے والی آمدنی پر منحصر تھی۔ زراعت معیشت کی بنیاد تھی۔ زرعی محصولات، مجموعی مالی آمدنی کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ لہٰذا زرعی محصولات کے نظام کا مطالعہ ایک پیچیدہ اور دلچسپ موضوع ہے۔ گو کہ اس مطالعے کے لیے ضروری مواد کی کمی محسوس کی جاتی ہے اور جو کچھ دستیاب ہے ان میں ہم آہنگی اور یکسانیت کی کمی ہے۔ تاہم آئین اکبری، اور اکبر نامہ جیسی کچھ جامع تحریروں، محکمہ محصولات کے دستاویزات اور کچھ غیر ملکی سیاحوں اور تاجروں کے تحریری احوال کی بنیاد پر اس موضوع کا عمومی مطالعہ ممکن ہے۔ ابتدائی برٹش افسران نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ بادشاہ یا حکمران ہی ملک کی تمام اراضیات کا مالک ہوتا ہے، زرعی محصول کو زمین کا کرایہ (Rent) سمجھ

لیا۔ لیکن بعد کی تحقیقات نے ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ زرعی محصول دراصل زرعی پیداوار پر، نہ کہ زمین پر لگایا جاتا تھا۔ مغل عہد کے نظامِ زرعی محصولات کی اہم خصوصیات مختصراً کچھ اس طرح ہیں۔ سب سے اہم خصوصیت تھی کاشتکاروں کی کل پیداوار سے اس کی بقائے زندگی کی ضرورتوں سے زائد تمام پیداوار کا بطور محصول وصول کر لیا جانا۔ محصول کا تعین زمین کی پیداواری صلاحیت، علاقے کی آب و ہوا، سماجی حالات، علاقائی رسم و رواج اور زرعی وسائل کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ عمومیت سے زرعی محصول کی شرح اور مقدار میں علاقہ بہ علاقہ تغیر پذیری کا رجحان پایا جاتا تھا۔ جو مجموعی طور پر کل پیداوار کے ایک تہائی (1/3) سے نصف (1/2) تک ہوتا تھا۔ محصولات کے تعین کے لیے کئی طریقے استعمال کیے جاتے تھے جن میں ''ضبط'' سب سے اہم تھا۔ اس کے علاوہ غلہ بخشی اور کنکوت بھی حسب ضرورت رائج تھے۔ ضبطی صوبہ جات (سندھ، لاہور، دہلی، اجمیر، الہ آباد، اور اودھ) میں محصول کی وصولی عمومیت سے نقد رقم میں کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے ہندوستان میں کاروباری یا بازاری معیشت کی ابتدا ہوئی۔ زراعت کی توسیع و ترقی اور قدرتی آفات و قحط کی حالت میں حکومت کی طرف سے رعایا (کاشت کار) کو رعایتیں اور راحت رسانی بہم پہنچائی جاتی تھی۔ جن میں ''نابود'' تقاوی قرض اور آبپاشی کے بڑے اور خرچیلے ذرائع کی تعمیر و تجدید وغیرہ شامل تھیں۔ نظامِ محصول کی تشکیل اس طرح کی گئی تھی کہ مختلف سطحوں کے عہدیدار اور اہلکار ایک دوسرے کے لیے معاون و مزاحم (Check and Balance) کے طور پر کام کرتے تھے۔ ان میں کروڑی، شقدار، امین، قانون گو، چودھری، فوطہ دار، بنکیچی، دیوان، فوجدار اور واقعہ نویس وغیرہ اہم تھے۔ اکبر کے ذریعے تشکیل شدہ محصولاتی نظام چھوٹے موٹے ترمیم و اضافے کے ساتھ پورے مغل عہد میں کامیابی کے ساتھ رائج رہا اور اس کی کامیابی اس حقیقت سے اور واضح ہو جاتی ہے کہ بابر کے وقت میں کل سالانہ زرعی محصولات کی مقدار 2.60 کروڑ روپیہ، اکبر کے وقت میں 17.50 کروڑ، جہانگیر کے عہد میں 17.60 کروڑ، شاہجہاں کے دور میں 21.15 کروڑ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں (جبکہ دکن کا بڑا حصہ مغلیہ ہند میں شامل تھا) 29.77 کروڑ تھی۔

10.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

زرعی محصول	:	زرعی پیداوار پر نافذ العمل شرح محصول۔
تشخیص، تخمینہ کاری	:	مقدار محصول کی تشخیص۔
جمع	:	تشخیص شدہ کل محصول۔
عمل گزار	:	محصولاتی نظام کا ایک عملہ
ربیع	:	اکتوبر سے مارچ کے بیچ پیدا ہونے والی فصل ربیع کہلاتی ہے۔
خریف	:	اپریل سے ستمبر کے بیچ میں پیدا ہونے والی فصل خریف کہلاتی ہے۔
دستور، دستور العمل	:	مغلیہ نظام محصولات میں نافذ کئے گئے قاعدے۔

10.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. شیر شاہ کے ذریعہ زمینوں کی تین قسموں میں پیدا ہونے والی فصلوں کے اوسط شرح پیداوار کو کیا کہا گیا تھا؟
2. زرعی محصولات کی وصولابی کا عمل جن دو مرحلوں میں منقسیم تھا وہ کیا تھے؟
3. ابوالفضل نے آئین میں غلہ بخشی کے کتنے طریقے درج کئے ہیں؟
4. ضبط کی شروعات کس حکمراں کے عہد میں ہوئی تھی؟
5. طریقۂ ضبط کا نفاذ مغلیہ سلطنت کے جن صوبوں میں ہوا تھا ان کے نام درج کریں۔
6. سنہ 75-1574 عیسوی میں اکبر نے زرعی محصولات کے نظام میں جو نیا تجربہ کیا اس کا نام بتائیں۔
7. آئین دہ سالہ "کا نفاذ کس سال میں ہوا؟
8. صوبہ مالوہ (مرکزی ہند) میں زرعی محصول کی شرح کیا تھی؟
9. مغلیہ ہند کے کس صوبے میں چاول سے لدے گدھے (Ass Load) کی بنیاد پر زرعی محصول کا تعین کیا جاتا تھا؟
10. مغلیہ ہند کی تمامتر زرعی اراضیات کو جن تین زمروں میں تقسیم کیا گیا تھا ان کے نام لکھئے۔

10.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اکبر سے پہلے زرعی محصولات کے نظام کا مختصر خاکہ پیش کیجئے۔
2. "ضبط" کی خصوصیات واضح کیجئے۔
3. زرعی محصولات کے مقدار اور ادائیگی کے طریقے پر نوٹ لکھئے۔
4. مغلیہ عہد میں زرعی فصلوں کے خراب ہونے کی صورت میں حکومت کی طرف سے کی جانے والی راحتی اقدامات کا جائزہ لیں۔
5. قانون گو" کے فرائض منصبی پر نوٹ تحریر کیجئے۔

10.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل عہد میں رائج زرعی محصولات کی تخمینہ کاری کے طریقوں کا تفصیلی جائزہ کیجئے۔
2. مغلوں کے دورِ حکومت میں زرعی محصولات کے نظام کے انتظامی ڈھانچے پر تفصیلی تبصرہ کیجئے۔
3. مغل حکمرانوں کے زرعی محصولات کے نظام کی خصوصیات واضح کیجئے۔

10.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).
3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
4. Chandra, Satish, *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans*, Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta, 1986.
5. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
6. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
7. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1997).
8. Hasan, Saiyid Nurul, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, New Delhi, 1990 (first pub. in 1973).
9. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
10. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black, Ranikhet, 2016.
11. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*, *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers Pvt., Ltd., New Delhi, 1995 (first pub. 1983).
12. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. in 1923).
13. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *Mughals and Franks*, Oxford University Press, New Delhi, 2014 (first pub. in 2005).
14. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *From the Tagus to the Ganges*, Oxford University Press, New Delhi, 2011 (first pub. in 2005).
15. Shivram, Balkrishan, *Jagirdars in the Mughal empire during the Reign of Akbar*, Manohar, New Delhi, 2008.

اکائی 11۔مالگزاری تفویضات اور عطیات

(Revenue Assignments and Grants)

اکائی کے اجزا

11.0 تمہید

11.1 مقاصد

11.2 مالگزاری تفویضات اور عطیات

11.2.1 خالصہ زمین

11.2.2 جاگیر

11.2.3 جاگیرداری بحران

11.2.4 انعام (مددِ معاش)

11.2.5 اجارہ داری نظام

11.3 زمیندار

11.3.1 زمیندار کے حقوق

11.3.2 چوہدری

11.3.3 دیگر بیچوان

11.4 زرعی طبقات کے باہمی تعلقات

11.5 اکتسابی نتائج

11.6 کلیدی الفاظ

11.7 نمونہ امتحانی سوالات

11.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں مغلیہ دور سولہویں صدی کے اوائل سے اٹھارویں صدی کے وسط تک رہا۔ یہ دور سماجی، اقتصادی، ثقافتی، اور انتظامی ترقیوں کے لیے معروف ہے۔ مغل انتظامیہ کا مرکز زمین کی تفویض اور عطیات تھا، جس نے سلطنت کے استحکام اور خوشحالی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس اکائی میں مغلیہ سلطنت کے دورِ حکومت میں زمین کی عطیات کی اقسام، مقاصد اور انتظامیہ پر اس کے اثرات کو بیان کیا جائے گا۔ مشہور مورخ عرفان حبیب کے مطابق مغلیہ ریاست نے کسانوں کی اضافی پیداوار کا بڑا حصہ محکمہ مالگزاری کے ذریعے جمع کیا تھا۔ آمدنی کے وسائل کا ایک بڑا حصہ جاگیروں کے ذریعے اشرافیوں یا منصب داروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس کا مقصد سلطنت کی فوجی طاقت اور اس کے سیاسی ایجنٹوں کی وفاداری کو محفوظ بنانا تھا۔ زائد پیداوار کا ایک ذیلی حصہ زمینداروں کو جاتا تھا نظام میں جن کی شرکت، کسانوں سے محصول وصول کرنے کے عمل کو آسان بنانے کے لیے ضروری تھی۔ تاہم، زمینداروں کے پاس زمین کی پیداوار پر مستقل حقوق تھے جبکہ جاگیرداروں کے پاس ایسے کوئی مستقل حقوق نہیں تھے۔ زائد پیداوار کا ایک بڑا حصہ مالگزاری کی صورت میں اجنبی تھا۔ نظریاتی طور پر، شہنشاہ واحد دعویدار تھا۔ تاہم، عملی طور پر، ریاست اور اس کے ایجنٹوں کے علاوہ، متعدد ثالثوں نے بھی مختلف طریقوں کے ذریعے بھاری رقوم ہڑپ کیں۔ اس اکائی میں ہم زمین اور اس کی پیداوار پر مختلف طبقات کے حقوق پر بات کریں گے۔ ہم ان سماجی طبقوں کے درمیان باہمی تعلق پر بھی گفتگو کریں گے۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغلیہ سلطنت میں مالگزاری اور جاگیردارانہ نظام کا تعارف۔
- ان مختلف طبقات پر گفتگو ہوگی جنہیں حکومت کی طرف سے تفویضات اور عطیات سے نوازا جاتا تھا۔
- جاگیردار اور ان کے حقوق پر روشنی ڈالی جائے گی۔
- انعامی زمینوں کے مختلف زمرے اور یہ زمینیں کس کو دی گئی۔
- مختلف زرعی طبقات کے باہمی تعلقات سے واقفیت۔
- ریاست اور کسان کے درمیان ثالثوں کی موجودگی کو سمجھنا۔

11.2 مالگزاری تفویضات اور عطیات (Revenue Assignments and Grants)

عام طور پر قرون وسطی کے دور میں تین قسم کے مالگزاری تفویضات/زمینیں ملتی تھی: خالصہ (شاہی زمین)، جاگیر (سیکولر زمین کی تفویض) اور انعام (عطیات)۔

11.2.1 خالصہ زمین (Khalisa/Crown land)

خالصہ زمین کی آمدنی شاہی خزانے میں جمع کی جاتی تھی۔ یہ زمینیں براہ راست ریاست کے زیرِانتظام میں تھیں۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں خالصہ زمینوں کا تناسب مختلف تھا۔ اکبر کے عہد میں اس کی تشکیل ایک چوتھائی تھی (1/4th) جب کہ جہانگیر کے دور میں یہ کل آمدنی کا پانچ (5) فیصد رہ گیا۔ شاہجہاں نے اسے بڑھا کر ایک ساتواں (1/7th) کر دیا جبکہ اورنگ زیب کے دور میں یہ کل محصولات کا ایک پانچواں (1/5th) حصہ بنا۔ دکن میں اسے سرکار چی شیری، شیر بیچن شیٹ یا خالصہ جامن کے نام سے، جبکہ جنوبی ہندوستان میں بھنڈراواد/پندروادائی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ نوبورو کرشمہ (Noboru Karashima) کا کہنا ہے کہ اس کے معنی میں وقت کے ساتھ تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ سولہویں صدی کے دوران یہ شاہی زمین کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ اس کے بجائے 'صرف قابل ٹیکس اراضی تھی اور غیر قابل ٹیکس زمین سے ممتاز تھی'۔ ریاست نے کسانوں سے زمینی محصول وصول کرنے کے لیے دو طریقے اپنائے۔ سب سے پہلے، جاگیرداروں کو کچھ مخصوص علاقے تفویض کیے گئے تھے جن میں محصول اکٹھا کیا جاتا تھا اور اسے اپنی تنخواہ اور اپنی فوجی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ دوسرا، حکومت نے خالصہ سے مالگزاری آفسران کے ذریعے زرعی محصول جمع کیا۔ جاگیردار کا ان علاقوں پر کوئی مستقل حق نہیں تھا جو متواتر منتقلی کی وجہ سے تفویض کیے گئے تھے۔ ان کے دعوے مجاز مالگزاری اور دیگر ٹیکسوں تک ہی محدود تھے۔

11.2.2 جاگیر (*Jagir*)

اشرافیہ کو ان کی خدمات کے عوض دی جانے والی مالگزاری تفویض "جاگیر" کہلاتی تھی۔ دہلی کے سلاطین کے دور میں اس طرح کی تفویض کو 'اقطاع' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بعد میں مغلوں کے دور میں یہ جاگیر کے نام سے جانا جانے لگا۔ اقطاع کے حاملین کو اقطاع دار، مقتی/ولی اور جاگیر کے مالک کو جاگیر دار یا طولدار کے طور پر نامزد کیا گیا تھا۔ تاہم، دونوں کے درمیان کچھ اختلافات تھے، سب سے پہلے، اقطاع دار مالی اور انتظامی انچارج ہوتے تھے جبکہ جاگیر دار کی تفویض مشکل سے انتظامی ہوتی تھی۔ اگرچہ اقطاع دار ابتدا میں اکثر منتقلی کے قابل تھے، فیروز تغلق کے دورِ حکومت میں یہ موروثی اور مستقل ہو گیا۔ زیادہ تر مغل شاہی آفسران کو جاگیروں کی شکل میں محصول دیا جاتا تھا اور اس کے مالک کو جاگیر دار کے طور پر نامزد کیا جاتا تھا۔ اقطادار کے برعکس ان کی انتظامی اور مالی ذمہ داریاں کبھی متضاد نہیں تھی۔ یہ اکثر ایک جگہ سے دوسری منتقل ہوتے رہتے تھے۔ ایک جاگیر دار کا اوسط دورانیہ عموماً تین سے چار سال سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

اکبر کے دورِ حکومت کے اکتیسویں سال میں، دہلی، اودھ اور الہ آباد کے صوبے میں خالصہ کی محصولی کی کل آمدنی کا پانچ فیصد (5%) سے بھی کم تھی۔ جہانگیر کے تحت، تقریباً نو-دسواں (10/9) علاقہ جاگیر میں تفویض کیا گیا تھا اور صرف ایک دسواں (10/1) خالصہ کے لیے دستیاب تھا۔ جاگیر اور خالصہ کا تناسب اتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ شاہ جہاں کے دور میں، یہ بڑھ کر ایک گیارہویں (1/11th) تک پہنچ گیا اور بیسویں سال تک یہ تقریباً ایک-ساتواں (1/7th) تھا۔ یہ رجحان آنے والے دور میں بھی جاری رہا۔ اورنگ زیب کے دسویں سال میں، خالصہ کا جماع) ٹیکس (کل کا تقریباً پانچواں حصہ تھا۔ تاہم، اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے آخری حصے میں، خالصہ پر بہت زیادہ دباؤ تھا کیونکہ جاگیر کے دعویداروں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ منصبداروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ جاگیر کے نظام کی ایک اور اہم

خصوصیت انتظامی وجوہات کی بناپر جاگیر داروں کاایک جاگیر سے دوسری جاگیر میں منتقل ہونا تھا۔ منتقلی کے اس نظام نے جاگیر داروں کو مقامی جڑوں کی نشوونما سے روکا۔ ساتھ ہی اس کا نقصان یہ تھا کہ اس نے جاگیر داروں کو اپنے علاقوں کی ترقی کے لیے طویل مدتی اقدامات کرنے سے روکا۔ وہ صرف مختصر وقت میں زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

عام طور پر محصولاتی جاگیر کی چار قسمیں تھیں:

1. وہ جاگیر، جو تنخواہ کے بدلے دی جاتی تھیں، جاگیر تنخواہ کہلاتی تھی۔ یہ جاگیریں ہر تین یا چار سال بعد منتقل ہو جاتی تھی۔
2. کسی شخص کو بعض شرائط پر دی گئی جاگیریں مشروط جاگیر کہلاتی تھی۔
3. وہ جاگیریں جن میں خدمت کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور وہ عہدہ سے آزاد تھے ان کو انعام جاگیر کہا جاتا تھا۔
4. وہ جاگیریں جو موروثی ہوتی تھی زمینداروں (سرداروں) کو ان کے آبائی علاقوں میں تفویض کی جاتی تھیں، وطن جاگیر کہلاتی تھی۔

جہانگیر کے دور میں کچھ مسلم امرا کو وطن جاگیر سے مشابہ جاگیریں دی جاتی تھیں جنہیں التمغہ کہا جاتا تھا۔ وطن جاگیریں موروثی اور ناقابل منتقلی رہیں۔ بعض اوقات وطن جاگیر کو ایک خاص مدت کے لیے خالصہ میں تبدیل کر دیا جاتا تھا جیسا کہ اورنگ زیب نے 1679 میں جودھ پور کے معاملے میں کیا تھا۔ جب کسی زمیندار یا معاون سردار کو منصبدار بنایا جاتا تھا تو اسے اس کی وطن جاگیر کے علاوہ اور تنخواہ جاگیر بھی دیا جاتا تھا۔ جیسے مہاراجہ جسونت سنگھ کو مارواڑ میں وطن جاگیر اور حصار میں تنخواہ جاگیر کے مالک تھے۔

جاگیر دار بادشاہ کے خاص آفسر تھے جو زمینوں کے تحفے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو شہنشاہ کی طرف سے عطا کردہ عہدوں پر فائز تھے۔ درجہ بڑھنے پر منصبدار کو تنخواہ کی ایک خاص رقم کا حقدار بناتا تھا جو عام طور پر ایک علاقہ (جاگیر) تفویض کر کے پورا کیا جاتا تھا جس کا سرکاری طور پر تخمینہ لگایا گیا تھا کہ محصول کے مساوی رقم حاصل ہو گی۔ یہ عہدے (منصب) وراثتی نہیں تھے، حالانکہ اعلیٰ منصب داروں کو ان کے روابط کی وجہ سے اپنے عہدوں پر برقرار رہنے دیا جاتا تھا۔ جاگیر کے عارضی کردار نے جاگیر داروں پر شہنشاہ کا کنٹرول مضبوط کیا۔ ابوالفضل کے مطابق، ایک منصب دار جاگیر کا حقدار تھا، لیکن جاگیر جو ان کو ملے گا وہ زمین کے کسی خاص حصے کا نہیں، اور سال بہ سال وہی جاگیر نہیں یعنی جاگیر منتقل ہوتی رہے گی۔ منصب (اس وجہ سے جاگیر) کو وقتاً فوقتاً ترقی یا تنزلی دینے کے لیے نظر ثانی کی گئی۔

اس طرح ایسا لگتا ہے کہ ایک جاگیر دار کو اپنے مقرر کردہ علاقے پر کوئی مستقل حق حاصل نہیں تھا۔ نظریاتی طور پر اس کے دعوے بھی مجاز مالگزاری محصول اور ٹیکس تک ہی محدود تھے۔ لیکن، عملی طور پر، جاگیر دار ایک بہت زیادہ طاقتور شخص تھا، خاص طور پر اگر وہ پولیس کے دائرہ اختیار سے بھی لطف اندوز ہونے والا ایک بڑا ذمہ دار ہو۔ درحقیقت زمین کا ایک بڑا حصہ ایسی جاگیروں کے ماتحت تھا۔ ایک اندازے کے مطابق، 1646 میں، صرف اڑسٹھ شہزادوں اور اشرافیوں نے سلطنت کی کل آمدنی کی طلب کا 36.6 فیصد دعویٰ کیا اور دیگر 587 حکام نے تقریباً 25 فیصد کا دعویٰ کیا۔ باقی 7,555 منصب داروں نے ایک چوتھائی اور ایک تہائی کے درمیان محصول کا دعویٰ کیا۔ اس طرح زمین کا بڑا حصہ جاگیروں کے تحت تھا۔

عرفان حبیب کی رائے میں زمیندار کو ہٹانا جاگیر دار کے اختیار میں تھا۔ جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے، جاگیر داروں نے ان اختیارات کا دعویٰ کیا تھا کہ وہ انہیں زمین پر، غلاموں کی طرح حراست میں لے لیں، اور اگر وہ بھاگ جائیں تو انہیں واپس لے آئیں۔ یہ بڑے پیمانے پر خیال کیا جاتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کے بعد کے دور میں جاگیر داروں نے کسانوں پر جبر اور بھتہ خوری کا سہارا لیا کیونکہ خاص علاقوں کو زیادہ عرصے تک اپنے قبضے میں رکھنے کا یقین نہ رکھتے ہوئے انہیں محصولات کی وصولی کے طویل امکانات کی کوئی امید نہیں تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، مغلیہ دور میں محصول کی طلب بہت زیادہ تھی اور مجموعی پیداوار کا نصف سے زیادہ کسانوں سے چھین لیا جاتا تھا۔ اگرچہ کسانوں کو زمین پر مستقل اور وراثتی قبضے کے حقوق حاصل تھے، لیکن سلطنت کی زرعی پیداوار کا بڑا حصہ عددی لحاظ سے بہت چھوٹے طبقے کے جاگیر داروں کے ہاتھ میں تھا۔

11.2.3 جاگیر داری بحران (Jagirdari Crisis)

اورنگ زیب کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں تفویضاتی جاگیر کو صحیح طور پر استعمال کرنے میں مسائل سامنے آنا شروع ہو گئے۔ جبکہ دستیاب زمین محدود رہی، دی جانے والی جاگیروں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ ابوالفضل کہتے ہیں کہ ''ریاست میں جاگیر کی تعداد محدود ہو گئی اور کوئی پائیباقی (جاگیر کے طور پر تفویض کی گئی زمینیں) باقی نہیں رہی۔'' وہ اسے براہ راست دکنی اشرافیہ کی آمد سے منسوب کرتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں وہ اعظم خان کو لکھتے ہیں کہ اورنگزیب نے خود اعتراف کیا کہ پائیباقی کی کمی ہے۔ نئے بھرتیوں کو تفویض کی جانے والی جاگیروں کی کمی نے یقینی طور پر کام کاج کو متاثر کیا ہوگا۔ جاگیر دار اپنا حق لینے کے لیے سرپرست (مرابی) اور ایجنٹ (وکیل دل سوز) رکھنے پر اصرار دیکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جاگیر کو حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کے واقعات بھی عام ہو گئے۔ جاگیر کے بحران نے یقینی طور پر حکمران طبقے کے درمیان 'لڑائیاں، دشمنیاں اور دھڑے بندی' پیدا کر دی۔ تاہم، اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں مسلح جدوجہد کی شکل اختیار کرنے کی کوئی مثال یا صورت حال نہیں دیکھی گئی جو بھی مسائل سامنے آئے وہ ان کے دور کی بعد کی بات ہے۔

11.2.4 انعام/مددِ معاش (*Inam/ Madad-i-Maash*)

جہاں ایک طرف جاگیر داروں کو نقد تنخواہ کے بدلے محصولاتی تفویضات دیے جاتے تھے، وہی دوسری طرف ایک اور طبقہ تھا ان کے گزارہ کے لیے محصولاتی عطیات دی جاتی تھی۔ یہ مذہبی لوگوں کا طبقہ تھا جسے ریاست کی سرپرستی حاصل تھی۔ ان عطیات/وظیفوں کو سورغل یا مددِ معاش (روزی کے لیے امداد) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ انعامی زمینیں متقیوں، ضرورت مندوں اور علماء کو دی جانے والی غیر محصولاتی تفویض تھیں۔ 'صدر الصدر' کے ماتحت ایک الگ محکمہ ان عطیات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اگر امداد نقد دی جائے تو اسے وظیفہ کہا جاتا تھا۔ بعض قسم کے لوگ ایسے تھے جو مددِ معاش حاصل کرنے کے اہل تھے۔ ان وظیفوں حاصل کرنے والے کو زمین پر کسی حق کے ساتھ سرمایہ کاری نہیں کر سکتے تھے بلکہ اس کی پیداوار سے مقررہ محصول کے حقدار تھے۔ اکبر نے زمین کی ایسے وظیفوں کی حد فی شخص ایک سو بیگھہ رکھی۔ اکبر کی پالیسی یہ تھی کہ زراعت کو بہتر بنانے کے لیے آدھی قابل کاشت اور آدھی بنجر زمین دی جائے۔ اکبر کے دور میں یہ مختلف علاقوں میں دو سے پانچ فیصد کے درمیان تھا۔ مددِ معاش مالکان کو مالگزاری محصول اور دیگر ٹیکسوں کی ادائیگی سے مستثنیٰ تھے۔ جنوبی

ہندوستان میں انعام کے زمین کو مانیا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ انعامی زمین دونوں یعنی اداروں اور افراد دی گئی تھی۔ بنیادی طور پر اس طرح کے عطیات کی تین اقسام تھیں۔

1. انعامی زمینیں جو برہمنوں کے پاس تھیں وہ برہمدیا/اگرہار کے نام سے مشہور تھیں۔
2. مندروں کو دی گئی زمینوں کو دیودانا کہا جاتا تھا۔
3. متھاپورہ روایتی تعلیمی اداروں یا گروکل (Mathas) کے پاس غیر محصول زمینیں تھیں۔

گروکل کے لیے دی گئی انعامی زمینیں دراصل گروکل کے سربراہ کو گروکل کی دیکھ بھال کے لیے دی جاتی تھیں۔ تاہم مندر کا وظیفہ ایک 'ٹرسٹ' کے پاس ہوتا تھا جو مندر کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ جو اس دیوتا کے نام پر مندر کی دیکھ بھال کرتے تھے جس کے نام سے اصل میں وظیفہ دیا گیا تھا۔

وطن جاگیر زیادہ تر گاؤں کے افسران کے پاس تھی- گاؤں کے سربراہ (پٹیل/مقدم)، گاؤں کے اکاؤنٹنٹ (کلکرنی)، چنگولا (پاٹل کا معاون)، شیٹے مہاجن (گاؤں کے بازار کا افسر)، اور مہر (گاؤں کا چوکیدار)، مندر، پجاری، وغیرہ تھے۔ تاہم جب تک یہ فرض ادا کرتے رہے یہ موروثی اور دائمی تھے لیکن عملی طور پر جب تک اس کے ارکان اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے اس وقت تک اہل خانہ کو اس کا مزہ ملتا رہا۔ یہ درحقیقت ملازمت کی مدت تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انعامی زمینیں مکمل طور پر ٹیکس سے خالی نہیں تھی۔ انہیں انعام کی مدت کی نوعیت کے لحاظ سے ریاست کو جمع ہونے والے محصول کا ایک تھائی یا ایک چوتھائی حصہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ انعامی زمین کی دو قسم کے تھی دیوان نسبت انعام اور گاؤنسبت انعام۔ پہلی قسم کو ریاست نے سند کے ذریعے عطا کیا تھا۔ جبکہ مؤخر الذکر گاؤں کی کمیونٹی کی طرف سے عطا کی گئی تھی۔ اسے دیہنگی انعام (Dehangi–Inam) کے نام سے جانا جاتا تھا اور اسے گاؤں کے کاریگروں اور نوکروں کو دیا جاتا تھا۔

عطیات، وظیفہ داروں کی زندگی بھر کے لیے تھی اور ورثاء تجدید کے لیے درخواست دے سکتے تھے۔ عام طور پر وظیفہ کا صرف ایک حصہ ورثاء کو دیا جاتا تھا۔ جہانگیر نے اکبر کی طرف سے دی گئی تمام وظیفوں کی تصدیق کی جبکہ شاہ جہاں نے پچھلے دورِ حکومت میں دی گئی تمام وظیفوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ انہوں نے 30.بیگھہ وراثت میں دینے کی اجازت دی۔ اورنگ زیب نے اسے کم کر کے 20.بیگھہ کر دیا۔ اپنے دورِ حکومت کے تیسویں سال میں، انہوں نے وظیفہ کو مکمل طور پر موروثی ہونے کی اجازت دے دی۔ ان کے دورِ حکومت کے آخری حصے میں اور ان کی موت کے بعد، وظیفہ داروں نے زمین کو بیچنے یا منتقل کرنے کے حق سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا، جس نے پھر زمینداری کی خصوصیات حاصل کر لی۔

اکبر کے دور میں، یہ پایا گیا کہ اس طرح کی عطیہ کی آمدنی کل جمع کے 5.84 فیصد سے زیادہ نہیں ہو گی۔ ان وظیفہ کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر گنگا کے بالائی صوبوں (سب سے زیادہ دہلی اور الہ آباد میں) مرکوز تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ کے ابتدائی سالوں تک وظیفہ کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی کے تناسب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ تحقیقات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ

عطیات بنیادی طور پر شہری علاقوں میں تھیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ستھر فیصد (70%) سے زیادہ سیور گھال (مددِ ماش) پر گنوں پر مشتمل تھے جو غیر مسلم زمینداروں کے زیرِ تسلط تھے۔

ایک اور قسم کا عطیہ (وقف) اداروں وغیرہ کو دیا جاتا تھا۔ جو کہ مذہبی مقبروں، مزارات، مدارس وغیرہ کی دیکھ بھال کے لیے مخصوص زمینوں کے محصولات مستقل طور پر مختص کیے جاتے تھے۔ ایسا عطیہ جاگیر دار بھی دے سکتے تھے اور تب تک اِس علاقے جاری رہتے تھے جب تک کہ ان کی جاگیر کی مدت رہتی تھی۔ مددِ معاش عطیات کا مقصد اثر ورسوخ پیدا کرنا اور بنجر زمینوں کو تیار کرنا تھا۔ عموماً یہ شیوخ و سید اور دیگر اہل علم کو دیے جاتے تھے۔ ہنگامی حالات میں وہ مقامی فسادات کو روکنے کے لیے حکومتی افواج میں شامل ہوتے تھے۔ اس طرح کی عطیات کی کل آمدنی زیادہ نہیں تھی۔ عطیہ دار کی طرف سے اپنے علاقے اور دیگر جگہوں پر زمیندارانہ حقوق حاصل کرنے کا رجحان تھا۔ اس طرح ان میں سے کچھ نے خود کو چھوٹے زمینداروں میں تبدیل کر لیا۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں، ان عطیات کو تمام لین دین میں زمینداری کی زمین سمجھا جاتا تھا۔

11.2.5 اجارہ داری نظام (Revenue Farming/*Ijaradari*)

اجارہ داری نظام) محصول فارمنگ (جہاندار شاہ (مغل شہنشاہ) کے دورِ حکومت میں ذوالفقار خان نے متعارف کروایا تھا، جو اس کے طاقتور اشرافیوں میں سے ایک تھا۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں یہ بہت مقبول تھا۔ اجارہ داری نظام کو محصول فارمنگ کے نظام کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جو کہ ٹوڈر مال کے مقررہ زمینی محصول کے برعکس تھا۔ اس نظام میں کسانوں، بیچوان اور کسانوں سے محصول وصول کرنے کے لیے مختلف اصول تھے۔ اجارہ داری نظام مغلیہ دور (اٹھارویں صدی میں) میں مقبول ہوا۔ یہ نظام محصول آفسروں اور ان کے اہل خانہ تک محدود تھا۔ اس نظام میں کسانوں کا سب سے زیادہ استحصال ہوا۔ درج ذیل میں دئے گئے اس نظام کی خصوصیت تھے:

1. حکومت نے اس نظام میں محصول اِکٹھا کرنے کا حق سب سے زیادہ بولی لگانے والے کو دیا تھا۔
2. بیچوان حکومت کو ایک مقررہ رقم ادا کرنے کا پابند تھا۔
3. کسانوں سے محصول وصول کرنے کے لیے کوئی مقررہ اصول نہیں تھے۔ حکومت کسانوں سے اپنی مرضی کے مطابق ٹیکس وصول کرنے میں آزاد تھی۔
4. محصول آفسر کسانوں سے مقررہ زمینی محصول سے زیادہ وصولی نہیں لے سکتے تھے۔

یہ مالگزاری نظام اٹھاویں صدی میں محصول گزاری اور اس کا تخمینے کے لیے بڑے پیمانے پر مقبول ہوا۔ تاہم یہ نظام زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا، کیونکہ اکثر و بیشتر بولی کا تعلق زمین کی اصل پیداواری صلاحیت سے نہیں ہوتا تھا۔ اور جب کسانوں کے پاس اپنی زمین کاشت کاری کے ذرائع کی کمی تھی یا ایک آفت کی وجہ سے کھیتی ناممکن تھی، زمین کو کسی تیسرے فریق کو اجارہ پر کاشت کے لیے دیا جاتا تھا، اس نظام کو اجارہ داری کہا جاتا ہے۔ یہ نظام مغلیہ دورِ حکومت میں انتہائی موثر تھا۔ تاہم، اکبر اور شیر شاہ کے دور حکومت میں یہ متنازعہ معاملہ بن گیا۔

ریاست یا جاگیر دار اجارہ (ٹھیکہ) پر زمین کے کچھ حصے مستجار (ٹھیکدور) کو دیتے تھے۔ دونوں کے درمیان طے پانے والے معاہدے پر قاضی مہر ثبت کرتے تھے۔۔ اجاردار اصل جمع شدہ محصول اور ادا کرنے پر متفق ہونے والی رقم کے فرق کو برقرار رکھنے کا حقدار تھا۔ تاہم مغلیہ دور میں اجارہ پر خلصہ اراضی دینے کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس عمل کی ہمیشہ مزاحمت کی گئی اور ریاست کی طرف سے اسے مشکل سے منظور کیا گیا۔ 1676 میں اورنگزیب نے گجرات میں اجارہ پر زمینیں دینے سے منع کر دیا۔ یہ جابرانہ تھا کیونکہ اجارداروں کی کوشش تھی کہ کسانوں سے زیادہ سے زیادہ رقم نکالیں۔ عام طور پر اجاردار مقامی اشخاص ہوا کرتے تھے۔ راجستھان میں اجارادینا ایک عام رواج تھا اور یہ اٹھارویں صدی کے دوران زیادہ عام ہوا۔ مغلیہ سلطنت کمزور ہونے کے بعد خاص طور پر 1719 کے بعد راجپوت وطن جاگیر رکھنے والے مغلیہ منصب داروں نے اپنی جاگیریں اجارہ پر راجپوت حکمرانوں کو منتقل کرنے کو ترجیح دی۔ راجستھانی ریکارڈ/ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ جاگیرداروں اور اجارداروں نے پٹہ کی شرائط طے کرتے وقت سودے بازی کی کوشش کی۔ لیکن بڑی حد تک معاہدہ اجاردار کے حق میں ہوا۔ یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے دوران راجستھان سے ہمیں اجارہ استمراری (طویل مدتی یا مستقل عطیہ) کی چند مثالیں ملتی ہیں۔ سوائی جئے سنگھ کی موت (1743) کے بعد اجارہ میں خالصہ زمینیں دینا ایک 'عام' خصوصیت بن گئی۔ یہاں تک کہ تنخواہ اجارہ (آفسروں کو تنخواہ کے بدلے دیے گئے) کی عطیات بھی دیکھنے کو ملے۔ اِس نے ساہوکاروں اور مہاجنوں کو بہت راغب کیا۔ وہ راجستھان کے اجارہ داروں کی طرف سے ضمانتیں فراہم کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ خود اجارہ داروں کا انتخاب کرتے تھے۔ اس عمل کا مثبت پہلو یہ تھا کہ اِس کی وجہ سے ویران دیہاتوں اور لاوارث زمینوں کو زیرِ کاشت لایا گیا۔ اجارادکن اور مہاراشٹر میں ایک عام خصوصیت تھی۔ یہ صرف زمینوں کی کاشت کاری تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ سرکاری عہدوں کو سنبھالنے میں بھی کافی وسیع تھا۔ جنوبی ہندوستان میں ریاست اور نائیک نے بھی ٹھیکیداروں کو زمینیں ٹھیکہ دیتے تھے انہیں بدلے میں گٹہ (کرایہ) ادا کرنا ہوتا تھا۔

11.3 زمیندار (The *Zamindar*)

زمیندار مغل سلطنت میں عملی طور پر ہر حصے میں موجود تھے اور مغل ہندوستان کے زرعی ڈھانچے میں سب سے اہم مقام رکھتے تھے۔ لفظ 'زمیندار' دو فارسی الفاظ سے ماخوذ ہے، 'زمین' اور 'دار' کا مرکب ہے۔ مغلیہ دور میں زمیندار کا لفظ کسی علاقے کے سردار کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ اکبر کے زمانے سے، یہ اصطلاح باضابطہ طور پر کسی بھی ایسے شخص کے لیے استعمال ہونے لگی جس کا کسانوں کی پیداوار میں براہ راست حصہ لینے کا موروثی دعویٰ ہو۔ ابتدائی مقامی اصطلاحات جیسے دوآب میں کھوت اور مقدم، اودھ میں ستاراہی اور بسوہ، راجستھان میں بھومی اور گجرات میں بنت یا ونتھ کو زمیندار کی اصطلاح سے بدل دیا گیا۔ تاہم، ان میں سے بہت سے بدلتے ہوئے اصطلاحات کو عصری ماخذ میں زمیندار کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہا۔ بغیر زمیندار کے علاقوں کو نیاتی کہا جاتا تھا۔ نورالحسن نے زمینداروں کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

1. بنیادی زمیندار جن کے زمین پر کچھ ملکیتی حقوق تھے۔
2. ثانوی زمیندار جن کے پاس ثالثی کے حقوق تھے اور انہوں نے زمینی محصول جمع کرنے میں ریاست کی مدد کی۔

3. خود مختار سرداروں کو اپنے علاقوں میں خود مختار حقوق حاصل تھے اور وہ مغل ریاست کو ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے۔

11.3.1 زمیندار کے حقوق (Privileges of the Zamindars)

زمینداری، زمین پر ملکیتی حق کی نشاندہی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ زمین کی پیداوار پر ایک دعویٰ تھا، جو ریاست کی مالگزاری کی مانگ کو پورا کرنا تھا۔ پھر بھی زمیندار، نجی جائیداد کی طرح، آزادانہ طور پر زمین کی خریدی اور فروخت کر سکتے تھے۔ یہ وراثتی اور قابل تقسیم بھی تھا، یعنی زمیندار کے وارث اپنی وراثتی زمینداری کے مالی دعوے اور مراعات کو زمین کے قانون کے مطابق تقسیم کر سکتے تھے۔ زمینداروں نے اپنے حقوق اس تاریخی روایت کی بنا پر حاصل کیے کہ اس نے اور اس کے رشتہ داروں نے مخصوص دیہات کے باشندوں پر اختیارات تھے۔ کسی زمانے میں، زمیندار نے گاؤں آباد کیے تھے اور اس کی زمین کسانوں میں تقسیم کر دی تھی۔ مشرقی راجستھان میں، ویسیدار (کسانوں کی ایک قسم) کو گاؤں میں بھومیا (زمیندار کے طور پر جانا جاتا ہے) نے اپنی ذاتی زمینوں پر کاشت کاری کرنے کے لیے بسایا تھا۔ اس لیے زمینداری کے حقوق حکمران طبقوں نے نہیں بنائے تھے بلکہ ان سے پہلے تھے۔ تاہم، بادشاہ ان دیہاتوں میں زمینداری بنا سکتا تھا جہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ ایک زمیندار کو بھی بے دخل کر سکتا تھا، لیکن یہ ایک حق تھا جسے وہ صرف بغاوت یا محصول کی عدم ادائیگی کی صورت میں استعمال کر سکتا تھا۔

عہد وسطیٰ کے حکمرانوں نے زمینداروں کے حقوق کو تسلیم کیا، لیکن محصولات کی وصولی کے لیے ان کے ساتھ حکومت کے ایجنٹ کے طور پر برتاؤ کرنے پر بھی اتنے ہی اصرار کیا۔ جب زمیندار نے یہ شکل اختیار کی، یعنی وہ حکومت کی محصولات کی وصولی میں مدد کرنے کے لیے آیا، اس خدمت کے لیے زمیندار جمع شدہ کل محصول کے فیصد کا حقدار تھا۔ سرکاری دستاویزات میں یہ دس فیصد بتایا گیا ہے اور اسے نان کار کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جب انتظامیہ نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے محصول اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا، تو زمیندار کو پاس کر کے، مؤخر الذکر کو ملکانہ کہلانے والے محصولات کی وصولی میں حصہ لینے کا حقدار تھا۔ (ملکیت کا حق)، اور نان کار کی طرح، جمع شدہ کل محصول کے دس فیصد پر طے کیا گیا تھا۔ اپنے اصل مالی دعوے کے علاوہ، زمینداروں نے کسانوں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی مراعات بھی وصول کیں۔ کچھ معروف محصول جو اس طرح سمجھے گئے وہ تھے دستار شماری، پگڑی ٹیکس، ہاؤس ٹیکس، مردم شماری، شادی اور پیدائش پر ٹیکس وغیرہ۔ زمیندار اپنے علاقوں میں ہفتہ وار بازاروں سے بھی ٹیکس وصول کرتے تھے۔ بعض اوقات، وہ اپنے علاقوں سے گزرنے والے تجارتی سامان پر ٹول ٹیکس وصول کرتے تھے۔ زمینداروں کو ان چھوٹی مراعات کے ذریعے کتنی رقم حاصل ہوئی اس کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہے۔ زمینداروں نے پیدل فوج اور گھڑ سواروں کو ملازم رکھا۔ ان فوجیوں نے زمینی محصول کی وصولی اور کسانوں کو محکوم بنانے میں ان کی مدد کی۔ تقریباً تمام زمینداروں کے اپنے چھوٹے یا بڑے قلعہ / گڑھی یا قلعے تھے۔ عین اکبری کے مطابق پوری مغلیہ سلطنت میں زمینداروں کی فوج چوالیس لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ بنگال میں ان کے پاس ہزاروں کشتیاں تھیں۔

11.3.2 چوہدری (*Chaudharis*)

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، زمیندار نے زمینی محصول کی وصولی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں سے کچھ زمینداروں کو محصول کی

وصولی کے مقصد سے چوہدری نامزد کیا گیا تھا۔ ایک پرگنہ کے ممتاز زمینداروں میں سے ایک کو چودھری مقرر کیا گیا، عام طور پر ہر پرگنہ میں ایک۔ چودھری کو پرگنہ کے دوسرے زمینداروں سے محصول وصول کرنا تھا۔ اپنے روایتی نان کار کے علاوہ، یہ چودھری ان کے ذریعہ جمع کردہ زمینی محصول میں ایک اور حصہ کے حقدار تھے۔ اسے چوہدری کہا جاتا تھا جو جمع شدہ محصول کا ڈھائی فیصد بنتا تھا۔ زمیندار کے برعکس، چودھری کا تقرر ریاست نے کیا تھا اور اسے غلط کام کرنے پر ہٹایا جا سکتا تھا۔

11.3.3 دیگر بیچوان (Other Intermediaries)

ہر گاؤں میں متعدد موروثی آفسر ہوتے تھے۔ ان میں سب سے اہم گاؤں کا سردار تھا (شمالی ہندوستان میں مقدم اور دکن میں پٹیل)۔ وہ زمینی محصول کی وصولی اور دیہات میں امن وامان کی بحالی کا ذمہ دار شخص تھا۔ اس طرح کی خدمات کے لیے، اسے گاؤں کی زمین کا ایک حصہ بغیر محصول کے عطیہ کے طور پر دیا گیا تھا، حالانکہ، بعض صورتوں میں، اسے ساری اراضی کی آمدنی کے فیصد پر نقد معاوضہ بھی دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کسانوں سے پیداوار کی کچھ مقدار وصول کرنے کا بھی حقدار تھا۔ زمینی محصول کی وصولی کے کام میں مقدم کی مدد گاؤں کے کھاتہ دار (شمالی ہندوستان میں پٹواری اور دکن میں کلکرنی) کرتے تھے۔ پٹواری کا کام انفرادی کسانوں سے جمع ہونے والے محصول اور ریاستی حکام کو اس کی ادائیگی کا ریکارڈ (بہی) برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے اس کے ریکارڈ کسانوں کی آمدنی کی ادائیگی کی صلاحیت کا اندازہ لگانے اور گاؤں پر زمینی محصول کے سارے دعوے کو طے کرنے میں انتظامیہ کے لیے بہت مددگار ثابت ہوئے۔ مقدم کی طرح اسے بھی معاوضے میں زمینی محصول یا جمع شدہ کل محصول میں ایک مقررہ کمیشن کے ذریعے دیا جاتا تھا۔ تاہم، گاؤں کی تنظیم کا ملازم ہونے کی وجہ سے، اس کی آمدنی) وظیفہ (گاؤں کے سربراہ سے بہت کم تھا۔ مقدم اور پٹواری دونوں کے دفتر اور ساتھ کی مراعات موروثی تھیں۔

11.4 زرعی طبقات کے درمیان تعلقات (Interrelations between Agrarian Classes)

اس اکائی میں مختلف زرعی طبقات کے بارے میں مطالعہ کیا گیا۔ یہ دیکھا گیا کہ کئی گروہوں نے پیداوار کے اضافی حصے میں ایک حصہ مختص کیا، یعنی جاگیر دار، مذہبی وظیفیں، زمیندار اور گاؤں کی سطح پر مختلف بیچوان۔ یہاں، اس حصے میں، ان طبقات کے باہمی تعلقات کا مطالعہ کیا جائے گا۔ زمیندار اور جاگیر دار دونوں کی آمدنی کا انحصار کسانوں کی اضافی پیداوار پر تھا، اور اس لیے کسانوں کے استحصال میں دونوں ایک دوسرے کے ساتھی کے طور پر کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود، زمیندار، مستقل طور پر مقیم ہونے کی وجہ سے اس استحصال کی اجازت نہیں دے گا جو زائد پیداوار کی اجنبی سے آگے بڑھے، کیونکہ اس کے نتیجے میں کسانوں کے اخراج اور زرعی کاموں کو چھوڑنے کا باعث بنے گا جس کے نتیجے میں آنے والے سال کے دوران اس کے اپنے مالی دعوے متاثر ہوں گے۔ برنیئر کے بیان سے جاگیرداروں کا رویہ بہترین انداز میں ظاہر ہوتا ہے جس نے سترہویں صدی کے وسط میں ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جاگیرداروں کی جاگیروں کی متواتر منتقلی کی وجہ سے گورنروں اور محصول ٹھیکیداروں کو کسانوں کی ابتر حالت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لہٰذا وہ کسانوں کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کے اجڑنے اور کھیتوں میں پڑے رہنے کی قیمت پر۔

اٹھارویں صدی کے مصنف جواہر مل بیکاس نے مشاہدہ کیا ہے کہ ایک دن کا حکیم (جاگیر دار) ایک لمحے میں پانچ سو سال پر محیط زمیندار کو ہٹا سکتا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کو بٹھا سکتا ہے جو زندگی بھر بے جگہ رہا ہو۔ مورخ عرفان حبیب ان اختیارات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے، جاگیر داروں نے ان کو زمین پر غلاموں کی طرح قید کرنے اور اگر وہ بھاگ جائیں تو واپس لانے کے اختیارات کا دعویٰ کیا ہے۔" سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں ایک مقررہ مدت تک جاگیر رکھنے کی غیر یقینی صورتحال کی وجہ سے، جاگیر دار کسانوں پر ظلم کرتے تھے۔ عرفان حبیب کے مطابق، "جبکہ بلاشبہ مغل انتظامیہ نے جاگیر داروں کی وصولیوں کو منظم اور معتدل کرنے کے لیے اقدامات کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ یقینی نہیں ہے کہ یہ انفرادی جاگیر داروں کی جانب سے قلیل مدتی زیادہ سے زیادہ آمدنی کے دباؤ کو کم کر سکتے ہیں۔ ایسا دباؤ نہ صرف روکتا ہے۔ کاشت کی توسیع، بلکہ مغل حکمران طبقے کو دو بڑے زرعی طبقوں، زمینداروں اور کسانوں کے ساتھ گہرے تنازعہ میں بھی شامل کیا۔" ان حالات میں کسانوں کی بغاوتیں کبھی بھی محصولات کی طلب میں کمی کے مطالبے سے آگے نہیں بڑھیں۔ کسانوں نے بھی ایک ایسے زمیندار کے پیروکار کے طور پر بغاوت کی جو ریاست یا جاگیر دار کے خلاف بغاوت کر رہا تھا (زیادہ تر زمین کی پیداوار پر اس کے دعوے کے سوال پر)، یا تو اس امید پر کہ بغاوت کے خاتمے سے ان کے لیے زندگی کے بہتر حالات پیدا ہوں گے، یا محض اپنے مالک کی خدمت کے طور پر۔ اس نوعیت کی کسان بغاوتیں دراصل زمینداری بغاوتیں تھیں: زمینداروں نے ان کی قیادت کی اور کسانوں نے صرف زمینداروں کے مقاصد کی تکمیل کی۔

11.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے یہ چیز واضح ہوئی ہے کہ ریاست کی جانب سے جاگیر دار نے اضافی پیداوار میں ایک بڑا حصہ مختص کیا۔ ریاست کی طرف سے حاصل مفت محصولات اور مراعات سے فائدہ اٹھایا۔ انعامی اراضی/وظیفہ پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی جو مذہبی ادارے کو دی گئی۔ ان انعامی اراضی کی وجہ سے یہ ادارے نازک موڑ پر حکمرانوں کی مدد کرتے تھے۔ اس تحقیق میں یہ بھی پایا گیا کہ زمیندار زمین کا مالک نہیں تھا لیکن زرعی پیداوار میں اس کے موروثی حقوق تھے۔ اور یہ حقوق قابل فروخت تھے۔ زمیندار ریاست کے لیے محصول جمع کرتے تھے۔ وہ زمین کے مالک تھے اور کئی دیگر چھوٹی موٹی مراعات کے حقدار تھے۔ زمینداروں نے فوجیں سنبھال رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ گاؤں کے سربراہ اور دیگر عہدیداروں نے بھی زائد پیداوار کا ایک حصہ مختص کیا۔ کسانوں کو اپنی پیداوار کا بڑا حصہ ریاست، زمیندار اور دوسرے بیچوانوں کو دینا پڑتا تھا۔ بے زمین کسان یا دیہاتی مزدور، زرعی معاشرے میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ تھے۔ جاگیر دار اور زمیندار کے درمیان مفادات کا شدید تصادم ہوا۔ دونوں کے درمیان تنازعات کی صورت میں، کسان عموماً زمینداری کے ساتھ ہوتے تھے اور ان جھڑپوں میں سب سے زیادہ نقصان اٹھاتے تھے۔

11.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

خالصہ : (محفوظ) زمین جس کی آمدنی سلطان کے خزانے کے لیے مختص تھی۔

پٹہ : محکمہ محصول کی طرف سے کسانوں کو جاری کردہ ایک تحریری دستاویز جس میں محصول کی طلب کی شرح وغیرہ درج کی گئی تھی۔

مدد معاش : انعامی زمین حکومت کی طرف سے علمی یا مذہبی افراد کی گزر بسر کے لئے وظیفہ کے طور پر دی جاتی تھی۔

مہاجن : سوداگر، ساہوکار۔

ملکانہ : خصوصی آمدانی) وظیفہ (جو زمینداروں کو تفویض کیے گئے ہیں۔

پائیباقی : جاگیر زمین میں ایک خاص حصہ /زمین کا ٹکڑا۔

سیور گھل : کرایہ کی مفت زمین۔

وطن جاگیر : موروثی زمین۔

11.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغلیہ دور میں پرگنہ کیا تھا؟
2. وطن جاگیر کیا تھا؟
3. خالصہ زمین کیا تھی؟
4. پٹواری کسے کہتے ہیں؟
5. اجارہ داری نظام (محصول فارمنگ) کیا تھا؟
6. مقدم کون تھا؟
7. زمیندار کسے کہتے تھے؟
8. جاگیردار کسے کہتے تھے؟
9. مدد معاش کس سے کہتے تھے؟
10. مغلیہ سلطنت میں ثالث کون تھے؟

11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. زمیندار کے حقوق مختصراً بیان کریں؟
2. زمینی عطیات کیا تھیں؟ یہ عطیات کس نے حاصل کیں؟
3. جاگیرداروں کا تبادلہ کیوں ہوتا تھا؟

4. جاگیروں کی مختلف اقسام پر نوٹ لکھیے۔
5. جاگیر دار اور زمیندار کے درمیان مفادات کے تصادم پر بات کریں؟

11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. محصولاتی تفویضات اور عطیات پر تفصیلی گفتگو لکھیے۔
2. اجرا داری نظام پر روشنی ڈالئے۔
3. مغلیہ سلطنت میں جاگیر داری نظام کی نمایاں خصوصیت کی وضاحت کریں۔

11.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).
3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
4. Chandra, Satish, *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans*, Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta, 1986.
5. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
6. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
7. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1997).
8. Nurul Hasan, 'The Position of the Zaminar in the Mughal Empire', *The Indian Economic and Social History Review*, Vol. 1, No. 4, 1964.
9. Hasan, Saiyid Nurul, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, New Delhi, 1990 (first pub. in 1973).
10. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
11. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black, Ranikhet, 2016.
12. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*, *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers Pvt., Ltd., New Delhi, 1995 (first pub. 1983).
13. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. in 1923).
14. Ray, Aniruddha, *Some Aspects of Mughal Administration*, Kalyani Publishers, Calcutta, 1984.
15. Roychaudhuri, Tapan and Irfan Habib, *The New Cambridge Economic History of India, Vol. I*, Cambridge University Press, New Delhi, 1982.
16. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *Mughals and Franks*, Oxford University Press, New Delhi, 2014 (first pub. in 2005).
17. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *From the Tagus to the Ganges*, Oxford University Press, New Delhi, 2011 (first pub. in 2005).
18. Shivram, Balkrishan, *Jagirdars in the Mughal empire during the Reign of Akbar*, Manohar, New Delhi, 2008.

اکائی 12۔زرعی بحران

(Agrarian Crisis)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 زرعی بحران کا نظریہ

12.2.1 زمینداروں کا کردار

12.2.2 جاگیرداری بحران

12.2.3 سلطنت کی انتظامی کمزوری

12.2.4 سماجی فواضل کا فقدان

12.2.5 بچولیوں کا کردار

12.2.6 زرعی بحران سے متعلق سوالات

12.3 زرعی بحران کے نظریے کی تنقید

12.4 اکتسابی نتائج

12.5 کلیدی الفاظ

12.6 نمونہ امتحانی سوالات

12.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید (Introduction)

بہت عرصے پہلے الفنسٹون(Elphinstone) اور جدو ناتھ سرکار (Jadunath Sarkar)نے مغل سلطنت کے زوال کے لیے مختلف حکمرانوں اور ان کی حکمت عملیوں کو ہی بنیادی طور سے ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔اس طرح عہد وسطیٰ کے سماج میں موجود تضادات، مختلف انتظامی اور غیر انتظامی اداروں کی بنیادی خصوصیات اور ان کے طریقہ کار کے مطالعے کو ان کے ذریعے اہمیت ہی نہیں دی گئی۔ان اداروں کے بارے میں مطالعہ کا آغاز درحقیقت اس وقت ہوا جب مغل دور کے زرعی بحران(Agrarian Crisis)اور جاگیرداری مسئلہ کی وضاحت شروع ہوئی اور مغل سلطنت کے زوال کے اسباب کو بنیادی سماجی اداروں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی۔مندرجہ بالا نظریے سے مغل دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنے میں پہل مورلینڈ نے کی۔

ڈبلیو۔ایچ۔مورلینڈ(W.H. Moreland)نے ہی پہلی بار یہ حقیقت اجاگر کرنے کی کوشش کی کہ سلطنت میں کاشتکاروں کا استحصال مسلسل بڑھ رہا تھا۔مذکورہ نظریہ اکبر اور اورنگزیب کے عہد حکومت کی مالگزاری (Land Revenue)سے متعلق طلب (demand)کے تقابلی مطالعے پر مبنی تھا۔اکبر(Akbar, 1556–1605)کے عہد حکومت میں زرعی مالگزاری پیداوار کی ایک تہائی$\frac{1}{3}$ تھی،جب کہ اورنگزیب(Aurangzeb, 1658–1707)کے عہد میں یہ مقدار بڑھ کر پیداوار کی نصف$\frac{1}{2}$ ہوگئی۔مورلینڈ نے اورنگزیب کے عہد حکومت میں مالیاتی بحران کی حالت کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو اورنگزیب کے ذریعے منصب نظام میں برابر ترمیم کرنے کی کوششوں کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ستیش چندر(Satish Chandra)اور عرفان حبیب(Irfan Habib) کے مطابق،مورلینڈ نے ان مسائل کو ٹھیک پہچانا لیکن ان مسائل کے اسباب اور نوعیت کے بارے میں ان کے نظریات الگ الگ ہیں۔ستیش چندر کے مطابق سلطنت کے زوال کا سبب یہ تھا کہ مغل حکمران،اس سماجی توازن کو بنائے رکھنے میں ناکام رہے جس پر منصب نظام اور دیگر انتظامی ادارے مبنی تھے۔لیکن عرفان حبیب کے مطابق ان مسائل کی جڑ منصب نظام کی طریقہ کار میں ہی موجود تھی۔مذکورہ نظام کے تحت کاشتکاروں کا استحصال مسلسل بڑھتا ہی جارہا تھا جس کی وجہ سے کاشت میں کمی آئی اور نتیجتاً مالگزاری کی مقدار کم ہوئی جو ریاستی آمدنی کی اصل بنیاد تھی۔زرعی اور جاگیرداری بحران (Agrarian and Jagirdari Crisis)سے متعلق نظریات کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان سے بہت سے بنیادی مسائل جڑے ہیں،جیسے زمینی ملکیت کی نوعیت،کاشتکاروں کی درجہ بندی،بچولیے(intermediaries)طبقے کی ساخت اور کردار،دیہی سماج کی ساخت اور مرکزی اور صوبائی سطح پر مغل انتظامیہ کا طریقہ کار وغیرہ۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- زرعی بحران کیا تھا،اس کی ماہیت اور اہمیت سے واقف ہوسکیں گے۔
- زرعی بحران میں مختلف طبقوں کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

- زمینداروں اور جاگیرداروں کے بیچ اختلاف اور اتحاد کے پہلوؤں کو سمجھ سکیں گے۔
- مغل سلطنت کی انتظامی کمزوری اور تسلط اور توازن کے نظام کے ختم ہونے کو جان سکیں گے۔
- مغل سلطنت کے زوال کے میں زرعی بحران کے کردار کو سمجھ سکیں گے۔

12.2 زرعی بحران کا نظریہ (The Theory of 'Agrarian Crisis')

عرفان حبیب کے مطابق مغل سلطنت کی فوجی طاقت کی بنیاد 'جاگیرداری نظام' تھی۔اس نظام کے تحت امراء، سلطنت پر مکمل طور پر منحصر تھے کیونکہ فوجی دستوں کی تقرری، نظم وضبط جیسے امور حکمران طبقے کے ذریعے ہی انجام دیے جاتے تھے۔ جاگیرداری نظام کے تحت ایک ایسی معیشت کا قیام ہوا تھا جس میں نقدی کا جال (cash nexus)اور زرعی پیداوار کی تجارت پوری طرح ترقی یافتہ تھی اور یہ ترقی بنیادی طور پر یکساں نظام محصول کے سبب ہی ممکن ہو سکی تھی۔اس طرح جاگیرداری نظام نے اپنی معاشی بنیاد کو خود ہی مضبوط کیا تھا۔زمینی مالگزاری کے تعین اور وصولی کے متعلق نظریاتی طور پر جاگیردار پر حکومت کا سخت تسلط تھا۔اسی طرح محصول کی اقسام بھی ریاست کے ذریعے بخوبی متعین تھیں۔ جاگیردار کے طور طریقوں پر بھی سختی سے نظر رکھی جاتی تھی۔ زمینی مالگزاری اس طرح متعین کی جاتی تھی کہ پیداوار کا زیادہ تر حصہ جاگیردار کو جاتا تھا اور کاشتکار کے پاس محض گزر بسر کے لائق ہی رہ جاتا تھا۔زرعی فواضل(agrarian surplus)پر مبنی تسلط کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل انتظامی طبقے کے وقار میں غیر معمولی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

زرعی بحران سے متعلق مسائل کا آغاز درحقیقت یہیں سے ہوا۔ عرفان حبیب کے مطابق مغلوں کے زمینی مالگزاری کی شرح کو درست کرنے کے لیے کوششیں کی گئیں اور مالگزاری کی شرحوں میں اضافہ اشیاء کی قیمت کی شرحوں میں اضافے کے تناسب میں ہی رہا۔تاہم،اس کے بعد بھی زرعی بحران آیا جس کا سبب جاگیردار اور مرکزی اقتدار کے باہمی مفادات کا ٹکراؤ تھا۔تبادلہ(transfer)کی روایت کی وجہ سے جاگیردار کسی جگہ پر مستقل طور سے رہ نہیں سکتے تھے اس لیے اپنی جاگیر کی مالگزاری میں اضافے کے لیے،جو کاشتکاری میں ترقی کے ذریعے ہی ممکن تھی،وہ کوشش نہیں کر سکتے تھے۔اس کے برعکس وہ اس علاقے سے زیادہ سے زیادہ وصولی کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو اپنے مفاد کے لیے وہ استحصال کا بھی سہارا لیتے تھے،بھلے ہی کسان کی محصولی صلاحیت ہمیشہ کے لیے ختم کیوں نہ ہو جائے۔ایسا صرف دو ہی صورتحال میں ممکن تھا۔یا تو جاگیردار کو جمع دامی(*Jama–dami*)کے تعین اور وصول کرنے میں کافی چھوٹ ملی ہوئی تھی یا وہ شاہی اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔انتظامی دستور العمل(administrative manuals) اور سیاحوں کی یادداشتوں سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ جاگیردار کسی نہ کسی بہانے کسانوں یا یہاں تک کہ پورے گاؤں کو فروخت کر دیتے تھے یا انہیں لوٹ لیتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زرعی پیداوار میں کمی آئی کیونکہ جاگیردار کے ظلم کے سبب کاشتکار اپنی 'جوت'(*jot*)یا زمین چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ یہ سلسلہ اکبر کے عہد سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک برابر جاری رہا جبکہ بڑے بڑے زرعی قطعات اکثر وبیشتر بنا کاشت کے ہی پڑے رہتے تھے۔ عرفان حبیب کے مطابق پیداوار میں کمی کا اندازہ علاقائی اعداد و شمار (area

(statistics کے حوالے سے نہیں لگایا سکتا کیونکہ اس عہد میں ایسی بہت سی نئی زمینوں کی پیائش ہوئی ہوگی جن کی تفصیلات انتظامی دستوروں میں نہیں ملتی یعنی ایک جگہ اگر ویران ہوئی ہوگی تو کاشتکار کسی دوسرے جگہ پر جا کر بس گئے ہوں گے اور اس طرح نئی زمین پر کھیتی باڑی کا کام شروع ہوا ہوگا۔

جمع دامی کے اعداد و شمار میں افزائش، درحقیقت قیمتوں میں اضافے کے ساتھ ہی ہوئی، لیکن زمینی مالگزاری کی مقدار پہلے جیسی ہی رہی۔ اس لیے جمع کو مصنوعی طریقے سے بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا، بھلے ہی پیداوار میں کمی کیوں نہ آئی ہو۔ عرفان حبیب کا ماننا ہے کہ کسانوں کے ذریعے اپنی زمین چھوڑ کر فرار ہونے کا عمل عام طور سے مسلسل بڑھ رہا تھا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ کسان اس طرح زمینی مالگزاری کی ادائیگی سے بچ سکتا تھا۔ یہی نہیں نئی زمین کو جوت میں لانے کے لیے انہیں رعایت بھی حاصل ہوتی ہوگی۔ اس رجحان کو روکنے کے لیے کاشتکاروں پر کچھ بندشیں لگائی جاتی ہوں گی جن کے سبب کاشتکاروں کے پاس دو ہی متبادل تھے: یا تو وہ گھریلو مزدوری کے کام کریں یا پھر کسی دوسری زمینداری میں بھاگ جائیں اور بغاوت کر دیں۔ باغی گاؤں، جنہیں زور طلب (*Zor–talab*) یا مواس (*Mawas*) کہا جاتا تھا، علاحدگی اور مالگزاری کے شعبے میں موجود اختلاف کی وجہ سے دیگر دیہاتوں کو متاثر نہیں کرتے تھے۔ ذات کے نظام اور مذہبی تحریکوں کا اس طرح کی بغاوتوں پر الگ الگ اثر پڑا تھا۔ کہیں ان سے متاثر ہو کر یہ بغاوتیں وسیع علاقوں میں پھیلی تھی اور کہیں ان کی وجہ سے بے اثر ہو کر رہ گئی تھیں۔ کسان بغاوتوں میں زمینداروں کا کردار بھی اہم تھا۔

12.2.1 زمینداروں کا کردار (Role of the Zamindars)

روایتی طور پر زمینداروں کی مرکزی اقتدار سے زرعی فواضل میں اپنے حصے کو لے کر شدید کشمکش چلی آرہی تھی۔ عرفان حبیب لکھتے ہیں: 'سلطنت میں زمینداروں کی حالت محصل (tax collector) کی تھی۔ ان کو ان کے کاموں کے عوض میں (سرکار کی طرف سے) خراج (مالگزاری) کا کچھ حصہ لینے دیا جاتا تھا۔ لیکن کاشتکاروں سے ان کی وصولی کچھ اسباب کی بنا پر ممنوع تھی۔ ایسا حکومتی قوانین کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا۔ اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مالگزاری کی شرح (taxation rate) اونچی ہونے کی وجہ سے کاشتکار کے پاس اتنا بچ ہی نہیں پاتا تھا کہ کوئی اس میں حصے دار ہو۔' واضح ہے کہ اس صورت حال میں زمیندار غیر مطمئن رہتا تھا۔ زمینداروں کے پاس چونکہ مسلح فوجی رہتے تھے، اس لیے ان کو آسانی سے دبایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مغل سلطنت میں زمینداروں کی حالت کچھ اس طرح کی تھی کہ حکومت ان کی موجودگی کا فائدہ تو اٹھاتی تھی لیکن ان پر بھروسہ نہیں کرتی تھی۔ ایسی صورتحال میں زمیندار کا مرکزی اقتدار کے خلاف آواز بلند کرنا فطری ہی تھا۔ مرکزی اقتدار سے کشمکش میں بسا اوقات زمیندار اپنے ساتھ کاشتکاروں کو بھی ملا لیتے تھے۔ عرفان حبیب کا تجزیہ ہے کہ خود مختار حکمرانوں کے علاقے میں زرعی مالگزاری کی شرح کم تھی۔ اس لیے وہ جاگیردار کے علاقوں کے کسانوں کو مسلسل ورغلاتے رہتے تھے۔

ان کاشتکاروں کے ذریعے زمیندار کے علاقوں میں پیداوار میں اضافہ ہوتا تھا اور اس طرح زمیندار کی طاقت میں بھی بڑھوتری ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں مفرور کاشتکاروں کی تعداد زیادہ ہو جانے پر اس کی عسکری قوت بھی بڑھ جاتی تھی جس کا فائدہ وہ حکومت کے خلاف جارحانہ

رویہ اپنانے اور اپنے زمینداری علاقوں میں اضافہ کرنے میں اٹھاتے تھے۔ جاٹ(Jat)اور ستنامی(Satnami)بغاوتوں کے دوران جن میں کسانوں کا کافی اہم کردار تھا، زمینداروں کے ذریعے کاشتکاروں کی طاقت کی بنیاد پر ہی اپنے زمینداری علاقوں کی توسیع کی گئی اور لوٹ مار مچائی گئی۔ منصب داروں کی طاقت میں کمی کے بعد کاشتکاروں میں زمینی محصول ادا نہ کرنے کا رجحان بڑھنے لگا اور زمینداروں نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اختیارات میں اضافہ کیا۔ انہوں نے مراٹھوں کی حمایت بھی حاصل کی۔ متواتر تبادلوں کی وجہ سے منصب دار کسی ایک علاقے میں اپنی طاقت کو مستحکم کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ اسی لیے جاگیر دار، زمینداروں سے ہاتھ ملا لیتے تھے اور اپنے مفاد کے لیے کاشتکاروں کو تنگ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مراٹھے الگ سے اپنا محصول وصول کرتے تھے۔ اس طرح ایک جاگیر کے دو مالک تھے۔ اس صورت حال میں مراٹھوں کا اثر بڑھتا چلا گیا۔ جیسا کہ عرفان حبیب کہتے ہیں، اگرچہ شیواجی کے دور میں کاشتکاروں پر ٹیکسوں کا بوجھ مغلوں سے کم نہیں تھا، اس کے باوجود کاشتکاروں کی لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح ایک قسم کا برادستور قائم ہو گیا جس کی وجہ سے بربادی میں اضافہ ہوا اور بالآخر مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب بنا۔

12.2.2 جاگیرداری بحران (Jagirdari Crisis)

ستیش چندر نے ایسے بہت سے سماجی و اقتصادی مسائل کا ذکر کیا ہے جو مغل طبقہ امرا کی ساخت اور اس کی تنظیم کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ ان تمام مسائل کی وجہ سے جاگیروں کے علاقے میں شدید بحران پیدا ہو گیا۔ اس بحران کی وجہ دراصل یہ تھی کہ زرعی اور صنعتی شعبے کی پیداوار انتظامی طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے سے قاصر تھی۔ اورنگ زیب کے دور میں دکن اور راجستھان میں کئی تنازعات کی وجہ سے حالات مزید سنگین ہو گئے۔ معاشی اور سیاسی طور پر دو طبقے نمایاں تھے جن میں سے ایک زمینداروں تھا۔ یہ طبقہ موروثی تھا۔ اس طبقے کے درمیان تسلی بخش تعلقات قائم کرنا، دراصل مغلوں کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک تھا۔ زمیندار ہمیشہ اپنی طاقت بڑھانے کے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے۔ اکثر وہ اپنے علاقوں میں سرکاری اہلکاروں کے لیے دہشت پھیلاتے تھے۔ ستیش چندر کے بقول وہ کسانوں اور تاجروں کو کئی اضافی محصول(cess)ادا کرنے پر مجبور کرتے تھے۔

مغل سلطنت کے استحکامی عمل کے نتیجے میں زمیندار طبقے کے اختیارات اور خصوصی مراعات(perquisites)میں کمی واقع ہوئی۔ اگرچہ کچھ اقدامات ان کے لیے فائدہ مند بھی تھے، لیکن زیادہ تر سے ان کی طاقت اور شان و شوکت پر منفی اثرات مرتب ہوئے، جس کی اس طبقے کی طرف سے مزاحمت کیا جانا فطری تھا۔ اسی لیے زمینداروں نے مسلسل سلطنت کے استحکام کے عمل میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کا کام کیا۔ یہ اس زمانے کی خصوصیت تھی۔ بندیل کھنڈ اور راجستھان جیسے علاقوں میں، اگر کسی کے زمینداری کے حقوق میں مداخلت کی جاتی ہے تو زمیندار سے متعلق پورے خاندان کی طرف سے مزاحمت دیکھنے کو ملتی ہے۔ زمیندار کی طاقت کو توڑنے کے لیے صوبے، سرکار اور پرگنہ کی سطح پر مضبوط حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ زمینداروں کو منصب دار بھی مقرر کیا گیا، لیکن اس کے بعد بھی وہ سنگین مسائل پیدا کرتے رہے۔ راجستھان، دکن اور وسطی ہندوستان میں یہ طبقہ نہایت طاقتور بنا رہا۔ دوسری طرف جاگیرداری کا عہدہ موروثی نہیں تھا اور اسے مسلسل منتقل کیا جا رہا تھا۔ یہی نہیں، انہیں براہ راست یا مقدم کے ذریعے ٹیکس کی وصولی کے لیے زمینداروں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ سلطنت

کے استحکام کے بعد، جاگیرداروں کو کھیتی باڑی میں ترقی اور پیشرفت کی اہم ذمہ داری نبھانی پڑی۔ اس کے لیے بہت سی رعایتیں اور سہولتیں دی گئیں جن کا بہت ہی اہم اثر مرتب ہوا۔ جاگیردار ہمیشہ اپنے لیے زرخیز یعنی سیرِ حاصل (*Sair–i–Hasil*) جاگیر حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے اور اپنی جائیداد کو موروثی بنانے کا موقع بھی ڈھونڈتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کا کردار جدوجہد سے بھرپور تھا۔

12.2.3 مغل سلطنت کی انتظامی کمزوری (Administrative Weakness of the Mughal Empire)

ان دونوں طبقوں کی طاقت اس وجہ سے بے پناہ بڑھ گئی تھی کہ ان کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے والا کوئی دوسرا طبقہ نہیں تھا۔ دیہات کا ریاستی امور سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ صنعت و تجارت کی حیثیت زراعت کے مقابلے میں غیر معمولی تھی جس کی وجہ سے دیہات میں کوئی بااثر طبقہ ابھر نہیں پایا تھا۔ منصبداری نظام کے قیام اور مغل طبقہ امراء کو ایک ہم جنس طبقے (homogeneous class) کے طور پر ترقی دینے کی کوششوں کے ذریعے مختلف طبقات میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ راجپوتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوششیں بھی اس مقصد سے کی گئیں کہ ایک باہم مربوط طبقہ امراء قائم کیا جائے اور پرانے امرا کی طاقت کو قابو کیا جائے۔ لیکن نسلی (racial) اور مذہبی انفرادیت برقرار رہی اور مغلوں کی ہر کوشش کے باوجود خاندانی اور قبیلائی عصبیت (clan and tribe particularism) کا احساس برابر موجود رہا، حالانکہ یہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ خود طبقہ امراء پر مہلک نقصان پہنچائے۔ یہ ایک ایسا قابل ذکر ادارہ تھا جس کے ذریعے مختلف خطوں اور ذاتوں، مختلف زبانوں، مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی قائم ہوئی۔

سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں امراء پر طرح طرح کے دباؤ پڑنے لگے اور اس کا اثر سلطنت کے بکھرنے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ سلسلہ جاٹ بغاوت سے شروع ہوا جو فوجدار کے مظالم کے خلاف احتجاج کی شکل میں شروع ہوا۔ اس کے بعد ستنامی اور سکھ بغاوتیں ہوئیں جس کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کے وقار کو دھچکا لگا۔ ان کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتی دشمنی اور ہم آہنگی کے فقدان سے متعلق حقائق بھی سامنے آئے۔ راجپوتوں کے ساتھ قطع تعلق کا بھی یہی نتیجہ نکلا۔ ایسے مشکل وقت میں مراٹھوں سے دوستی قائم کرنی پڑی۔ ان تمام وجوہات نے جاٹوں اور سکھوں کو مغلوں کی نافرمانی پر مزید اکسایا۔ شیواجی کے عزائم اور چوتھ اور سردیش مکھی ٹیکس کی وصولی مغلوں کے اپنے ماتحت علاقوں کو لوٹ مار سے بچانے کی صلاحیت کے لیے ایک چنوتی تھی۔ اپنی نااہلی کی وجہ سے انہیں اپنے اقتدار سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ شیواجی کی سرگرمیوں نے شمالی اور مغربی ہندوستان میں تجارت کو بھی متاثر کیا۔ مراٹھوں کی مزاحمت کے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ مقامی عہدیداروں نے اس میں زیادہ فائدہ دیکھا کیونکہ وہ اب مراٹھوں کے ساتھ ذاتی سطح پر سانٹھ گانٹھ کر سکتے ہیں۔ مراٹھوں کے مسلسل حملوں نے نہ صرف ہندوستان میں تیموری خاندان کی اقتدار اعلی کی روایت کو نقصان پہنچایا بلکہ امراء طبقے میں مضمر ہندو-مسلم توازن کو بھی متاثر کیا۔ اس لیے جاگیرداری بحران کے تناظر میں مراٹھا سرداروں کے عزائم کو پورا کرنا اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔

12.2.4 سماجی فواضل کا فقدان (Lack of the Social Surplus)

بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ اس دور میں سماجی فواضل (social surplus)، نظم و نسق، جنگی امور اور انتظامی طبقے کے طرز زندگی کو

پورا کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ پیداوار بڑھانے کے لیے مناسب مراعات ملنے کے بعد بھی پیداوار اس حد تک نہیں بڑھ سکی کہ وہ بالائی طبقے کی پر تعیش طرز زندگی کی متحمل ہو سکے۔ یہ حقیقت جہانگیر کے آخری برسوں میں ہی عیاں ہونا شروع ہو گئی۔ تخمینی آمدنی یعنی 'جمع' (estimated revenue) اور حقیقی آمدنی یعنی 'حاصل' (actual revenue) میں فرق بڑھنے لگا جس کی وجہ سے حاصل شدہ رقم کے ماہانہ پیمانے (monthly scale) کی بنیاد پر جاگیروں کا نظام شروع ہوا۔ لیکن ان اقدامات سے مسئلہ حل نہیں ہو سکا اور حکمرانی میں کفایت شعاری اختیار کرنے کے دیگر اقدامات کے باوجود اورنگزیب کو مالگزاری میں گھاٹے کا سامنا کرنا پڑا۔ جاگیروں اور دربار میں تقرریوں کی جدوجہد کی وجہ سے ذات پات اور نسلی انفرادیت کا پوشیدہ احساس شدید ہونے لگا۔ اگرچہ دکن آمدنی کے لحاظ سے ایک خسارے کا علاقہ تھا، لیکن پھر بھی وہاں دکنی امیروں کی مدد اور جنگوں وغیرہ میں بہت زیادہ سونا خرچ کیا گیا۔ ہر امیر شمال کے پر امن علاقے میں جاگیر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی کھینچ تان کی وجہ سے جاگیریں دینے میں تاخیر ہو جاتی تھی۔ ان جاگیروں سے مقررہ آمدنی کا صرف ایک حصہ ہی مل پاتا تھا۔ جن علاقوں میں آمدنی جزوی تھی وہاں سے جمع وصول کرنے کی جاگیرداروں کی کوششوں کی وجہ سے کاشتکاروں نے کھیتی باڑی چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مسلح بغاوتیں بھی کیں۔ آمدنی میں بے یقینی کی وجہ سے منصب داروں کی طاقت بھی کمزور پڑ گئی۔ بہت سے منصب داروں نے اپنی جاگیریں اجارے (lease) پر دینا شروع کر دیں یا نقد ادائیگی لینا مناسب سمجھا۔ اس طرح 1707 تک جاگیرداری نظام کمزور پڑ چکا تھا۔ ایسے میں اس کا ایک ہی حل تھا کہ اس کی برائیوں کو ختم کیا جائے اور اس نظام مالگزاری میں نئی اصلاحات کی جائیں اور ایسی چیزوں کی منظوری دی جائے جو آج تک ممکن نہ تھیں۔ اس طرح یہ بحران در حقیقت ایک 'سماجی مسئلہ' تھا جس کا حل کاروبار کی تیز رفتار توسیع یا تکنیکی تبدیلیوں سے ہی ممکن تھا۔ اس کے لیے اس وقت کے سماجی نظام میں موجود رکاوٹوں کو بھی ختم کرنا تھا۔ اس طرح اس بحران کا خاص طور پر عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی معیشت کے سماجی تعلقات کے تناظر میں جائزہ لیا جانا چاہیے۔ زرعی نظام اور انتظامی ساخت انہی رشتوں کی بنیاد پر مبنی تھا۔

12.2.5 بچولیوں کا کردار (The Role of Intermediaries)

زمینداروں کے ساتھ مغلوں کے تعلقات کے تعین میں ذات اور دیہی معاشرے کی ساخت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ خودکاشت (*Khudkasht*)، مقامی افسران اور بچولیے زمیندار اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دیہات میں انہیں کا غلبہ اور اثر و رسوخ تھا۔ مغل انتظامیہ نے ان کے اور فوجدار کے ذریعے بڑے زمینداروں کے خصوصی اختیارات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ مغلوں کی طاقت اور وقار اور ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے حقوق غصب کرنے سے روکنے کی ان کی کوششوں کی وجہ سے سماج میں توازن قائم ہو گیا۔ یہاں کاشتکار، زمیندار کے بجائے مرکزی انتظامیہ سے اپنے تحفظ کی گزارش کرتا تھا۔ سماج میں مستحکم صورتحال اسی وقت ممکن تھی جب خودکاشتوں، مرکزی اقتدار اور زمیندار کے درمیان توازن قائم ہو۔ فوجدار مالگزاری وصول کرنے میں جاگیردار کی مدد کرتا تھا ساتھ ہی جاگیردار کے خلاف کاشتکاروں کی شکایات کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ مرکزی حکومت کے 'واقعہ نویس' (*Waqia–i–Nawis*) ان دونوں ہی کی نگرانی کرتے تھے۔ تسلط اور توازن (check and balance) کا یہ نظام مغلوں کے انتظامی ڈھانچے کا جزو لاینفک تھا۔ یہ

نازک توازن بہت سے حقائق کی وجہ سے ہی ٹوٹ سکتا تھا۔ بے زمین اور نچلے طبقے کے لوگوں کو غیر کاشت شدہ زمین (virgin land) پر ملکیت قائم کرنے کے اختیارات (proprietary rights) نہیں تھے۔ مغل کاشت کی گئی زمین کی توسیع کے لیے بنیادی طور پر زمیندار اور بڑے زمیندار طبقے پر زیادہ سے زیادہ منحصر تھے جس کی وجہ سے بحران مزید بڑھ گیا۔ بعض اوقات یہ دلیل دی جاتی ہے کہ چھوٹے منصبداروں کے تبادلے اکثر ہوتے تھے۔ منصب دار زیادہ تر زمینداروں سے ہی محصول وصول کرتے تھے، جن پر آسانی سے طاقت کا استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح کسان براہ راست متاثر نہیں ہوتا تھا۔ زمیندار کی طاقت پہلے کی نسبت بڑھ گئی تھی۔ سترہویں صدی میں وہ مالگزاری کی وصولی کے نظام کا ایک لازمی حصہ بن گئے اور 'جمع' میں ان کا حصہ شامل تھا۔ زمینداروں کے اس بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کی وجہ سے کاشتکار، مغل انتظامی اثر ورسوخ سے دور ہو گئے۔ دکن میں اس وقت کے سیاسی حالات کی وجہ سے کاشتکاروں کی حالت خراب ہوئی جب کہ زمینداروں کی حیثیت مضبوط ہوئی۔ زمیندار، مراٹھا سرداروں کے ساتھ مل گئے اور اس طرح مغل جاگیر دار، زمینی آمدنی کے اپنے حصے سے محروم رہ جاتا تھا۔ سترہویں صدی کے بعد کے عرصے میں مغل اس سماجی توازن کو برقرار رکھنے میں ناکام رہے جس پر مغل سلطنت کی بنیاد قائم تھی۔ یوں انتظامی بحران بھی پیدا ہو گیا۔ ان کا باہمی تعامل اور ردعمل ہی مجموعی طور پر جاگیر داری بحران کا سبب بنا۔

12.2.6 زرعی بحران سے متعلق سوالات (The Questions Related to Agricultural Crisis)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تصورات کی درستگی اور امکانات کو کس بنیاد پر جانچا جائے؟ عرفان حبیب کے مطابق کاشتکار طبقے کے اوپر بڑھتے ہوئے استحصال کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسان اپنی زمینیں چھوڑ کر بھاگ گئے اور مسلح بغاوت کی نوبت آگئی۔ اس سے پیداوار میں کمی آئی اور بہت زیادہ بربادی ہوئی۔ اس سلسلے میں کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

- کیا استحصال (exploitation) میں اضافہ ہوا تھا؟
- کیا کاشت میں کمی آئی تھی؟
- کسان بغاوت (peasant uprising) کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ بڑھتے ہوئے استحصال کی وجہ سے ہوئیں تھیں؟
- کیا جاگیر داروں کے متواتر تبادلوں سے ہی استحصال میں اضافہ ہوا؟ کیا استحصال کرنے کی مقدار بڑھی تھی اور اس کی سطح کیا تھی؟ کیا یہ ایک عام حقیقت تھی؟
- کیا کسانوں کے فرار ہونے کا مسئلہ وسیع تھا؟ اس سے کون کون سے طبقے متاثر ہوئے؟

جاگیر داری کا بحران دراصل مغلوں کے سماجی توازن کو برقرار رکھنے میں ناکامی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا جس پر اس وقت کا سماجی نظام قائم تھا اور جو سلطنت کا سنگ بنیاد تھا۔ زمینداروں کی بڑھتی ہوئی طاقت اس کی ایک اہم وجہ تھی۔ اس تعلق سے کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

- کیا کاشتکاروں کے مقابلے میں زمینداروں کی طاقت بڑھ رہی تھی؟
- کیا کوئی دیہی برادری (village community) ایسی تھی جو رکاوٹ بننے کے قابل ہو؟
- کسانوں خصوصاً مالدار کاشتکاروں کی کیا حالت تھی؟ اس کے (1) بے زمین کرایہ دار، (2) زمیندار اور (3) ریاست سے کس قسم

کے تعلقات تھے؟

- بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زرعی بحران (agrarian crisis) کی صورت حال موجود تھی؟ اگر ایسا ہے تو کیا یہ کسانوں کے زوال کا باعث بنی یا پھر یہ صرف زرعی تعلقات کے خاتمے کے ضمن میں ہے؟

مسلسل بڑھتے استحصال کے بارے میں عرفان حبیب کا استدلال یہ ہے کہ کسان کے پاس صرف اتنی پیداوار رہ گئی تھی جو اس کے گزارہ کے لیے بمشکل کافی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ محصول کی نقد شرح میں اضافہ، قیمتوں میں اضافے کے تناسب سے ہی ہوتا رہا۔

12.3 زرعی بحران کے نظریے کی تنقید (A Critique of the 'Agrarian Crisis' Theory)

مغلیہ سلطنت جیسی مرکزی افسر شاہی میں، اخراجات میں اضافے کا امکان بنے رہنا فطری تھا۔ ریاست کے پاس بڑھتے ہوئے اخراجات کی تکمیل کے لیے وسائل جمع کرنے کے درج ذیل متبادل تھے۔ زراعت میں اضافے اور ترقی کی حوصلہ افزائی کے لیے اقدامات کریں یا نئی تکنیک پر مبنی صنعتوں کی ترقی اور تجارت کی توسیع کے لیے کوششیں کریں یا پھر اس حد تک استحصال کریں کہ مستقبل میں اس سے کسی قسم کے منافع کی گنجائش ہی نہ رہے۔ چونکہ کسان کے پاس پہلے سے ہی گزارہ لائق ہی بچتا تھا، ایسے میں اس کے مزید استحصال کے امکانات کم نظر آتے ہیں۔ درحقیقت سلطنت کے مضبوط ہونے یا زوال کی وضاحت اس صورت حال میں اور بھی ممکن نہیں جب کسان کے وسائل کی سطح محض گزر بسر تک محدود تھی اور اس کا استحصال بھی مسلسل جاری رہا۔ مالگزاری کی شرح مسلسل، پیداوار کے نصف یا ایک تہائی کے درمیان رہتی تھی۔ اورنگ زیب کے دور میں بھی یہی شرح بنی رہی۔ اس طرح ریاستی سطح پر محصول کی شرح میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ جہاں تک جاگیر کے تبادلے اور اس سے متعلق استحصال میں اضافے کا تعلق ہے تو عرفان حبیب نے اپنی رائے بنیادی طور پر ان غیر ملکی سیاحوں کے سفر ناموں پر قائم کی ہے جن کی صداقت کچھ عرصے سے مشتبہ ہو چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ زمینی مالگزاری کون وصول کرتا تھا؟ اور وہ کون تھے جن سے جاگیر دار اسے وصول کرتا تھا؟ زمینی مالگزاری درحقیقت زمینداروں کے مختلف زمروں کے ذریعے وصول کی جاتی تھی۔ زمیندار دراصل خود مقدم سے اسے وصول کرتے تھے۔ زمیندار کا اپنا حصہ تقریباً 2.5 سے 10 فیصد تک ہوتا تھا، بقایا رقم وہ جاگیر دار کے حوالے کر دیتے تھے۔ اس طرح جاگیر دار کے تبادلے کا کاشتکار پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ایس۔ نورالحسن (S. Nurul Hasan) کے مطابق، اس کی وجہ یہ تھی کہ زمیندار اپنا کافی اثر و رسوخ بنائے رکھنے کے قابل تھے۔

یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ کاشتکاری میں توسیع صرف جزوی یا نہ ہونے کے برابر ہی ہوئی۔ ربیع کی فصل کی توسیع، جو کہ زیادہ تر آبپاشی کے مصنوعی وسائل پر مبنی تھی، مغل سلطنت کے حاشیائی علاقوں جیسے کہ راجستھان میں بھی ہوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس عرصے میں نقدی فصلوں (cash crops) کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس سے زراعت میں سرمایہ کاری کا ثبوت بھی ملتا ہے جو کہ زراعت کی ترقی اور توسیع کی حالت میں ہی ممکن تھی۔ استحصال کی وجہ سے زراعت کے زوال کی صورت میں یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا کیونکہ اٹھارہویں صدی تک شہروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ حمیدہ خاتون نقوی (Hamida Khatun Naqvi) کے مطابق

ہندوستان، غذائی اجناس کے میدان میں خود کفیل تھا، یہاں تک کہ کچھ پڑوسی ممالک کو گیہوں اور چاول برآمد بھی کیے جاتے تھے۔اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں کاشتکاری کا ارتقا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ ارتقا زرعی تکنیک کی بڑھتی ہوئی ترقی کی وجہ سے نہیں ہوا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے کے دوران نقد فصلوں کی مقدار میں اضافہ ہوا، جس کا مطلب یہ تھا کہ زراعت میں اضافی سرمایہ لگایا جارہا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ ریاست کے ذریعے کسانوں کو بھی انفرادی سطح پر کھیتی کی توسیع و ترقی کے لیے مدد اور سرمایہ فراہم کیا جارہا تھا۔ کسانوں کے پاس محصول کی شرح کو پورا کرنے کے بعد، اتنا ضرور بچ جاتا تھا کہ وہ چھوٹے پیمانے پر زراعت کو ترقی دے سکیں۔ ستیش چندر اور دلباغ سنگھ (Dilbagh Singh) کی طرف سے دی گئی تفصیلات بھی اس خیال کی تائید نہیں کرتی ہیں کہ زراعت تباہ ہو گئی تھی اور بہت سی زمین غیر کاشت پڑی تھی۔ان کے مطابق، پٹیل کو مخصوص احکامات دیے جاتے تھے کہ وہ پاہی کاشتکاروں کو زمین جوتنے پر آمادہ کریں۔انہوں نے اس حوالے سے حکومتی پالیسی کا بھی ذکر کیا ہے۔اس طرح نورالحسن، ستیش چندر، دلباغ سنگھ اور بی آر گروور (B.R. Grover) وغیرہ کے کاموں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغلوں کی زرعی شعبے میں توسیع اور استحکام لانے کے حوالے سے ایک منظم حکمت عملی تھی اور اس بات کی توثیق کے لیے کافی ثبوت دستیاب ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھیم سین کی شکایت ان چھوٹے منصبداروں کے بارے میں ہے جو شاہی متصدّیوں (*Mutasaddis*) کے رحم و کرم پر تھے اور جن کی فوجی ٹکڑی 'دام' تو کیا ایک 'درہم' بھی جمع کرنے کے قابل نہیں تھیں۔اے جے قیصر (A.J. Qaisar) کے مطابق یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ 80 فیصد زمین بڑے جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھی اور ان میں سے کچھ تو دس سال تک اس زمین پر مسلسل قبضہ بنائے رکھتے تھے۔ایس۔نورالحسن کا ماننا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تبادلہ کے عمل سے زمینداروں کی طاقت میں کمی نہیں آئی بلکہ اس سے ان کی تعداد اور اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا۔ زمینداروں کے مالگزاری وصولی کے نظام میں شامل ہونے کے بعد تو، زرعی شعبے میں توسیع اور ترقی کا کام بھی درحقیقت انہیں پر منحصر ہو گیا کیونکہ وہ اکثر کاشتکاروں کے 'ضامن' (ضمانتی) ہوتے تھے۔ ستیش چندر اور دلباغ سنگھ کا نظریہ ہے کہ کاشتکاروں کے اپنی زمین چھوڑ کر بھاگنے اور باغیانہ رجحان کے تناظر میں کاشتکاروں کو ہم جنس گروہ (homogeneous entity) مان کر ہی بیان کیا گیا ہے، جب کہ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ دیہی معاشرے میں بڑے پیمانے پر طبقاتی تقسیم تھی اور بقول ستیش چندر مختلف طبقات کی حیثیت اور خصوصی حقوق میں وسیع فرق تھا۔ کیا اس حقیقت کو مد نظر رکھے بغیر دیا گیا کوئی بھی بیان منطقی اور درست ہو گا؟ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ دیہات میں بے زمین مزدوروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔اس کے علاوہ زمین اور زمین دار کا تناسب بھی سازگار تھا۔ یہ حقیقت دیہی سطح پر ذات اور طبقے کے کردار کو اور بھی اہم بناتی ہے۔

درحقیقت صورتحال یہ تھی کہ مغلوں نے زمینداروں کی طاقت کو محدود کرنے کی کوشش کی اور اس طبقے سے فائدہ بھی اٹھایا۔ان دونوں کے مفادات میں تفاوت دراصل اس ساری بحث کا بنیادی حصہ ہے۔ یہ قبول کرنا مشکل ہی ہے کہ خود مختار راجاؤں کے علاقوں میں محصولات کی شرح سلطنت کے بقیہ حصوں سے کم تھی۔ اگر زمین اور کاشتکار کا تناسب موافق تھا اور پٹیل وغیرہ کو رعایتیں دی گئیں تو یہ یقین

کرنا بھی انتہائی مشکل ہو گا کہ کاشتکاروں کا استحصال تمام حدوں کو پار کر چکا تھا۔ایچ۔ سی۔ورما(H.C. Verma)کے مطابق 'کسان بغاوتوں کی نوعیت کے حوالے سے عرفان حبیب کا بیان زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کسانوں نے اس میں حصہ لیا۔'بغاوت میں ان کی شرکت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جاگیر دار کے استحصال اور غضب میں کوئی کمی آئی تھی۔ان بغاوتوں کی قیادت زمینداروں نے درج ذیل مقاصد کے ساتھ کی تھی۔

1. زمینداری کے علاقے میں توسیع
2. لوٹ مار
3. خود مختار ریاست کا قیام
4. زمینی محصول روکنا وغیرہ۔

مظفر عالم(Muzaffar Alam)کے مطابق شواہد کی بنیاد پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بغاوتیں ان علاقوں میں زیادہ ہوئیں جہاں کسان خوشحال تھے۔ورن اور ذات کی تغیر پذیری کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔اس وقت کا نظام ہی اپنی بنیادی شکل میں جاگیر دارانہ طرز تھا۔مناسب حالات میں بھی زمینی محصولات کی وصولی کے لیے نیم فوجی دستوں (militias)کی ضرورت پڑتی تھی۔بغاوت کے زمانے میں تو یہ وصولی بہت مشکل ہو جاتی تھی۔یہ بھی معروف حقیقت ہے کہ شیواجی اور سکھ دونوں ہی اپنے ہمسایوں کے ساتھ مسلسل جدوجہد میں مصروف رہے تھے۔وہ مغلوں کے ساتھ کسی بھی قسم کا سیاسی معاہدہ کیے جانے خلاف تھے۔مراٹھوں کے ذریعے وصول کی جانے والی رقم مغلوں سے کسی طور کم نہیں تھی۔یہی نہیں بلکہ مراٹھوں کے ماتحت علاقوں میں بھی کسانوں کی حالت بہتر نہیں تھی۔ستیش چندر کے مطابق زمین داروں کا متنازعہ کردار اہم تھا۔وہی مغلوں کے انتظامی امور میں آنے والی مشکلات کا باعث تھے۔لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغلوں کی طاقت کا زیادہ تر انحصار ان کے تعاون پر تھا۔اس طرح، زمیندار اور سماج کے درمیان ایک حد تک کشمکش کی صورتحال تھی جس کو کبھی حل نہیں کیا جاسکا۔نعمان احمد صدیقی (Noman Ahmad Siddiqi)بتاتے ہیں کہ آسامی کی طرف سے ٹیکس ادا نہ کرنے کی صورت میں بھی زمیندار کے ذریعے اسے زمین کی ملکیت سے نہیں نکالا جاتا تھا بلکہ دوسرے ذرائع سے وصولی کی جاتی تھی۔کاشتکار کے ذریعے اپنی زمین پر کاشت نہ کیے جانے کی صورتحال میں زمیندار کو اسے ایسا کرنے سے روکنے کا اختیار تھا۔وہ اسے قابل کاشت زمین پر کھیتی کرنے کے لیے مجبور کر سکتا تھا۔

خود کاشت زمیندار اکثر اپنے حصے کی مالگزاری کی طلب کو بھی عام کاشتکار کے اوپر ہی تھوپ دیتے تھے۔جیسے جیسے مرکزی اقتدار کا زوال ہوا اور جاگیروں پر دباؤ بڑھنے لگا، زمینداروں اور مرکزی طاقت کے درمیان مزاحمت کا احساس بھی ابھرنے لگا۔جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے،ذات پات، ورن یا مذہبی کشیدگی سے بھی سماجی توازن بگڑ سکتا تھا۔'جمع' کی رقم میں مصنوعی طور پر اضافہ کر کے ادائیگی کے دعوے بڑھائے گئے لیکن 'حاصل' کی مقدار وہی رہی۔اس لیے ماہانہ پیمانے کی جاگیروں کا نظام بنایا گیا۔اس نظام کے تحت جاگیر دار کے فوجی دستے کی تعداد کو جاگیر کی اصل آمدنی کے تناسب سے متعین کیا جاتا تھا۔یہ واضح ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا اثر مغلیہ سلطنت کی طاقت کے

زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جمع اور طبقہ امراء کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ تمام امیروں کی خواہشات کو پورا کرنا مشکل ہو گیا، جس کی وجہ سے مذہبی اور نسلی علاحدگی کے احساس میں اضافہ ہوا۔

جاگیر نہ دیے جاسکنے کی ایک وجہ خالصہ اراضی کے رقبے میں توسیع تھی۔ جہانگیر کے دور میں یہ کل رقبے کا نواں حصہ تھا جبکہ اورنگ زیب کے دور میں اس کی مقدار بڑھ کر پانچواں حصہ ہو گئی۔ پائے باقی (غیر کاشت شدہ زمین) کی کمی کے حوالے سے بہت کم ثبوت دستیاب ہیں۔ مسئلے کی جڑ یہ تھی کہ جاگیرداروں کو دی گئی جاگیر کا کچھ حصہ 'زور طلب' (طاقتور) زمینداروں کے علاقے میں پڑتا تھا۔ جاگیرداروں نے اکثر 'سیر حاصل' (زرخیز) علاقوں میں جاگیر حاصل کرنے کی کوشش کی کیونکہ سیر حاصل علاقے زیادہ تر دربار میں اثر و رسوخ رکھنے والے لوگوں کو ہی ملتے تھے۔

یہ بات پہلے ہی کہی جاچکی ہے کہ بغاوتوں کی بنیادی وجہ کسانوں کا عدم اطمینان نہیں تھا۔ کاشتکاری میں کمی اور اس حد تک استحصال کہ طویل مدت میں کسی قسم کے معاشی منافع کی کوئی گنجائش نہ رہے، جیسے حقائق کی تصدیق زمینی سطح پر کیے گئے مطالعات کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ اس وقت تبادلہ اتنی بھی جلدی نہیں ہو رہا تھا جتنا کہ اب تک کہا جاتا رہا ہے۔ ایک بار پھر اس کا کاشتکاری پر کوئی براہ راست اثر نہیں ہوا۔ ان تمام بغاوتوں کی قیادت زمینداروں کے ہاتھ میں تھی۔ کسان بغاوتوں کے رہنما کسان نہیں تھے۔ زمینداروں اور دیشمکھوں کی طاقت میں اضافہ اور جاگیرداروں کی لاچاری وغیرہ جیسے حقائق کا بھی ایک الگ نقطہ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان تمام حالات کا اثر یہ ہوا کہ مغل حکمراں، رعیت (عوام) کو تحفظ فراہم کرنے سے قاصر ہو گئے۔ اس کے علاوہ محصولات کی وصولی بھی ان کے لیے مشکل ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوجدار، زمیندار اور دیشمکھ سب نے متحد ہو کر کسانوں کو استحصال کرنا شروع کر دیا۔

مغل دکن میں بھی سماجی توازن برقرار نہ رکھ سکے جس کی وجہ سے رعیت ایک طرح سے تنہا اور بے بس ہو گئی۔ اس حقیقت کی تصدیق شمالی ہند کی تحریکوں سے بھی ہوتی ہے۔ اس مسئلے کے ساتھ ساتھ انتظامی مسئلہ بھی پیدا ہو گیا جو دراصل سماجی بحران کے ہی تعامل کا نتیجہ تھا۔ اس طرح یہ مسئلہ کاشتکاری میں کمی کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ یہ زرعی نظام کے ذریعے طے شدہ رشتوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ یہ تجارت کی توسیع اور نئی ٹیکنالوجی کو اپنانے سے ہی حل ہو سکتا تھا لیکن اس وقت کے سماجی نظام کے تحت ایسے نئے تجربات کی گنجائش بہت کم تھی۔ اس طرح عہد وسطی کے ہندوستان کے سماجی تعلقات میں مضمر مزاحمت سترھویں اٹھارویں صدی کے بحران کا بنیادی سبب تھی۔

12.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغل سلطنت کے زوال سے متعلق مختلف نظریات پائے جاتے ہیں جن میں سے کچھ شخصیت مرکوز ہیں جیسے الفنسٹون اور جادوناتھ سرکار جو کہ سلطنت کے زوال کے لیے اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو ذمے دار ٹھہراتے ہیں یا پھر جے۔ ایف رچرڈس جو اورنگزیب کی دکنی پالیسی کو سلطنت کے زوال کا سبب تسلیم کرتے ہیں۔ مارکسوادی مورخین نے پہلے پہل اہم شخصیات سے ہٹ سلطنت کے مجموعی ڈھانچے اور

عوام کے ساتھ اس کے تعلقات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ان کے مطابق سلطنت کا زوال صرف کسی ایک حکمراں کی پالیسیوں سے نہیں بلکہ سلطنت کے ذریعہ قائم کردہ سماجی اور سیاسی نظام کے ٹوٹ کر بکھرنے کی وجہ سے ہوا۔ مغلوں کے قیام اور استحکام میں ان کے منصب اور جاگیر نظام نے اہم کردار نبھایا، لیکن جیسے جیسے سلطنت میں کمزوری آتی گئی، جاگیروں میں ظلم اور استحصال بڑھتا گیا۔ جس سے کسانوں میں بدامنی اور احتجاج پیدا ہوا اور یہی عرفان حبیب کے مطابق کسان بغاوتوں میں تبدیل ہو گیا۔اسی کی بنیاد پر عرفان حبیب نے اپنی کتاب *The Agrarian System of Mughal India, 1556–1707* میں زرعی بحران کا مفروضہ قائم کیا ہے۔وہ ایک طبقاتی ساخت میں مغل سلطنت کی زوال کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ صرف طبقات کی شناخت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی بلکہ مغل سلطنت کو استحصالی طبقے کی حفاظت کرنے والا ہاتھ بتاتی ہے۔وہ مغل زمینی مال گزاری کی بنیادی نوعیت کو سامنے لاتے ہیں۔ مغلوں کے جاگیرداری نظام نے ان کے مطابق ایک نقدی جال کے فروغ دینے میں مدد کی اور شہروں پر مبنی پیشوں کو تحریک دی۔ حبیب، مغل سلطنت کے زیر تسلط اور اس کے ذریعے منظم سماج میں متعدد سماجی تضادات کی نشاندہی کرتے ہیں۔اس طرح وہ ایک طرف گاؤں کے سربراہ، ملکیت والے کاشتکار اور چھوٹے موٹے کام کرنے والے کامگاروں کے اور دوسری طرف طبقہ امراء کے درمیان اختلافات کو واضح کرتے ہیں۔وہ حکمراں طبقے کے اندرونی تضادات کو بھی باہر لاتے ہیں، جس میں ایک طرف زمیندار اور بچولیے زمیندار ہیں تو دوسری طرف امیروں کا طبقہ ہے۔وہ مقدموں اور عام کاشتکاروں ساتھ ہی عام کاشتکاروں بشمول مقدموں اور چھوٹے موٹے کام کرنے والوں کے درمیان اختلافات کو زیر غور لاتے ہیں۔ عرفان حبیب کے ذریعے پیش کردہ زرعی بحران کے نظریے کی بنیادی خصوصیات کچھ اس طرح ہیں۔ ضبطی نظام میں موجود طلب کی اونچی شرح جو تقریبا کل پیداوار کی نصف ہوا کرتی تھی۔ متوقع جمع اور حقیقی طور پر حاصل پیداوار کے درمیان بڑھتا ہوا فرق۔ جاگیروں کا تبادلہ جو کاشتکاروں پر دباؤ بناتا تھا اور زراعت کو تباہ کرتا تھا۔ کاشتکاروں کی تباہی اور جاگیر سے فرار، جو زمینداروں کو متاثر کرتا تھا کیونکہ وہ دیہی برادری کے ساتھ نزدیک سے منسلک تھے۔ زرعی بغاوتوں کا پھوٹ پڑنا جو کہ کسانوں کے بے اطمینانی کا مظاہرہ ہوتے تھے۔ اس طرح حبیب کے مطابق ان کسان احتجاجوں اور زرعی بحران نے سلطنت کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کو کمزور کر دیا۔دوسری طرف دیگر مورخین کا کہنا ہے کہ عرفان حبیب اپنے استدلال میں غیر ملکی سیاحوں کو سفرناموں کو بنیاد بناتے ہیں جو کہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ شہروں میں اضافے اور تجارت میں فروغ زراعتی ترقی کو ظاہر کرتا ہے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ زراعت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔نہ تو تمام زمیندار ایک جیسے تھے نہ ہی کاشتکار، ان میں ذاتی، نسلی اور خاندانی اختلافات موجود تھے جو انہیں متحدہ طور پر کسی کی مخالفت کے لیے آمادہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ مراٹھوں یا خود مختار راجاؤں کے علاقے میں زرعی پیداوار کی طلب مغلوں سے کسی طرح کم نہ تھی تو کسانوں کا فرار ہو کر ان کے علاقوں میں جانا یا زمینداروں کا ان سے مل جانا بعید از قیاس لگتا ہے۔ کسان بغاوتوں کی قیادت زمین دار کر رہے تھے تو یہ کسی طرح کسان بغاوتیں نہیں تھی، بلکہ منفرد زمینداروں کے ذریعے سلطنت سے اپنی بات منوانا تھا۔ وہ سلطنت کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کی مالگزاری کی طلب میں تناسب پیدا کرنا چاہتے تھے۔آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغل سلطنت کا زوال صرف ایک حکمراں خاندان کا زوال تھا، اس سے پورے ملک کی معیشت اور سماج پر اتنا اثر نہیں پڑا۔ پرانے شہروں کی جگہ نئے شہر آباد ہوئے، تجارت میں ترقی ہوئی اور خصوصا غیر ملکی تجارت میں اضافہ ہوا جس سے ہندوستان سترہویں صدی میں دنیا کی سب سے بڑی معیشت بن کر ابھرا۔

12.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

جمع یا جمع دامی	:	متوقعہ آمدنی 'جمع' یا 'جمع دامی' کے نام سے مشہور تھی جس کو 'دام' میں شمار کیا جاتا ہے۔
دام	:	ایک 'دام' ایک چھوٹا تانبے کا سکہ تھا جو چاندی کے روپیہ کے سائز کا تقریباً 40/1واں حصہ ہوتا تھا۔
سیر جہت	:	زمینی مالگزاری، بندرگاہی چنگیوں اور دیگر ٹیکسوں کو 'سیر جہت' کہا جاتا تھا، یہ بھی جمع میں شامل تھے۔
حاصل	:	اصل میں جمع ہونے والی رقم کو 'حاصل' کہا جاتا تھا۔
پائے باقی	:	'پائے باقی' ان علاقوں کو کہا جاتا تھا جن کی آمدنی منصب داروں کو مختص نہیں کی گئی تھی۔
سیر حاصل	:	ایسی زمینیں جو بہت زیادہ زرخیز ہوتی تھیں؟
زرعی فواضل	:	زرعی مالگزاری میں تمام اخراجات کے بعد بچ جانے والی رقم
زور طلب	:	باغی گاؤں یا وہ زمینیں جہاں زمینداروں کی مضبوط طاقت کی وجہ سے زمینی محصول کا حصول مشکل ہوتا تھا۔
انتظامی دستور العمل	:	(administrative manuals) انتظامی امور کے لیے تیار کیے جانے والے اصول وضوابط
خود کاشت	:	(*Khudkasht*) اپنی زمین پر خود کھیتی کرنے یا کروانے والا کسان یا چھوٹا زمیندار
متصدّیوں	:	(*Mutasaddis*)

12.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

12.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. زرعی بحران کا نظریہ کس نے پیش کیا؟
2. جاگیرداری بحران کا نظریہ کس نے سامنے رکھا؟
3. جمع یا جمع دامی کسے کہتے ہیں؟
4. دام، اس وقت کے ایک روپیہ کا کتنا حصہ ہوتا تھا؟
5. سیر جہت کسے کہا جاتا تھا؟
6. 'حاصل' سے کیا مراد ہے؟
7. پائے باقی کس زمین کو کہتے تھے؟
8. خود کاشت کسان کون تھے؟
9. پاہی کاشت کون تھے؟
10. زرعی فواضل سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1. زمینداروں کا کردار
2. جاگیرداری بحران
3. مغل سلطنت کی انتظامی کمزوری
4. بچولیوں کا کردار
5. زرعی بحران سے متعلق سوالات

12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. زرعی بحران کے نظریے کی تنقید پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. زرعی بحران کے نظریے کے حق میں دلائل پیش کیجیے۔
3. اس اکائی کے مطالعے کے بعد کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ زرعی بحران مغل سلطنت کے زوال کا ذمے دار تھا؟ تنقیدی تجزیہ کیجیے۔

12.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar. *The Crisis of Empire in Mughal North India*: *Awadh and the Punjab*, *1707–48*, Oxford University Press, Delhi, 2021.
2. Chandra, Satish, *Parties and, Politics at the Mughal Court*, *1707–1740*, Har Anand Publication, Delhi, 2017.
3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *Society, The Jagirdari Crisis and the Village*, MacMillan Delhi, 1981.
4. Habib, Irfan, *Agrarian System of Mughal India*, *1556–1707*, Oxford University Press, Delhi, 1990.
5. Moreland W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A Study in Indian Economic History*, Gyan Publishing House Publication, Delhi, 2021.
6. Moosvi, Shireen, *The Economy of the Mughal Empire, c.1595*: *A Statistical Study*, Oxford University Press, Delhi, 1990.
7. Nurul Hasan, Saiyid, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, Delhi, 1973.
8. Raychaudhuri, Tapan, and Irfan Habib, eds., *The Cambridge Economic History of India, c. 1200 – c. 1750*, Vol. I, Cambridge University Press, Delhi, 1982.
9. Siddiqi N.A., *Land Revenue Administration Under the Mughals, (1700–1750)*, Asia Pub. House, London, 1970.

اکائی 13۔ زرعی معیشت: مراٹھے، دکن اور کشمیر کی علاقائی ریاستیں

(Agrarian Economy: Regional States of the Marathas, Deccan and Kashmir)

اکائی کے اجزاء

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 مراٹھا اور دکن کی زرعی معیشت

13.2.1 گاؤں اور گاؤں کی برادری

13.2.2 وطندار

13.2.3 پاٹل

13.2.4 کُلکرنی

13.2.5 دیشمکھ اور دیش پانڈے

13.2.6 چَوگُلا

13.2.9 کاشتکار

13.2.8 سیٹھ اور مہاجَن

13.2.9 بالوتے دار

13.3 زراعت

13.3.1 زرعی پیداوار

13.3.2 آبپاشی

13.3.3 زمین کے اقسام اور سماجی درجہ بندی

13.3.4 میراثی زمین

13.3.5 اُپاری زمین

13.3.6 ریاستی زمین

13.3.7 انعام زمین
13.3.8 وطن زمین
13.3.9 موکاساور سرانجام جاگیر
13.4 نظام محصولات
13.4.1 محصولات میں ریاست کا حصہ
13.4.2 محصلول کی وصولی
13.4.3 چوتھ اور سردیشمکھی
13.5 کشمیر ریاست کی زرعی معیشت
13.5.1 کاشت کی حد
13.5.2 زمین کے اقسام اور آبپاشی
13.5.3 زرعی آلات
13.5.4 زرعی پیداور
13.5.5 سبزیاں اور پھل
13.5.6 نظام محصول
13.6 اکتسابی نتائج
13.7 کلیدی الفاظ
13.8 نمونہ امتحانی سوالات
13.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید (Introduction)

مغل دور کے علاقائی ریاستوں کی زرعی معیشت اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنا کہ مغلوں کی زرعی معیشت۔ دکن، مراٹھا اور کشمیر کی ریاستوں میں بھی مختلف مٹی، فصلیں، آبپاشی کے ذرائع، سماجی درجہ بندی اور نظام محصولات موجود تھے۔ اس اکائی میں تین سلطنتوں مراٹھا، دکن، اور کشمیر کی زرعی معیشت پر گفتگو کریں گے۔ چونکہ مراٹھوں کی زرعی معیشت کا نظام مشرقی دکن کے سلطنتوں کی طرح ہی تھی اس لئے

اس اکائی میں مراٹھااور دکن کی زرعی معیشت پر ایک ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مراٹھااور دکن کے علاقائی ریاستوں کے زرعی پیداور، گاؤں کی برادری، آبپاشی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مراٹھااور دکن ریاست کے زمینوں کے مختلف اقسام اوران کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔
- مراٹھااور دکن کے نظام محصولات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغل کشمیر کی زرعی معیشت، زرعی پیداوار، زرعی زمین کے رقبے کو سمجھ سکیں گے۔
- مغل کشمیر میں آبپاشی اور نظام محصولات کو بھی سمجھ سکیں گے۔

13.2 مراٹھااور دکن کی زرعی معیشت (Agrarian Economy of Maratha and Deccan)

مغربی دکن میں موجود مراٹھوں کے علاقائی ریاست کا زرعی معیشت کی ساخت تقریبا مشرقی دکن کی طرح ہی تھی، جس کی کچھ جھلکیاں سترہویں اور اٹھارویں صدیوں کے 'گاؤں کے برادریوں'(village communities) میں ملتی ہے، حالانکہ مغربی ساحل میں آباد کونکن کے علاقے کی زرعی معیشت کی ساخت کچھ مختلف تھی۔اسی طرح مراہٹوں کے نظام محصول اور مشرقی دکن میں رائج نظام میں یکسانیت تھی۔

13.2.1 گاؤں اور گاؤں کی برادری (Village and Village Community)

مغربی دکن میں گاؤں کو 'گاؤں'، 'موجے' یا 'دیہ' کہا جاتا تھا جو بالترتیب سنسکرت، عربی اور فارسی کے الفاظ 'گرام'، 'موضعہ' اور 'دیہ' سے ماخوذ ہیں۔ مآخذ میں یہ تینوں اصطلاحات ایک دوسرے کے متبادل استعمال ہوئے ہیں، لیکن رسمی طور پر ہر گاؤں کے اصل نام سے پہلے 'موجے' لفظ لگایا جاتا تھا۔ گاؤں کے مضافاتی علاقوں کو 'مَجرا'، 'وادی'، 'پادی' یا 'کھاری' وغیرہ جیسے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ 'گرام'، 'موجے'، 'دیہ'، 'کھیڑے' گاؤں کے لئے استعمال ہونے والے مترادف الفاظ تھے، لیکن مآخذ میں لفظ 'موجے' کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ دو ملحقہ گاؤں کی صورت میں بڑے گاؤں کو 'بُدرُک' اور چھوٹے کو 'کھرد' کہا جاتا تھا۔ مثلاً اگر گاؤں کا نام نیواسا ہے تو بڑے کو 'موجے نیواسا بُدرُک' اور چھوٹے کو 'موجے نیواسا کھرد' کہتے تھے۔ گاؤں کی آبادی کے بڑھنے اور اس کے ایک حصے کو ایک انتظامی اکائی کے طور پر تسلیم کرنے کے بعد بعض اوقات یہ عمل الٹ بھی جاتا تھا، یعنی اگر چھوٹے گاؤں کھرد کی آبادی بڑھ جاتی یا اسے ایک انتظامی اکائی تسلیم کر لیا جاتا تو اسے 'کھرد' ہی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ گاؤں کے مضافات میں آباد رہائشی علاقے کو مَجرا کہا جاتا تھا۔ یعنی عام گاؤں کی آبادی سے دور جو لوگ کھیتوں کو اپنا رہائش گاہ بنا لیتے تھے اسے مَجرا کہتے تھے۔ بعض اوقات ان مضافاتی علاقے کو کھیتوں یا جس جگہ یہ واقع ہوتے تھے اسی نام سے

جانے جاتے تھے۔ حالانکہ مجرے کے مترادف الفاظ 'وادی'، 'پادی'، اور 'کھاری' وغیرہ تھے۔ عام گاؤں کی اکائی سے اوپر بڑے گاؤں کی ایک دوسری اکائی بھی تھی جسے 'کَسبہ' (عربی لفظ "قصبہ" سے ماخوذ) کہا جاتا تھا۔ بازار کی موجودگی اس کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ یہاں کی آبادی زیادہ تر کاریگروں پر مشتمل تھی۔ یہاں ہفتہ وار بازار بھی لگائے جاتے تھے جس میں مضافات کے گاؤں کے لوگ شرکت کرتے تھے۔ اس طرح قصبے معاشی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں بازار بھی شامل تھا، جسے پیٹھ کہا جاتا تھا۔ آج بھی نہ صرف مغربی علاقوں میں اس طرح کے بازار یا پیٹھ لگتے ہیں بلکہ شمالی ہندوستان میں بھی رائج ہیں۔ گاؤں کی برادری میں موروثی آفسر جیسے وَطندار، پاٹِل، کُلکَرنی، دیشمکھ، دیشپانڈے، چَوگُلا، سیٹھ اور مہاجن کے علاوہ بلوطہ دار اور زراعت کار جسے مرِاندار، تھاکاری یا اُپاری شامل تھے۔ دیسک گاؤں کا وہ اعلی موروثی آفسر تھا جن کا زمین پر قبضہ ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست سے براہ راست مراعات بھی حاصل تھے۔ وہ گاؤں کے مستقل باشندے تھے اور مختلف انتظامی اور دیگر متفرق خدمات انجام دیتے تھے۔ ہم عصر دستاویز کی بنیاد پر، اے۔ آر۔ کُلکرنی کہتے ہیں کہ دیسک کی اصطلاح کا استعمال جامع معنوں میں ہونے کے ساتھ ساتھ محدود معنوں میں بھی ہوا ہے۔ جامع معنوں میں اس کا استعمال دیسائی یا دیس مکھ، دیسکُلکَرنی یا دیسپانڈے، پاٹِل، کُلکَرنی، شیٹھ اور مہاجن جیسے موروثی آفسروں کے لئے ہوا ہے، حالانکہ کبھی کبھی اسکا استعمال صرف اعلی موروثی افسران یعنی دیس مکھ، دیسپانڈے، پاٹل اور کُلکَرنی کے لئے ہوا ہے۔

13.2.2 وَطَندار (*Watandar*)

وَطَن عربی زبان کا لفظ ہے جس کا استعمال دکن سلطنت میں بھی کیا جاتا تھا۔ وَطن ایک ایسی عطیہ (گرانٹ) زمین تھی جو ریاست کی طرف سے کسی ایسے شخص کو دی جاتی تھی جو ایک مخصوص عہدہ پر فائز ہو۔ یہ عطیہ اس کے خاندان میں نظریاتی طور پر اس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک وہ خدمات انجام دیتے تھے، جبکہ عملی طور سے اس وقت تک دی جاتی تھی جب تک وہ ریاست کا وفادار رہتا تھا۔ وطندار کا خرچ گاؤں اٹھاتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی خدمات کے بدلے نقد یا قسم میں ادائیگی کرتے تھے۔ در حقیقت وطندار نے دیہی علاقوں سے اس معاوضے کا دعوی اپنے حق کے طور پر کیا کرتا تھا جسے دستاویز میں حق لاجمہ (حق لازمہ) کہا گیا ہے۔ گاؤں کا ایک مستقل عہدہ دار تھا اور ان کی خدمات گاؤں کے انتظامیہ کے لئے ضروری تھے سلطنت یا ریاست کی تبدیلی کا بھی اس کے عہدہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وطندار جو پہلے دکن کی حکمرانوں کی خدمت کرتے تھے، شیواجی کے دور میں اسے وہی مراعات حاصل تھے۔ محصولات کی وصولی اور زراعت کو فروغ دینے کے علاوہ وطندار متعدد فرائض انجام دیتا تھا، جیسے گاؤں کی کونسل گوتسبھا میں چھوٹے چھوٹے مقامی تنازعات کا فیصلہ کرنا، گاؤں کے تہواروں اور تقریبات کا انعقاد کرنا اور امن اور قانون برقرار رکھنا ان کے فرائض میں شامل تھے۔

13.2.3 پاٹِل (*Patil*)

پاٹل گاؤں کا سربراہ اور بڑا موروثی آفسر تھا۔ ہم عصر مآخذ میں اسے پاٹل، گاوپاٹل، موکدم (مقدم) یا موکدّم پاٹل (مقدم پاٹل) کہا گیا ہے۔ پاٹل کا دفتری نشان ہل تھا جو زمین سے متعلق اس کے فرائض کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا بنیادی فریضہ بیکار اور بنجر زمین کو زیر کاشت لانا اور

اسے قابل کاشت بنانا تھا۔ وہ زرعی محصول کے تعین سے متعلق ریاست کو کاشتکاروں کے معاملات کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست کو گاؤں کی زمین اور فصلوں کی آمدنی کے بارے میں تمام معلومات فراہم کرتا تھا۔ گاؤں کے محصول کو ادا کرنے کی زمہ داری پاٹل کی ہی تھی۔ محصول کی وصولی میں کمی ہونے پر اسے ہی نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس کے اس بڑی ذمہ داری کی وجہ سے ریاست اسے عطیہ کے طور پر زمین بھی دیتی تھی۔ وہ گاؤن کی کونسل کے اہم رکن بھی تھے اور اس کے دستخط کے بغیر گاؤں کا کوئی بھی عدالتی حکم نامہ مکمل نہیں ہوتا تھا۔ بظاہر تو پاٹل مرا ٹھا تھے لیکن کچھ برہمن پاٹل بھی تھے۔

13.2.4 کُلکَرنی (*Kulkarni*)

کُلکَرنی کو دستاویز میں گاؤ کُلکَرنی کہا گیا ہے۔ اسے گاؤں کا گرام لیکھی یا اکاونٹینٹ بھی کہا جاتا تھا۔ وہ انفرادی کاشتکاروں کی زمین اور ہر ایک سے واجب الادا زرعی محصول کا ریکارڈ رکھتا تھا۔ اس کے فرائض میں کاشتکاروں کو گاؤں کی طرف راغب کرنا اور زرعی پیداوار میں اضافہ کرنا شامل تھا۔

13.2.5 دیشمکھ اور دیش پانڈے (*Deshmukh or Deshpande*)

گاؤں کی کچھ زمین دیشمکھ کے پاس ہوتی تھے۔ وہ اپنے علاقے میں عام طور پر پاٹل کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ زمین کو زیر کاشت لانے کے لئے ریاست کو درخواست دینے کے ساتھ ساتھ کاشتکاروں کو زمین بھی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ دیشمکھ سال میں ایک بار گاؤں کے لوگوں کی صحیح حالات جاننے کے لیے دیہاتوں کا دورہ کرتا تھا۔ ریاست گاؤں کے لوگوں کے ساتھ دیشمکھ کے ذریعے ہی رابطہ رکھتی تھی۔ اس طرح بیرونی حملوں کے خطرے کی صورت میں ریاست اُسی پر منحصر تھی۔ اُس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ ایک قلعے کے ریاستی افسروں کی مالی اور فوجی مدد کرے۔ کبھی کبھی وہ پاٹل کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ دیشمکھ اپنا مہر اور سرکاری کاغذات بھی رکھنے کا حق رکھتا تھا۔ پاٹل سے برتر ہونے کی وجہ سے اسے گاؤں میں زیادہ سہولتیں ملتی تھیں۔ اسے زمین کے ساتھ ساتھ گاؤں کے کاریگروں اور سوداگروں سے خدمات لینے اور سامان وصول کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ وہ کچھ معاملات میں نقد ادائیگی حاصل کرنے کا بھی حقدار تھا۔ وہ گاؤں کے کاریگروں اور فن کاروں جیسے حجام، دھوبی، لوہار، بڑھئی، بُنکر، درزی وغیرہ سے مخصوص سالانا واجبات بھی وصول کرتا تھا۔ وہ سال میں ایک یا دو ماہ تک مہار کی خدمات مفت حاصل کرنے کا حق رکھتا تھا۔

گاؤں کی کچھ زمین دیش پانڈے کے پاس ہوتی تھی جو اپنے علاقے میں کُلکَرنی کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ دستاویزات میں دیش پانڈے کو دیش کلکرنی یا دیش لیکھک بھی کہا گیا ہے۔ متعدد گاؤں کے ریکارڈ کو رکھنا ان کے اہم ذمہ داری تھی۔ اس کے خدمات کے عوض گرانٹ میں زمین بھی ملتی تھے۔ دیش پانڈے کے حقوق اور مراعات میں دیہاتوں سے نقد ادائیگی اور دوسرے قسم کی ادائیگیاں شامل تھیں۔ وہ ہر گاؤں سے پندرہ دنوں تک مہار کی مفت خدمات کا حق رکھتا تھا۔ اسے جب بھی ضرورت پڑتی حجام، بڑھئی کی خدمات لے سکتا تھا۔ حقیقت میں دیشمکھ اور دیش پانڈے کا تعلق گاؤں کی برادریوں سے نہیں تھا، لیکن چونکہ گاؤں میں انکی زمین ہوتی تھی اس لئے ان کے مفادات گاؤں سے جڑے

ہوئے تھے۔

13.2.6 چَوگُلا (*Chaukula*)

گاؤں کی برادری میں چَوگُلا ایک اہم شخص تھا جو گاؤں کے انتظامیہ کے کاموں میں پاٹل کی مدد کرتا تھا۔ وہ قاصد کے طور اور زرعی محصول کی وصولی میں پاٹل کی مدد کرتا تھا۔ اس کے علاوہ جو کاشتکار کھیت چھوڑ کر چلے جاتے ان کو گاؤں میں واپس لانے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ اس کے فرائض بھی پاٹل کی طرح گاؤں کی زمین سے منسلک تھے۔ گوتسبھا میں ان کا مقام پاٹل کے بعد تھا۔ ایک جگہ ان کا نشان لاٹھی دکھایا گیا ہے زمین کی پیائش میں ان کے کام کے طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ موصول محصولات کو اپنے گاؤں سے صدر دفتر تک پہونچاتا تھا۔ وہ گاؤں کے دفتر کے گودام اور دیہات کے ذاتی ذخیرے کی حفاظت بھی کرتا تھا۔

13.2.7 کاشتکار (The Peasant)

گاؤں کی زیادہ تر زمین کاشتکاروں جسے میراثدار یا تھلکاری اور اُپاری کہا جاتا تھا، کے کے پاس تھی میراثدار کُنبی وہ تھے جن کے پاس زمین پر مستقل مالکانہ حق تھا۔ انہیں گاؤں میں آباد ہونے کا حق حاصل تھا اور اس لئے وہ گاؤں کے برادریوں کے تمام مراعات سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ اپنی زمینوں پر خود کھیتی کرتے تھے۔ اُپاری گاؤں کے لئے اجنبی تھے۔ ان کے بارے میں تاریخی دستاویزات میں بہت کم ذکر ہوا ہے۔ اے۔ آر۔ کُلکرنی کہتے ہیں کہ اپاری کا گاؤں کے کونسل کے کاروبار سے زیادہ رابطہ نہیں تھا۔ کیونکہ دستاویزات میں میراثدار کاشتکار کو میراثدار کُنبی کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

13.2.8 سیٹھ اور مہاجَن (*Seth* and *Mahajan*)

سیٹھ اور مہاجن موروثی اہلکار تھے جو گاؤں میں پیٹھ یا بازار کے مالک تھے۔ چونکہ پیٹھ قائم کرنے کی ذمہ داری ان دو لوگوں کی تھی اس لئے انہیں کچھ حقوق اور مراعات بھی حاصل تھے۔ پیٹھ کی تنظیم گاؤں کی طرح ہی تھی۔ مہاجن سیٹھ کا اکاؤنٹینٹ تھا۔ یہ دونوں پیٹھ کے ممبران سے نقد اور قسم دونوں میں ادائیگی وصول کرتے تھے۔ یہ لوگ گاؤں کے کونسل کے مباحثوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔

13.2.9 بلوطہ دار (*Balutadar*)

گاؤں اور پرگنہ کے افسران جن کی گاؤں میں زمین ہوتی اور ریاست کے نمائندے ہوتے تھے کے علاوہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو گاؤں کے لوگوں کے لئے قیمتی خدمات انجام دیتے تھے۔ انہیں لوگوں کو 'بلوطہ دار' کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ گاؤں کے ہر کسان سے اناج کے مقررہ حصے کے لیے مخصوص فرائض انجام دیتے تھے۔۔ کسان گاؤں کے کاریگروں کو سالانہ فصل کی کٹائی کے وقت ادائیگی کرتا تھا۔ لفظ 'بلوتا' کا معنی سال بھر میں فراہم کی جانے والی خدمات ہے۔ اس میں اناج کا ایک حصہ جو گاؤں کے کاریگروں اور پیشہ ور ملازمین کو ان کی دیکھ بھال کے لئے تفویض کیا جاتا تھا۔ بہت سے مہجرے جیسے دستاویز میں بلوتے دار کے نام ذکر کئے گئے ہیں۔ بعض دستاویزات میں ان کی تعداد بارہ بتائی گئی

ہے لیکن در حقیقت انکی تعداد کم یا زیادہ بھی ملتی ہے۔ بلوطہ داروں کو تقریبا تین حصوں مین تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1. گاؤں کے کاریگر اور پیشہ ور: اس میں کمہار، لوہار، حجام، دھوبی اور جوتا ساز شامل تھے۔ انہیں کاشتکاروں کی خدمات کے بدلے سالانہ اناج کا کچھ حصہ دیا جاتا تھا۔
2. عام خدمت گزار: اس طبقے میں مہار، تَرال، مانگا، راموشی اس میں شامل تھے۔ یہ لوگ بنیادی طور پر معمولی قسم کے کام انجام دیتے تھے۔ مہار کو گاؤں کی آنکھ کہا جاتا تھا۔ تَرال گاؤں کے انتظامیہ کا قاصد تھا۔ مانگا اور راموشی چوکیدار کے طور پر کام کرتے تھے اور چوری اور دیگر جرائم کا سراغ لگاتے تھے۔
3. مذہبی خادم: جوشی، برہمن، پجاری اور نجومی، گورَو، ٹھاکُر، کولی، جنگَم اور مُلان مذہبی خادم میں شامل تھے۔ یہ لوگ بنیادی طور پر معاشرے کے مذہبی اور سماجی تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ جوشی گاؤں والوں کے لئے پجاری کا کام کرتے تھے۔ گورَو اور کولی گاؤں کے مندروں کے پجاری تھے۔ ٹھاکر شودروں کے کچھ طبقات میں پجاری تھے۔ جنگَم لِنگایت کے پجاری تھے۔ مُلان مسجد اور تدفین کے کام کرتے تھے۔ اپنے برادری کے لیے ملان قصاب کا کام بھی کرتے تھے۔

بلوطہ دار گاؤں کی کونسل کے اجلاس میں شرکت کرتے تھے، اور کونسل کے فیصلے پر اپنے دستخط یا انگوٹھے کا نشان لگا کر اپنی منظوری دیتے تھے۔ ہر بلوطہ دار کی اپنی نشانی ہوتی تھی۔ مثلاً کُمہار کا پہیہ، حجام کا آئینہ، بڑھئی کا چھینی، جوتا بنانے والے کا دھاگہ اور سوجا، دھوبی کا دھاگہ، گورو کا عود دان، سونار کا ہتھوڑا اور مولانا کی چھڑی کے نشان ہوتے تھے۔ ان بلوطہ داروں کے علاوہ کئی کئی دوسرے کاریگروں اور پیشہ ور افراد گاؤں میں رہتے تھے جیسے تیلی، تامبے کے سامان بنانے والے، مصور (پینٹر)، دھاتوں کے سامان بنانے والے، دَھنگَر (چرواہے)، ٹمبولی، پان بیچنے والے، بُنکر وغیرہ کے نام مآخذ میں ملتے ہیں۔ ان پیشہ وروں کے نام بلوطہ داروں کے ضمن میں نہیں کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ان کی خدمات زیادہ اہم نہیں تھے۔ حالانکہ گاؤں کی کونسل میں ان کے کچھ معاملات کے فیصلے کے حوالے سے ان کی موجودگی کو دکھایا گیا ہے۔ انہیں کبھی کبھی لوتا بھی کہا جاتا تھا۔ گاؤں کی یہ تصویر اور برادری شیواجی کے وقت کے دور میں بھی موجود تھی۔ انہوں نے مختلف وجوہات کی بنا پر اس میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیواجی سماجی تبدیلی کے مقابلے سیاسی تبدیلی میں دلچسپی رکھتے تھے، جو بغیر سماجی حمایت کے ممکن نہیں تھی۔

13.3 زراعت (Agriculture)

گاؤں کے رہائشی علاقے کو پنڈھاری کہا جاتا تھا۔ یہ زمین کاشت کے لئے موزوں نہیں تھی۔ کاشت کے لیے جو موزوں زمین تھی اسے 'کالی' کہتے تھے جو گاؤں سے باہر ہوتی تھی۔ یہ لوگ دراصل سفید مٹی والی زمین پر آباد ہوتے اور دکن میں پائی جانے والی کالی مٹی جو زراعت کے لئے کافی موزوں تھی بڑے پیمانے پر توسیع کرتے۔ اس کے علاوہ پورے گاؤں کا ایک گھاس کا میدان ہوتا تھا جسے 'کُران' یا 'گائران' (گائے کے لئے بنجر زمین) کہتے تھے۔ گاؤں کے عام استعمال کے لئے گھاس کے میدان کو 'لوکاسا کُران' کہا جاتا تھا۔ جبکہ ریاست کے

ذریعے استعمال ہونے والے گھاس کے میندان کو سرکار کا کُران کہتے تھے۔ زرعی زمین کالی کو بیس سے چالیس بلاکوں میں تقسیم کیا گیا تھا جسے تَھل یا استَھل کہا جاتا تھا۔ ہر بلاک کا اس کے اصل مالک کے نام کے اعتبار سے ایک نام دیا جاتا تھا۔ ہر ایک بلاک قطعات پر مشتمل تھا جسے سیٹ (زمین) کہا جاتا تھا۔ کالی زمین مزید عام ملکیتی زمین (میراث زمین)، عطیہ کے طور پر دی گئی زمین (انعام زمین)، ریاستی زمین، اور بنجر زمین منقسم تھی۔ سفید اور کالی زمین کے علاوہ مراٹھا سلطنت میں مٹی کے رنگ کے اعتبار سے اور بھی زمینیں جیسے سرخی مائل، ہلکی کالی مٹی اور بھورے مٹی، کھارپَت (نمکین زمین) تھیں۔ کھیتی کے لیے کالی مٹی سب سے زیادہ موزوں تھی۔

13.3.1 زرعی پیداوار (Agricultural Production)

مختلف زرعی پیداوار کو اناج، دالیں، تیل کی بیج، نقدی فصلیں، اور متفرقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مغربی دکن اور مراٹھا ریاست کی اہم فصلیں جوار، باجرا اور کپاس تھیں۔ اناج مین جوار، باجرا، نگلی، ساوا وغیرہ بڑی مقدار میں اُگائے جاتے تھے۔ کچھ علاقوں میں دھان کی پیداوار تھی حالانکہ گیہوں کاشت کی جانے والی دوسری اہم فصل تھی۔ چنا، تور، موگ، مٹر اور پھلیاں مراٹھا ریاست میں اُگائی جانے والی دالیں تھیں۔ تیل کے بیجوں میں اَلسی، نگار، مونگ پھلی اور کُسُمب وغیرہ شامل تھے۔ اس علاقے کے نقدی فصلیں گنّا، تمباکو اور کپاس تھیں۔ مرچ خاص طور سے اسی علاقے میں اُگائی جاتی تھی۔ عام طور سے بارش کے موسم میں ایک ہی فصل لگائی جاتی تھی، لیکن جہاں آبپاشی کی سہولت موجود تھی، وہاں ایک سے زائد فصلوں کی کاشت کی جاتی تھی۔ پہلے کو خریف اور دوسرے کو ربیع کہا گیا ہے۔ خریف برسات کے موسم کی فصل تھی جسمیں جوار، باجرہ، مختلف قسم کی دالیں اور موٹے اناج کی کاشت کی جاتی تھی ربیع موسم سرما کی فصل تھی جو برسات کے اختتام کے بعد بوئی جاتی اور موسم بہار میں کاٹی جاتی تھی۔ اس میں بنیادی طور پر نقد فصلیں شامل تھیں۔

13.3.2 آبپاشی (Irrigation)

آبپاشی کے لئے زیادہ تر زمینیں بارش کے پانی پر منحصر تھیں۔ اس طرح کی زمینوں کو جِرایَت کہا جاتا تھا، کیونکہ کاشتکار اکثر بارش کی کمی کی شکایت کرتے اور محصول میں رعایت کا مطالبہ کرتے تھے۔ مصنوعی طریقوں سے آبپاشی عام تھی۔ ایسی زمینوں کو پاٹستھل کہا جاتا تھا۔ عام طور پر گاؤں کے لوگ بارش کا پانی ڈیم میں جمع کرتے، جس کا مطلب یہ تھا کہ نہر کے ذریعے آبپاشی کے لیے اچھی بارش ضروری تھی۔ در اصل آبپاشی کا یہ طریقہ موسم سرما میں کاشتکاروں کو مدد نہیں کر پاتا تھا، کیونکہ ندیاں اور زیادہ تر نہر اس موسم میں خشک ہو جاتے تھے۔ کنویں کے ذریعے بھی آبپاشی کا رواج تھا اور ایسی زمینوں کو موٹستھل اور سیراب شدہ زمین کو باگائیٹ کہا جاتا تھا۔ کنویں کے ذریعے فراہم کیا جانے والا پانی ہمیشہ محدود ہوتا تھا۔ کنواں کھودنا یا کھودے گئے کنوئیں سے زیادہ پانی حاصل کرنا ہمیشہ ممکن نہیں تھا۔ جبکہ نہروں کی کھدائی اور ان کی دیکھ بھال وغیرہ اس علاقے کے لوگوں کی ذمہ داری تھی۔ دریا یا ندی کا پانی نہر کی سرحد پر موجود مختلف زمینوں کو پاٹس نامی نالیوں کے ذریعے نہر نکالا جاتا تھا۔

13.3.3 زمین کے اقسام اور سماجی درجہ بندی (Types of Land and Social Hierarchy)

زمین کے حقوق دراصل وہ بنیادی حقوق تھے جن کی بنیاد پر گاؤں کے مختلف طبقات کو مراعات حاصل تھے۔ زمین ہی گاؤں میں مختلف طبقات کے مابین تعلقات کی وضاحت کرتی ہے۔ مغربی دکن اور مراٹھا ریاست میں چھ قسم کی زمینیں تھی جن سے گاؤں کے لوگوں کے حقوق وابستہ تھے۔

13.3.4 میراثی زمین (*Mirasi* Land)

میراثی کے معنی پیشگی یا مورثی جائداد کے ہیں۔ اس لیے میراث کی زمینوں پر ایک میراندار کا حق تھا۔ دراصل میراندار اور ان کے رشتہ دار گاؤں کے اصلی باشندے تھے۔ ریاست بھی میراثی کے حقوق کی خلاف ورزی نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اگر میراندار گاؤں چھوڑ کر ایک طویل وقفے کے بعد واپس آتے تو وہ اور ان کی اولاد حکومت کو معاوضہ ادا کر کے زمین پر دوبارہ دعوی کر سکتے تھے۔ ان کے نام گاؤں کے دستاویز سے نہیں ہٹائے جاتے تھے کیونکہ روایت کے مطابق زمین پر انہیں لوگوں کے حق تھے جنہوں نے پہلے قبضہ کر کے زیر کاشت لایا ہو۔ میراندار کاشتکار کُنبی ذات سے تعلق رکھتا تھا اور گاؤں کا مستقل باشندہ تھا۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ ریاست کو محصول بھی ادا کرتا تھا۔ وہ اپنی زمین بیچنے کا بھی حق رکھتا تھا، اگرچہ یہ عام رواج نہیں تھا۔ اٹھارویں صدی میں یہ رواج تھا کہ گاؤں کے سربراہ اپنے گاؤں کی بنجر زمین کو میراث کی زمین کے طور پر مختص کر سکتا تھا اور گاؤں کی اسمبلی ان بنجر زمینوں کو میراث زمین کے طور پر رضامند کاشتکار کو فروخت یا عطیہ کر سکتی تھے۔

13.3.5 اُپاری زمین (Upari Land)

ریاست کی طرف سے جو زمین اُپاری کاشتکاروں کو دی جاتی تھی اسے اُپاری زمین کہتے تھے۔ اُپاری کاشتکار دراصل گاؤں کے عارضی باشندے تھے۔ وہ عام طور سے قحط یا جنگ یا دیگر آفات کی وجہ سے مجبوری میں اپنے آبائی گاؤں سے ہجرت کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو میراثی اور انعام کی زمینوں کو کرایہ پر دے دی جاتی تھی۔ اس طرح زمین پر اُپاری کا حق عارضی تھا۔ وہ لوگ پٹّے پر بھی زمین لیتے تھے۔ حالانکہ اُپاری کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ریاست کو باقاعدہ نذرانہ ادا کر کے میراندار یا گاؤں کا مستقل باشندہ بن سکے۔ سترہویں صدی میں اُپاری کاشتکاروں کی تعداد کم تھی لیکن اٹھارویں صدی میں پیشواؤں کی زرعی پالیسی کی وجہ سے ان کی آبادی میں کافی اضافہ ہوا، کیونکہ کاشتکاری کی توسیع کے لیے کاشتکاروں کی ضرورت تھی۔ اس لئے بہت سے اُپاری کاشتکار دوسرے گاؤں سے آکر آباد ہوئے اور اس شرط پر مراعات حاصل کئے کہ وہ زمین کو زیر کاشت لائے گا۔ انہیں گاؤں کے سرحد پر اپنے گھر بنانے کی اجازت بھی دی گئی۔ اس کے نتیجہ کاشتکاروں کے متعدد گروہ اٹھارویں صدی میں مراٹھا علاقے میں آباد ہو گئے۔

13.3.6 ریاستی زمین (State Lands)

ریاستی زمین کو سرکار چی شیری، شیر یچین، خالصہ زمین کہا جاتا تھا۔ اس طرح کی زمین پورے دکن اور مراٹھا ریاست کے مختلف گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ ریاستی زمین انعام میں، یا گھر بنانے یا پھر کاشتکاری کے لئے دی جاتی تھی۔

13.3.7 انعام زمین (*Inam* Land)

انعام ایک عربی لفظ ہے جس کا معنی تحفہ یا عطیہ کے ہیں۔ یہ گاؤں کے لیے مذہبی، انتظامی اور سماجی خدمات کے بدلے دی جاتی تھی۔ انعام ریاست اور ایک افراد کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعے دی جاتی تھی جسے 'انعام پتر' یا قرار کہا جاتا تھا۔ انعام کی زمینیں موروثی بنیادوں پر کسی فرد یا مخصوص ادارے کے پاس ہوتی تھی۔ دیشمکھ، دیش پانڈے، پاٹل، کُلکَرنی، چوکیدار، نجومی، جوشی اور دیگر لوگوں کے پاس انعام کی زمیں تھیں۔ دودھ بھات ساڑی چولی جو راجا کے ذریعے کسی سردار کو اپنی بیٹی کی کفالت کے لیے دی جانے والی چیز بھی انعام میں شامل تھی۔ وِرتّی بھی ایک مذہبی انعام تھا جو کسی پجاری کو دیا جاتا تھا۔ مشرقی دکن میں مندر کے دیوتا کو عطیہ کی گئی زمین کو 'دیوراوِرتّی' یا 'دیوتا کا عطیہ' کہا جاتا تھا۔ اس اصطلاح کو ان زمینوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا جن پر ان کے مالکانہ حق تھا۔

13.3.8 وطن زمین (*Watan* Lands)

گاؤں کے آفسر جیسے دیشمکھ، دیش پانڈے، پاٹل، کُلکَرنی اور بلوطہ داروں میں سے مہار برادری بڑے بڑے میراث اور انعام زمینوں پر فائز تھے اور انہیں کچھ مراعات اور حقوق حاصل تھے جسے حق لازمہ کہا جاتا تھا۔ انہیں زرعی پیداوار کی ایک خاص مقدار اور گاؤں کے کاریگروں کی خدمات بھی حاصل تھی۔ یہ تمام مراعات وطن کہلاتی تھی۔ وطن لینے والے کو وطندار کہا جاتا تھا۔ وطن کی قدر کی جاتی تھی کیونکہ یہ ایک آمدنی کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی وقار کی علامت بھی تھی۔ سرانجام، موکاسا یہ ایک عارضی زمین تھی اس کے لینے والے کا حق زمین پر عارضی ہوتا تھا۔ یہ جن لوگوں کو بھی دیا جاتا ان کی ہمیشہ کوشش یہ رہتی تھی کہ ان زمینوں کو وطن یا انعام میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ ان کے خاندان کے پاس ہمیشہ رہ سکے۔

13.3.9 موکاسا/سرانجام جاگیر (Mokasa/Saranjam Jagir)

یہ فوجیوں کو دی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ اصولی طور پر عارضی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ موروثی ہوگئی۔ یہ جاگیریں سترہویں صدی کے عادل شاہی سلطنت میں عام تھیں۔ یہ عادل شاہی سلطنت کے شاہی انتظامیہ کے طاقتور رکن تھے۔ اس طرح کی زمینیں وزیر، امیر اور دیوان کے عہدے پر فائز لوگوں کو دی جاتی تھیں۔ جب وہ اپنے فرائض انجام دینے میں ناکام ہوتے تو ان کا تبادلہ کر دیا جاتا اور بعض مرتبہ تو ان کے موکاسا کو ضبط کر لیا جاتا۔ وطنداروں اور میراثداروں کی طرح وہ گاؤں کی کونسلوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔

13.4 نظام محصولات (Revenue System)

مغل دور کے دکن میں زرعی محصولات کے نظام میں اہم تبدیلی بادشاہ اورنگزیب کے زمانے میں ہوئی۔ بادشاہ نے برار اور بالاگھاٹ کے دیوان مرشد قلی خان کو اس کی ذمہ داری دی تھی۔ اس طرح زرعی محصولات کی تشخیص لئے ضبطی طریقہ کار کو مغلوں نے دکن میں متعارف کیا۔ مرشد قلی خان نے زمین کی پیمائش کے لئے دکن کے قابل اعتماد امینوں کو مقرر کیا۔ انہوں نے انفرادی رقبہ کی تفصیلی دستاویز تیار کرائے اور قابل کاشت زمین کو پتھریلی اور پہاڑی زمینوں، ندیوں، جھیلوں وغیرہ سے الگ کیا۔ زمین کی تشخیص کے بعد انہوں نے تین

شرحوں کی بنیاد پر فصل کی تقسیم (crop sharing) کا طریقہ کار کی ابتدا کی۔ بارش کے پانی پر منحصر فصلوں کی پیداوار پر پیداوار کا دوسرا حصہ محصول کے طور پر طے کیا، جبکہ جس زمین کی آبپاشی کنوؤں اور نہروں کے ذریعے کی جاتی تھی اس صورت میں غلہ کے فصلوں پر تیسرا حصہ ،اور نقد فصلوں کی پیداوار پر نواں سے ایک چوتھائی حصہ محصول کے طور پر طے کیا۔ تشخیص کی اوسط شرح پیداوار کا چوتھائی حصہ کے برابر تھا۔ مرشد قلی خان نے شمال کے ضبطی طریقہ کار کی طرح ہی یہاں بھی محصول کی شرحوں تخمینہ کیا۔ 1689 اور 1690 میں دکن پر مغلوں کے قبضے کے بعد حیدر آباد کے دیوان محمد شفیع نے ایک سروے کیا اور محصول کو نئے سرے سے طے کیا۔ زرعی محصول کے تعین سے متعلق تمام دستاویزات پر زمینداروں کے دستخط کئے جاتے تھے کہ کاشکار دیش مکھ اور دیش پانڈے کی موجودگی میں طے شدہ رقم ادا کرنے پر راضی ہیں۔ محمد شفیع نے علاقے کے مقامی آفسر سے رابطے قائم کرنے کی کوشش کی۔ تلنگانہ میں اس نے ان کے عہدے اور مراعات کو تسلیم کیا اور ان کے سالانہ تنخواہ کی ادائیگی پر انہیں سندوں (ایک دستاویز جو سرکاری مہر سے اجرتوں اور تنخواہ کی تصدیق کرتی ہے) سے نوازا۔ موجودہ تنخواہ کو طے شدہ رقم سے ساڑھے سات گنا بڑھادیا۔ حیدر آباد میں ۱۳ فیصد کا اضافہ ہوا۔ جبکہ تلنگانہ میں یہ ۱۰ فیصد تھا۔ ساحلی علاقے میں یہ اضافہ بیس فیصد تھا۔

شمالی ہندوستان کی طرح ہی مغل آفسر کو دکن میں چودھری اور قانون گو کے طور پر مقرر کیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا مغلوں نے اسی طرز پر وہاں دوسرے آفسر کو بھی تعینات کئے تھے۔ جان۔ ایف۔ ریچرڈ کا کہنا ہے کہ تلنگانہ کے علاقے میں مغلوں کو اب بھی کافی حد تک ریڈّی، وَلاما، کملا دیش مکھ اور کچھ حد تک برہمن دیش پانڈے پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی ساحلی آندھرا کے چھے ضلعوں میں صورتحال کچھ بہتر تھی اور مقامی دیشمکھوں کے ساتھ رابطہ زیادہ براہ راست تھا۔ ساحلی علاقوں میں تعینات امین اور فوجدار سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے تھے۔ حیدر آباد میں قانونگو کو صوبائی دستاویزات کے محافظ کے طور پر تقرر کیا گیا۔ احمد نگر کے نظام شاہی سلطنت کے وزیر اعظم، ملک عنبر نے دکن میں زمینی آبادکاری میں اس حد تک انقلاب برپا کیا کہ اس نے دکن مین تمام زمینی اصلاحات کی بنیاد رکھی۔ اُسی کے نظام کو دکن کے تمام سلطنتوں، بیجاپور، گولکنڈا، احمد نگر اور مراٹھوں نے کچھ تبدیلی کے ساتھ اپنایا۔

ملک عنبر کے وقت محصول کی تشخیص اصل کاشت کے رقبے اور پیدا ہونے والی فصل کی نقد قیمت کے تخمینہ پر مبنی تھی۔ لیکن اس نے زمین کے جائزہ (سروے) کا حکم نہیں دیا تھا اور تشخیص اصل پیمائش کے بجائے مشاہدے سے کی گئی تھی۔ تشخیص گاؤں کے موروثی افسر دیش مکھ اور پاٹل کی مدد سے کی گئی تھی۔ لیکن شیواجی نے زمین کی پیائش پر سب سے زیادہ توجہ دی تھی۔ رسی کے ذریعے کی جانے والی پیائش کی غلطی کو دیکھ کر شیواجی نے اس کی جگہ کاٹھی (پیائش کرنے والی لاٹھی) سے پیائش کرائی۔ بیس کاٹھی ایک بیگھا اور ایک سو بیس بیگھا ایک چاور ہوتا تھا۔ لیکن بیگھے کے مقدار میں مقامی تبدیلی کے شواہد بھی موجود تھے۔ ۱۶۷۸ میں انّاجی دَتّو کو منظم طریقے سے تشخیص کا کام دیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کام کے لیے پرگنہ اور گاؤں کے اہلکاروں کی مدد بھی لی تھی۔ لیکن انہیں اہلکاروں پر مکمل بھروسہ نہیں تھا۔ ان اہلکاروں کے جائزے کا مقابلہ کرنے اور تحقیق کرنے کے لئے انہوں نے خود ایک تپا کے اندر ایک پہاڑی، ایک دلدلی اور ایک کالی مٹی کے علاقے میں جاکر اندازہ لگایا۔ بہت سے معاملات میں انہوں نے مقامی عہدہ داروں کے جائزوں میں پچیس سے سو فیصد اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ دیہاتوں سے

بھی ان کی ملکیت کا اندازہ لگانے سے متعلق مشورہ کیا۔

ملک عنبر نے زمین کو وسیع طور پر دو زمروں باغات (باغوں والی زمین) اور زراعت میں تقسیم کیا تھا۔ زرعی زمین کو مزید چار زمروں میں تقسیم کیا گیا۔ شیواجی کے زمانے میں یہ تعداد بڑھ کر بارہ ہو گیا تھا۔ بیکار زمین کو عموماً تشخیص سے خارج کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب زمین پر زیادہ دباؤ بڑھ گیا تو زیادہ سے زیادہ قابل کاشت بنجر زمین کو زیر کاشت لانے کی کوشش کی گئی۔ ملک عنبر نے دوبارہ حاصل کی گئی زمینوں کی تشخیص کے لیے ترقی پسند تشخیص کا طریقہ اپنایا۔ نظام شاہی سلطنت میں جب اس طرح کی زمین دوبارہ حاصل کی گئی تو پہلے دو سالوں تک کوئی محصول نہیں لگایا لیکن تیسرے سال سے پیداوار پر ریاست کا چھوٹا حصہ محصول کے طور پر طے کیا گیا۔ جبکہ آٹھویں سال میں پوری شرح پر محصول کا دعوی کیا گیا۔ حالانکہ مراٹھوں کے تحت زرعی محصول پہلے ہی سال سے نافذ کیا گیا تھا، اور ہر سال اس کی شرح بڑھایا جاتا تھا۔ اور آخر میں آٹھویں سال تک اس کے مکمل شرح کا اندازہ لگایا جاتا۔ مراٹھوں کے دور میں، بعض اوقات ان زمینوں کا اندازہ بیگھہ کے بجائے ہل کی تعداد سے بھی لگایا جاتا تھا۔ کبھی کبھی آمدنی کے مقصد کے لئے چھے یا سات بیگھہ کو بھی ایک بیگھہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ زمین کی زرخیزی کی بنیاد پر آمدنی کا اندازہ بھی مختلف ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بوئی گئی فصلوں جیسے گنے، دالیں، کپاس وغیرہ کی نوعیت کی بنیاد پر مختلف شرحوں پر اس کا اندازہ لگایا جاتا۔ زمین کی زرخیزی اور پیداوار کے تخمینہ کے مطابق مانگ ایک بار مقرر کی جاتی۔ انفرادی کاشتکاروں پر الگ الگ تشخیص کی جاتی تھی لیکن وصولی کے مقصد سے پورے گاؤں کو ایک اکائی سمجھا جاتا تھا۔

13.4.1 محصول میں ریاست کا حصہ (State's Share in Revenue)

ملک عنبر نے پیداوار کا پانچواں حصّہ ریاست کے محصول کے طور پر دعوی کیا جو نقد میں تبدیل کرنے پر فصل کی کل قیمت کا تیسرا حصہ کے برابر تھا۔ اسی رقم کا دعوی مراٹھوں نے بھی کیا تھا۔ لیکن جب شیواجی نے دیگر ٹیکس کو ختم کیا تو ریاست نے مجموعی حصہ کے 40 فیصد بطور محصول دعوی کیا۔ کچھ مراٹھا علاقے جیسے پَومال اور روہید کھور میں بٹائی تشخیص کی مروجہ شکل تھی۔ یہاں ریاست کا دعوی پیداوار کا ۵۰ فیصد تھا۔ کمتر معیار کی زمین کی تشخیص کے نظام کو بھی اپنایا گیا۔ مشاہدے کے ذریعے تشخیص کے نظام کو بھی اپنایا گیا۔ گولکنڈا اور بیجاپور کی سلطنتوں میں محصول پیداوار کا نصف تھی جو کافی زیادہ تھی۔ محصول کی وصولی عام طور پر نقد اور قسم دونوں میں کی جاتی تھی۔ باغات پر محصول ہمیشہ نقد میں عائد کی جاتی تھی۔ گولکنڈہ میں محصول عام طور پر نقدی میں جمع کیا جاتا تھا۔

13.4.2 محصول کی وصولی (Revenue Collection)

ریاستی مطالبہ طے ہونے کے بعد محصول کا سالانا تخمینہ لگایا جاتا تھا جسے جمع بندی کہتے تھے۔ اس تخمینے والے محصول سے انعام زمین کے لئے کٹوتی کی جاتی تھی۔ ریاستی عہدہ داروں کے واجبات کو بھی کل محصول کی طلب سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ ربیع اور خریف کی کٹائی کے بعد سال میں دو بار محصول وصول کئے جاتے تھے۔ زرعی محصولات کی وصولی میں ریاست کی مدد کے لئے افسران کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ گاؤں کا سربراہ (مقدم، پاٹل) محصول کی وصولی کے لئے ذمہ دار تھا۔ اس کی مدد ایک کلکرنی کرتا تھا جو گاؤں کا اکاؤنٹینٹ ہوتا تھا۔ تپا اور پرگنہ میں دیش

مکھ دیسائی محصول وصول کرنے کے لئے ذمہ دار تھے۔اس کی مدد کارکن کرتا تھا۔ محصول کی وصولی کے لئے ان کے پاس ایک فوج بھی ہوتی تھی۔ان کے خدمات کے عوض انہیں جمع شدہ محصول کا ۵ فیصد دیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ انہیں موروثی عطیہ زمین بھی دی جاتی تھی۔ان کی مدد دیش پانڈے یا دیش کلکرنی کیا کرتے تھے۔ ریکارڈ رکھنے والے اور اکاؤنٹینٹ کا کام محصول، زیر کاشت زمین کی پیداوری فصلوں کا مکمل ریکارڈ رکھنا تھا اس کے عوض انہیں محصول کا ایک مقررہ فیصد دیا جاتا تھا جو دیش مکھ کے مقابلے کم تھا۔انہیں بھی زمین عطیہ کے طور پر دی جاتی تھی۔ا ن کا عہدہ موروثی تھا۔زیادہ تر یہ عہدہ برہموں کے پاس تھا۔ گولکنڈا میں حولدار پرگنہ کی سطح پر محصول کی وصولی کرتا تھا۔یہ عہدہ نیلامی میں سب سے زیادہ بولی لگانے والے کو دیا جاتا تھا۔اگرچہ سرسمت کو اپنا کام پر نظر رکھنا ہوتا تھا، لیکن وہ عملی طور پر اپنی مرضی سے کام کرتا تھا۔اس کا بنیادی کام محصول کی وصولی کرنا اور مقررہ وقت پر ریاست کو مقررہ رقم ادا کرنا تھا۔زیادہ تر وہ بنیا یا برہمن ہوتے تھے۔ نظام شاہی سلطنت میں محصولات کے اہلکار زیادہ تر برہمن تھے۔ان پر نظر رکھنے کے لئے انہیں مسلمان افسروں کی نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔عادل شاہی سلطنت میں میر جملہ جس کی نگرانی وکیل کرتا تھا محصول وصول کرتا تھا۔ جادوناتھ سرکار کی دلیل ہے کہ شیواجی نے بیچولیوں جیسے زمینداروں، دیش مکھوں، دیسائیوں پاٹلوں وغیرہ کو مکمل طور پر ختم کر دیا تھا۔لیکن ستیش چندر کا خیال ہے کہ شیواجی نے صرف ان موروثی اہلکاروں کے اختیارات کو کم کیا تھا۔ شیواجی نے محصول کی وصولی کا دورہ کرنے اور نگرانی کرنے کے لئے عہدے داروں کو مقرر کیا اور انسے کہا کہ وہ اپنے مقررہ حصے سے زائد رقم وصول کرنے سے گریز کریں۔ایسا نہ کرنے پر ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھی۔

پیشواؤں کے ماتحت، سرصوبیدار محصولات کے معاملات میں وسیع اختیارات رکھتے تھے۔ سرصوبیداروں نے کمالِ سدار وغیرہ کے معاوضے طے کئے۔ انہیں معافی میں دی گئی زمین اور فڈنیس کو مقرر یا برطرف کرنے کا بھی حق تھا۔ معاملاتدار وں اور کمالِ سداروں نے پیشواؤں کے عہد میں محصولات کی وصولی میں اہم کردار ادا کیا کرتے تھے۔ان کا فرض تھا کہ پرگنوں اور اس کے حدود میں آنے والے گاؤوں سے محصول وصول کرے اور اور مرکز کو ادا کرے۔ عام طور پر، پرگنوں کی ایک خاص تعداد ان کے لئے تیار کی جاتی تھی۔ ریاست نے ان سے ایک مقررہ رقم وصول کی جسے رسد ادائیگی کہا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں سرصوبیدار مرکز کی منظوری سے معاملاتدار کا تقرر کر سکتا تھا۔ایسی صورت میں معاملاتدار کو بجاے براہ راست مرکز کے محصول کی ادائیگی سرصوبیدار کو کرنا پڑتا تھا۔ان سے بھی یہ بات کہی جاتی تھی کہ مقررہ حصے سے زیادہ لینے سے گریز کریں۔ بعض اوقات انہیں ریاست سے باہر واقع مخصوص علاقوں کے کماوس تفویض کیا جاتا تھا۔ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ خود علاقے کو فتح کریں اس صورت میں انکو فوج رکھنے کی بھی اجازت دی جاتی تھی۔ اور ان فوجیوں کو بجاے مرکز کے اس علاقے کی آمدنی سے ادائیگی کی جاتی تھی۔ انہیں منافع بخش تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ ان کے اختیارات کو جانچنے کے لئے ریاست نے براہ راست مجمدار فَڈنیس کو مقرر کیا تھا۔وہ براہ راست ریاست سے جوابدہ تھے۔بدعنوانوں کو سزا دینے کے لئے امین مقرر کئے جاتے تھے۔

ملک عنبر کے نظام محصولات میں ٹھیکے کا راوج نہیں تھا بلکہ انہوں نے گاؤں کے موروثی اہلکاروں کے ذریعے کاشتکاروں سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ شیواجی نے بھی ملک انبر کی پیروی کی اور نہ صرف زمین پر ٹھیکے کے عمل کو مکمل طور پر ختم کیا بلکہ انہوں نے محصول سے ملحق اہلکاروں کے اختیارات کو بھی کم کیا۔ ٹھیکے کا رواج دراصل پیشواؤں کے زمانے میں شروع ہوا۔انہوں نے پیشگی

ادائیگی کے بدلے زمین کو کماوسداروں کو دینے کی ابتدا کی۔ ریاست اپنے اہلکاروں کے ذریعے براہ راست محصول وصول کرنے کے بجائے اس کا حق عام طور پر سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو دیا جاتا تھا جو ریاست کو ایک مشت رقم ادا کرنے کا وعدہ کرتے تھے۔ کرشناندی کے شمال میں گولکنڈہ کے ساحلی علاقے میں تقرر گورنر اپنے عہدے پر ٹھیکے کے ذریعے فائز تھے۔ جیسا کا سلطنت کے دوسرے حصوں میں حولداروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ٹھیکے کی وجہ سے کاشتکاروں کا ریاست کے ساتھ براہ راست رابطہ کمزور ہوا۔ دکن کے یوسف عادل شاہ کے دور میں کچھ قسم کی ٹھیکے موجود تھے۔ زرعی محصول کے علاوہ کاشتکار بہت سے غیر قانونی ٹیکس اور ابواب ادا کرتے تھے۔ مراٹھوں اور بیجاپور بادشاہوں کے زمانے میں اس طرح کے ٹیکسوں کی تعداد پچاس تھی۔ اس کے علاوہ جبری مزدوری کا رواج بھی موجود تھا۔ شیواجی نے تمام غیر قانونی ٹیکسوں کو ختم کیا۔

13.4.3 چوتھ اور سردیش مکھی (*Chauth* and *Sardeshmukhi*)

یہ دونوں مراٹھوں کی آمدنی کے بڑے ذرائع تھے۔ بعض لوگوں نے اسے لوٹ اور لوٹ مار کہا ہے۔ پورے مراٹھا سلطنت میں دس فیصد سردیش مکھی عائد تھی۔ شیواجی نے اسے ملک کا اعلیٰ ترین سربراہ یعنی دیشمکھوں کے سربراہ کے طور پر دعوی کیا۔ اسی طرح مراٹھوں نے محصول کا چوتھا حصہ جسے چوتھ کہا جاتا تھا کا دعوی ان پڑوسی سرداروں پر عائد کیا جن کے علاقے مراٹھا سلطنت کا حصہ نہیں تھے۔ اس کا مقصد ان ریاستوں کو مراٹھا فوجی کارروائیوں سے تحفظ فراہم کرنا تھا۔

13.5 کشمیر ریاست کی زرعی معیشت (Agricultural Economy of the Kashmir State)

13.5.1 کاشت کی حد (Extent of Cultivation)

کشمیر کی معیشت کی اہم ستون زراعت تھی۔ وادی کشمیر میں پہاڑوں اور طبعی ماحول کی وجہ سے کاشت کی زمین کا رقبہ بہت کم تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں کشمیر کے پورے رقبے کو لمبائی میں ایک سو بیس اور چوڑائی میں دس سے پچیس کوس بتایا ہے۔ جبکہ توزک جہانگیری نے لمبائی میں ۵۶ سے ۶۷ کوس اور چوڑائی میں صرف دو کوس کے رقبے کا شمارہ دیا ہے۔ تاریخ کشمیر کے مصنف نے مغلوں کے دور میں کشمیر کا کل رقبہ پانچ ہزار ایک سو چار گُماؤں بتایا ہے ایک گُماو آٹھ کنال یا دو بیگھہ زمین ہوتی تھی۔ جہانگیر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کل زمین میں سے تین چوتھائی پہاڑی اور صرف ایک چوتھائی قابل کاشت زمین تھی۔ اس طرح کشمیر میں کاشت کی زمین بہت کم تھی۔

13.5.2 زمین کے اقسام اور آبپاشی (Types of Land and the Irrigation)

کشمیر کی آبادی کا ایک بڑا حصہ گاؤں میں رہتا تھا اور قدرتی طور پر ان کی ذریعہ معاش زراعت تھی۔ مختلف ادبی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ کل زمین کی تین چوتھائی پہاڑی اور صرف ایک چوتھائی قابل کاشت زمیں تھی۔ یہاں زراعت کے طور پر کاشت صرف گرمیوں کے موسم میں ممکن تھی۔ اس کے علاوہ موسمی حالات کی وجہ سے کاشتکار ایک ہی موسم میں تمام فصلیں پیدا کرتے تھے۔ اسی لئے زرعی پیداوار کے مطابق مختلف زرعی زمینیں تھیں۔ تاریخ رشیدی کے حوالے سے کشمیر میں چار قسم، مصنوعی ذرائع سے آبپاشی کی جانے والی زمیں (آبی)، قدرتی

ذرائع سے سیر اب ہونے والی زمیں (لاملی)، باغ کی زمیں (باغی) سطح کی زمین یا غیر قابل کاشت زمیں (نَمبَل) تھے اس قسم کی زمینوں میں کاشت کی جانے والی فصلیں زرخیزی، آبپاشی کی سہولت اور مٹی کے معیار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ تھیں۔ آبی زمین کی آباشی کے اہم ذرائع چشمیں، چھیل، نہر اور دریا تھے اس زمین میں پانی کی فراہمی ہونے کی وجہ سے دھان کی کاشت لئے مناسب تھی۔ لاملی زمین کی آبپاشی کا ذریعہ بارش کا پانی تھا جس میں گیہنوں، جو، مکئ، باجرہ وغیرہ کی کاشت ممکن تھی۔ باغی زمین پھلوں کے کاشت کے لئے مناسب تھی۔ یہ زمین زیادہ پیداواری نہیں تھی کہ کاشت کی جاسکے۔ نمبل زمین کاشت کے لئے بہتر نہیں تھی۔ ان چار کے علاوہ قابل کاشت زمین کی ایک اور قسم تھی جسے تیرتے ہوئے باغات کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ابوالفضل نے اکبر کے کشمیر دورے کا ذکر کرتے ہوئے ڈل جھیل کے سطح پر اس طرح کی زمینوں کی ایک بڑی مقدار کی بات کرتا ہے۔

مغل دور کے کشمیر میں کچھ نہروں کی تعمیر کرائی گئی تھی لیکن اس کا بنیادی مقصد زرعی آبپاشی کے بجائے باغات کی خوبصورتی تھی۔ مغل صوبیدار، یوسف خان رَضوی نے ایک نہر بنائی جو کہ نُلّہ سندھ کے مشہور چشمہ کو باغ الہی سے ملاتی تھی۔ آبپاشی کے نظام کو بہتر بنانے میں جہانگیر نے کافی دلچسپی لیا تھا۔ انہوں نے شالیمار باغ کے لئے ایک نہر بنوائی تھی جبکہ آصف خان نے نشاط باغ کے لئے ایک دوسری نہر بنوائی تھی۔ میر آب کا نظام کشمیر میں متعارف کرایا گیا ہر نہر پر ایک میر آب مقرر تھا جو گاؤں کے لوگوں میں سے ہی ہوتا تھا۔ اس کا اہم فریضہ نہر کی مرمت کرانا تھا۔ پہاڑی ندیوں سے ہونے والی آبپاشی کے علاوہ کشمیر کے متعدد چشموں سے بھی آبپاشی کی جاتی تھی۔ کلاروس یا اس کے دامن کی پہاڑیوں کے نیچے کی زیادہ تر اندرونی زمینیں چشمے کے پانی سے سیر اب ہوتی تھی۔ بَرَنگ قصبہ کے آس پاس ایک بڑا چشمہ تھا جو پانچ گاؤوں کو سیر اب کرتا تھا۔ لیکن چشمے کے پانی کو آبپاشی کے لئے موزوں نہیں سمجھا جاتا تھا کیون کہ اس میں دو خامیاں تھیں۔ چشمے کا پانی بہت ہی ٹھنڈا ہوتا اور اس میں زرخیزی والا مواد کے بجاے گندگی ہوتی تھی جو چاول کی کاشت کے لئے مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مختلف قسم کی سبزیوں کے لیے کنویں کے پانی سے آبپاشی کی جاتی تھی۔

13.5.3 زرعی آلات (Agricultural Tools)

کاشتکاری میں استعمال ہونے والے زرعی آلات سادہ طریقہ سے بنائی جاتے تھے۔ ہل ہلکا ہوتا تھا جو شہتوت، راکھ اور سیب کے درخت کی لکڑی سے بنایا جاتا تھا۔ ہل کے حصے کو نوکدار لوہا لگایا جاتا تھا۔ لوہے کے نوک کے ساتھ لکڑی کا کدال کے علاوہ ایک خاص کدال جڑی بوٹیوں کو نکالنے اور مٹی کو ڈھیلا کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ درانتی، تَبَر (ایک قس کی کلہاڑی)، چاج (ٹوکری) وغیرہ استعمال کئے جاتے تھے۔ درانتی، کدال وغیرہ کو چھوڑ کر اوزار زیادہ تر لکڑی کے ہوتے تھے اور مقامی طور چھَن (بڑھئ) اور اہَنگَر (لوہار) تیار کرتے تھے۔ زراعت کے لیے مزدور اور مویشیوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ فصل کاٹنے کے وقت انہیں معاوضہ دیا جاتا تھا۔ فصلوں کو اگانے کے لئے کھیتوں کو تین یا چار بار جوتا جاتا تھا جس کا انتظام عام طور پر خواتین کرتی تھیں۔ جوتنے کے لیے دو بیلوں کی مدد لی جاتی تھی۔ کھیتوں میں ہر فصل کے لئے کھاد ڈالی جاتی تھی، تاکہ اس کی زرخیزی بڑھا کر پیداوار میں اضافہ کیا جاسکے۔

13.5.4 زرعی پیداوار (Agricultural Products)

کشمیر میں اگائی جانے والی اہم فصلوں کو دو گروہ، ربیع اور خریف میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ربیع کے فصلوں میں جو، گندم، ریپ، پھالیاں، سرسوں، السی، چنے اور کپاس شامل تھے۔ خریف کی فصلوں میں چاول، مکئی، زعفران، دالیں، اور آبی شاہ بلوط وغیرہ شامل تھے۔ لیکن عجیب وغریب جغرافیا کی وجہ سے یکساں فصل کا طریقہ نہیں اپنایا جاتا تھا۔ زرعی پیداوار میں چاول کی کاشت پورے کشمیر میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی۔ اس کی بُوائی مارچ کے مہینے میں شروع ہو جاتی تھی۔ توزک جہانگیری کے مطابق کل رقبے کا تقریباً دو تہائی حصہ پر چاول کی کاشت ہوتی تھی۔ چاول آبی زمین میں بویا جاتا تھا۔ پہاڑی اطراف اور ان تمام علاقوں میں اس کی کاشت کی جاتی تھی جہاں پانی آسانی سے دستیاب تھا۔ اس کی کاشت کِشتوار، پگھلی اور پُنچ کے کچھ علاقوں میں بھی کی جاتی تھی۔ راجوری کا چاول کمتر قسم کا تھا۔ تاریخ حسن کے مطابق کشمیر میں ۹۴ اقسام کے چاول اگائے جاتے تھے جن میں سے پانچ قسم کے چاول سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا، لیکن پرگنہ پکھ کے تیلبال گاؤں میں اگایا جانے والا چوگل نامی چاول بہترین سمجھا جاتا تھا۔

زرعی پیداوار میں گندم دوسری بڑی فصل تھی۔ ابوالفضل کے مطابق گندم ان زرعی پیداوار میں شامل تھی جس پر محصولات کی شرحیں لگائی جاتی تھیں۔ اسے خشک علاقوں میں بویا جاتا تھا جو وقفہ وقفہ سے ہونے والی بارش پر منحصر تھا۔ اس میں بہت زیادہ آبپاشی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ 'گندم چھوٹی اور سیاہ رنگ کی اور کم ہوتی ہے۔ یہ فصل مجموعی قابل کاشت زمین کے آٹھویں حصے پر اگائی جاتی تھی۔ یہ کِشتوار پونچ کے پہاڑی علاقوں میں بھی اگائی جاتی تھی۔ پرگنہ شاہ آباد میں سب سے اعلیٰ معیار کی گندم پیدا ہوتی تھی۔ جو کی فصل بھی کشمیر میں اگائی جاتی تھی۔ اس کا ذکر مذہبی تقریبات اور دیوتاؤں کو چڑھانے کے حوالے سے کثرت سے کیا گیا ہے۔ ایم۔ اے۔ اسٹین کے مطابق، 'جَو کشمیر میں صرف غریب ترین لوگ کھاتے تھے یا ان جگہوں پر جہاں مناسب کھانا دستیاب نہیں تھا'۔ یہ فصل بنجر علاقے میں بوئی جاتی تھی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں کہا ہے کہ جَو کشمیر میں نہیں اگائی جاتی تھی جب کہ اکبر نامہ میں کہتا ہے کہ کشمیر میں جو فصل بہار (ربیع) میں اگائی جاتی تھی اور ایک پٹّا زمین پر ریاست کا حصہ دو تَرَک ہوتا تھا۔ یہ پرگنہ لار کے علاوہ دیگر مقامات میں بھی اگایا جاتا تھا۔ توزک جہانگیری کے مطابق جَو کِشتوار اور پاکھل میں ہوتا تھا اور تبت میں یہ اہم زرعی پیداوار تھی۔ عرفان حبیب کے مطابق یہ فصل کشمیر میں نہیں اگائی جاتی تھی لیکن والٹر لارنس کہتا ہے کی جَو بڑے پیمانے پر کشمیر میں کاشت کی جاتی تھی۔ یہ عام طور سے وقفہ وقفہ سے ہونے والی بارش منحصر زمین پر اگائی جاتی تھی۔

زمانہ قدیم سے ہی کشمیر کی وادی مین مختلف قسم کی دالوں کی فصل اگائی جاتی تھی۔ ان کا ذکر مذہبی تقریبات کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اس فصل کی موجودگی کی تصدیق مغل اور مقامی دونوں مآخذ سے ہوتی ہے۔ دالوں کی فصلیں جَو اور دھان کے ساتھ کی جاتی تھی۔ دالوں کی مختلف اقسام میں مونگ، مسور، مہلا، موٹھ اور ماش شامل تھے۔ دالوں میں سب سے بہتر مونگ اور کمتر میں موٹھ تھا۔ زعفران کی کاشت بھی کشمیر کے اہم فصلوں میں سے ایک تھی۔ اس کا استعمال پوجا کی تقریبات اور دوا بنانے کے لئے کیا جاتا تھا۔ اس فصل کی کاشت دو علاقوں پدم پور (جدید پامپور) اور اندرکوٹ میں کی جاتی تھی۔ ابوالفضل کے مطابق پامپور میں زعفران کی کاشت بارہ ہزار بیگھے میں کی جاتی تھی جو تقریباً بارہ وہ

کوس تک پھیلا ہوا تھا۔ اندد کوٹ میں اسکی کاشت ایک کوس میں پھیلی تھی۔ اسکی کاشت کِشتوار میں بھی کی جاتی تھی۔ دوسری فصلیں جو کشمیر میں اُگائی جاتی تھیں اس میں کنگانی اور باجرا کی فصل تھی۔ کنگانی زیادہ تر ندیوں کے کنارے کے ارد گرد زمین پر اُگائی جاتی تھی۔ تیل کی بیج زیادہ تر کشمیر میں اگائے جاتے تھے جس میں سب سے اہم تلگو کل تھا جسے بہار کی فصل کے طور پر اُگایا جاتا تھا۔

13.5.5 سبزیاں اور پھل (Fruits and the Vegetables)

ان تمام فصلوں کے علاوہ کشمیر مین سبزیوں کی بڑی اہمیت تھی اور گاؤں کے ہر ایک شخص کے پاس اپنا باغیچہ تھا۔ سبزیاں جیسے گوبھی، گاجر، پوپموش کے پتّوں کے ڈنٹھل، گری دار میوے یا سنگھار، کَمل، شلجم، مولی پالک، ککڑی، بھلیاں وغیرہ پوری وادی میں اگائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈل جھیل کے قریب بہت سے باغات تھے جہاں کاشتکار مختلف قسم کی سبزیاں اگاتے تھے۔ کشمیری سبزیاں شاہی مطبخ کو بھی بھیجی جاتی تھیں۔ زمانہ قدیم سے ہی کشمیر اپنے پھلوں کی مختلف اقسام کے لئے مشہور تھا۔ اکبر کے دور میں باغات کا داروغہ محمد قلی افشار نے پودوں کی قلم کاری کے ذریعے کابل سے چیری اور خوبانی لاکر کشمیر میں لگایا تھا۔ یہاں پیدا ہونے والے دوسرے پھلوں میں ناشپاتی، انگور، بیر، اور میوے میں آخروٹ شامل تھے۔

13.5.6 نظام محصول (Revenue System)

اکبر کے زمانے میں ضبطی نظام کے نفاذ کا آغاز ہوا، جس سے محصولات کی وصولی کے لئے معیاری طریقہ کار کو یقینی بنایا گیا۔ یہ نظام پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ زمین کی پیایش پر مبنی تھا۔ یہاں پٹواریوں کو زمین کی پیائش اور دستاویز کو برقرار رکھنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اور ایک منظم طریقہ سے منصفانہ محصول لگایا گیا۔ اور کسانوں اور ریاست کے درمیان اعتماد کو فروغ دیا گیا۔

13.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مندرجہ بالا صفحات کی گفتگو سے مغل عہد کے تین علاقائی ریاستوں، دکن، مراٹھا اور کشمیر کی ریاستوں کی زرعی معیشت جس میں دکن اور مراٹھے کی ریاستوں کے زرعی پیداور، آبپاشی کے ذرائع، زمین کے اقسم اور سماجی درجہ بندی، نظام محصولات، گاؤں کے مختلف خدمت گزار، زراعت اور گاؤں کے انتظامیہ سے ملحق آفسر کے کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی علم ہوا کے مراٹھے اور دکن کی زرعی معیشت اور نظام وغیرہ مغل دور کے شمالی ہندوستان سے مختلف تھے۔ حالانکہ مغلوں نے بھی اورنگزیب کے زمانے میں زراعت سے متعلق کچھ اصلاحات کئے تھے۔ اس اکائی سے ہمیں مغل کشمیر کی زرعی معیشت، زرعی پیداور، آبپاشی کے مختلف ذرائع، زمین کی متعدد اقسام، زرعی زمین کے رقبے وہاں کاشت کی جانے والی اہم فصلوں، پھلوں، سبزیوں اور مختصر میں نظام محصولات کے بارے میں بھی معلومات ہوئی۔

13.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

مجرا، وادی پادی اور کھاری	:	مراٹھا سلطنت میں گاؤں کے مضافاتی علاقے۔
پیٹھ	:	مراٹھا سلطنت کے قصبے کا بازار
وَطندار	:	گاؤں کا ایک مستقل آفسر
پاٹل	:	گاؤں کا بڑا موروثی آفسر جسکا اہم کام محصول وصولی تھا۔
کلکرنی یا گرام لیکھی	:	گاؤں کا اکاؤنٹینٹ۔
گوتسبھا	:	مراٹھا سلطنت میں گاؤں کا پنچائت۔
مہار	:	گاؤں کے عام خدمت گزاروں میں سے ایک فرد۔
تَرال	:	گاؤں کے انتظامیہ کا قاصد۔
مانگا اور راموشی	:	چوکیدار اور جرائم کا سراغ لگانے والا۔
جوشی	:	گاؤں کا پجاری۔
کولی اور گورَو	:	گاؤں کے مندر کے پجاری۔
مُلان	:	گاؤں میں مسجد اور تدفین کے خدمات انجام دینے والے۔
میراثدار یا تھلکاری	:	ایسے کاشتکار جن کا زمین پر مالکانہ حق تھا اور اپنی زمینوں پر خود کاشت کرتے تھے۔
پنڈھاری	:	گاؤں کا ریہائشی علاقہ۔
کالی	:	زرعی زمین
کُران یا گائران	:	گھاس کا میدان یا گائے کے لئے بنجر زمین۔
لوکاساکُران	:	گاؤں کے عام استعمال کے لئے گھاس کا میدان۔
سرکارکُران	:	ریاست کے استعمال کے لئے گھاس کا میدان۔
انعام زمین	:	عطیہ کے طور پر دی جانے والی زمین۔
کھارپَت	:	وہ زمین جس میں نمک پایا جاتا تھا۔
سرکارچی شیری	:	ریاستی زمین یا خالصہ زمین کے لئے استعمال ہونے والا اصطلاح۔
انعام پَتر	:	انعام کے طور پر دی جانے والی زمین کا دستاویزی معاہدہ۔
وِرتی	:	پجاری کو دی جانے والی مذہبی انعام۔
دیوراوِرتی	:	مشرقی دکن میں مندر کے دیوا کو عطیہ کی جانے والی زمین۔

وطن زمین	:	گاؤں کے آفسروں کو حاصل مراعات۔
سند	:	ایک دستاویز جو سرکاری مہر سے اجرتوں اور تنخواہ کی تصدیق کرتی تھی۔
نَمل	:	کشمیر کے غیر قابل کاشت زمین۔
بلوطہ دار	:	گاؤں کے خدمت گزار طبقہ

13.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

13.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مراٹھا سلطنت میں گاؤں کو کیا کہتے تھے؟
2. کون سا لفظ مراٹھا سلطنت میں گاؤں کے اصل نام سے پہلے استعمال کیا جاتا تھا؟
3. بلوطہ دار میں کون کون شامل تھے؟
4. دیشمکھ اور دیش پانڈے کاؤں کے کس شخص کا پندرہ دنوں تک مفت خدمت لینے کا حق رکھتا تھا۔
5. بلوطہ دار کے تحت گاؤں کے مذہبی خادم میں کون لوگ شامل تھے؟
6. کیا بلوطہ دار گاؤں کی کونسل میں شامل ہوتے تھے؟
7. گاؤں کے حجام کا نشان کیا تھا؟
8. مراٹھا سلطنت میں ربیع میں کون سی فصلیں اگائی جاتی تھیں؟
9. کشمیر میں آبپاشی کا اہم ذریعہ کیا تھا؟
10. کشمیر میں چیری اور خوبانی کس نے متعارف کرایا؟

13.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. وطندار کے فرائض پر پانچ جملے لکھیئے۔
2. دیشمکھ کے اختیارات اور فرائض پر مفصل نوٹ لکھیے۔
3. مراٹھا سلطنت کے کاشتکاروں کا وہاں کی معاشی ترقی میں خدمات کا جائزہ لیجیے۔
4. مراٹھا سلطنت کے آبپاشی کے نظام پر تبصرہ کیجیے۔
5. میراثی زمین پر ایک نوٹ لکھیئے۔
6. مغل کشمیر کے زرعی پیداوار پر دس جملے لکھیئے۔
7. کشمیر میں آبپاشی کے ذرائع پر مفصل نوٹ لکھیے۔

13.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. امراٹھا سلطنت میں گاؤں کی زمینوں کے اقسام اور سماجی درجہ بندی پر گفتگو کیجئے۔
2. مراٹھا ریاست میں گاؤں کے برادری پر تفصیلی بحث کیجئے۔
3. مغلوں کا دکن میں محصولات کے اصلاحات پر ایک مضمون لکھیئے۔
4. دکن اور مراٹھا ریاست کے نظام محصول کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔
5. کشمیر کے زرعی معیشت اور اس کی تجارتی اہمیت پر تبصرہ کیجیے۔

13.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).
3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
4. Chandra, Satish, *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans*, Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta, 1986.
5. Chitnis, K.N., *Medieval Indian History*, Atlantic Publishers and Distributors, New Delhi, 2008 (first pub. in 2003).
6. Fukazawa, Hiroshi, *The Medieval Deccan: Peasants, Social Systems and States: Sixteenth to Eighteenth Centuries*, Oxford University Press, Delhi, 1991.
7. Gordon, Stewart, *The Marathas, 1600–1800*, Cambridge University Press, New Delhi, 2005 (first pub. in 1998).
8. Habib, Irfan and Tapan Raychaudhuri eds., The Cambridge Economic History of India, Vol. 1, Cambridge University Press, Cambridge, 1982.
9. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
10. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
11. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1997).
12. Hasan, Saiyid Nurul, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, New Delhi, 1990 (first pub. in 1973).
13. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
14. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black, Ranikhet, 2016.
15. Kulkrani, A.R., *Maharashtra in the Age of Shivaji*, R.J. Deshmukh, Poona,1969.
16. Kulkarni, A.R., *Medieval Maharashtra*, Book and Books, New Delhi, 1996.
17. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*, *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers Pvt., Ltd., New Delhi, 1995 (first pub. 1983).

18. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. in 1923).
19. Moosvi, Shireen, *The Economy of the Mughal Empire, c. 1595*: *A statistical Study*, Oxford University Press, New Delhi, 1987.
20. Richards, Jhon F., *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, New Delhi, 2016.
21. Sarkar, Jadunath, *Shivaji and His Times*, Orient BlackSwan, New Delhi, 2012 (rprt.)
22. Shivram, Balkrishan, *Jagirdars in the Mughal empire during the Reign of Akbar*, Manohar, New Delhi, 2008.
23. Shrimali, Krishna Mohan, *Land, Agriculture and Money in Central India and Beyond* (*c. 100 to c. 1300 A.D.*): *A Feudal Order Revisited*, Aakar, Delhi, 2024.
24. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *Mughals and Franks*, Oxford University Press, New Delhi, 2014 (first pub. in 2005).
25. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *From the Tagus to the Ganges*, Oxford University Press, New Delhi, 2011 (first pub. in 2005).

اکائی 14۔ دستکاری اور شہری آبادکاری

(Crafts and Urbanisation)

اکائی کے اجزاء

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 زراعت پر مبنی صنعت

14.2.1 کپڑے کی صنعت

14.2.2 سوتی کپڑے

14.2.3 ریشمی کپڑے

14.2.4 اُونی کپڑے

14.2.5 نیل کھیتی اور اس کی صنعت

14.2.6 کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی

14.2.7 شکر کی صنعت

14.2.8 تیل کی صنعت

14.3 معدنیات کی صنعت

14.3.1 نمک

14.3.2 شورا

14.4 دھاتوں کی صنعت و دستکاری

14.4.1 سونا اور چاندی

14.4.2 ہیرے

14.4.3 جستہ، تامبا اور لوہا

14.5 لکڑی کی صنعت

14.6 کاغذ کی صنعت
14.7 چمڑے کی صنعت
14.8 متفرق صنعتیں
14.9 شہری آبادکاری
14.10 اکتسابی نتائج
14.11 کلیدی الفاظ
14.12 نمونہ امتحانی سوالات
14.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید (Introduction)

مغل دور کے ہندوستان میں اعلی قسم کی دستکاریاں، صنعتیں موجود تھیں جسکا تعلق جو براہ راست مقامی ضروریات، تجارت و حرفت اور شہر آبادکاری سے تھیں۔ ہم عصر مأخذ اور یوروپین مبصرین اور سیاحوں کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں دستکاری اور صنعتی سرگرمیاں کچھ اہم مرکزی تجارتی مقامات اور ان کے نزدیکی علاقوں میں کافی ترقی پر تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ شہر تو اپنی مخصوص دستکاری اور فن کے لئے مشہور تھے۔ لیکن بد قسمتی سے دستکاروں اور ان کے طریقہ کار کے بارے میں فارسی مأخذ میں زیادہ معلومات نہیں ملتے۔ ہمیں اس کے بارے تفصیلی معلومات یوروپی سیاحوں کے دستاویزات اور مختلف غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کے خط و کتابت سے ہوتی ہیں۔ حقیقت میں یہ غیر ملکی کمپنیاں ہندوستانی دستکاروں کی پیداوار کے طریقہ کار اور معیار پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ حالانکہ دستکاری کی پیداوار مکمل طور سے گھریلو منڈی میں مانگ پر منحصر تھی۔ صنعتی سرگرمیاں اس وقت کافی تیز ہو جاتی تھں، جب ہندوستانی مصنوعات کی مانگ سترہویں صدی میں بیرونی ملکوں میں بڑھ جاتی تھی۔ ہندوستانی مصنوعات کی اضافی مانگ نے صنعتی سرگرمیوں کو کافی حد تک متأثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس اکائی میں، ہم دستکاری، صنعتوں کے اہم مراکز، اس کو تیار کرنے میں استعمال ہونے والے کچے مال اور طریقہ کار کا پر تبادلہ خیال کریں گے۔ اس کے علاوہ، ہم معدنیات کی دستیابی اور انکی پیداوار کے ساتھ ساتھ دستکاری کے بازار، اہم مراکز اور ان ان کے شہری آبادکاری میں کردار پر بھی گفتگو کریں گے۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل دور کے ہندوستان میں مختلف اقسام کی زرعی غیر زرعی دستکاری اور صنعتوں کا معیشت اور شہری آبادکاری میں اہم کردار کے

بارے میں جان سکیں گے۔

- مغل ہندوستان میں تیار کردہ مختلف قسم کی مصنوعات، دستکاری اور صنعت و حرفت کی ترقی کی معلومات ہو سکے گی۔
- کچھ اہم اور مخصوص دستکاری کے لیے مشہور مراکز کے بارے میں جان سکیں گے۔
- ہندوستان کے مختلف حصوں میں دستیاب معدنیات، دھاتوں، لکڑی، چمڑے، کاغذ وغیرہ کی صنعتوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- دستکاری، ان کے مراکز اور شہری آبادکاری کے مابین رشتہ سے واقفیت حاصل ہو سکے گی۔

14.2 زراعت پر مبنی صنعت (Agriculture-based Industry)

عہدِ وسطی کے زرعی نظام میں ان تمام سماجی اور اقتصادی پہلوؤں کا مطالعہ شامل ہے، جن کے سبب زراعت پر مبنی صنعت و حرفت کی حوصلہ افزائی حکومت کر رہی تھی۔ لیکن پیداوار کی اس طرز عمل میں اہم تبدیلی خاص طور سے سترہویں صدی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی صدی سے ہندوستانی مصنوعات کی مانگ بیرون ممالک میں اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ یہ تبدیلی نئے صنعتوں کے قیام اور تجارتی لین دین کے میدان میں بھی ہوئی۔ جس کا اثر خاص طور پر عہدِ وسطی کے ہندوستان کی معاشی اور سماجی زندگی پر رونما ہوئی۔ زراعت پر مبنی صنعت میں کپڑے بالخصوص سوتی، ریشمی اور اونی شال اور کپڑے شامل تھے۔ اس کے علاوہ نیل، گنا اور تیل بھی اسی زمرے میں تھے۔

14.2.1 کپڑے کی صنعت (The Textile Industry)

مغل ہندوستان میں سب سے بڑی صنعت کپڑے کی تھی۔ اس صنعت کے اہم مراکز سورت، گجرات، چندیری، بُرہانپور، میسور اور صوبہ مدراس کے شمالی علاقے تھے۔ اس کے علاوہ جونپور، بنارس، بہار، اڑیسہ اور بنگال بھی اہم مراکز میں شامل تھے۔ ہم عصر مآخذ سے یہ واضح ہے کہ کپڑے کی بُنائی کی صنعت خاص طور پر سوتی اور ریشمی کپڑے ہندوستان کی اہم اور سب سے بڑی صنعت تھے۔ مشہور معاشی مؤرخ، تپن رائے چودھوری کے مطابق، سوتی ملبوسات عملی طور پر پورے ملک میں تیار کئے جاتے تھے کیونکہ کے ہمالیہ کے ذیلی علاقوں کو چھوڑ کر کپاس کی کاشت تقریباً ہر جگہ ہوتی تھی۔ اس کے بڑے پیمانے پر پیداوار سے متأثر ہو کر فرانکوئس پایرارڈ (Francois Pyrard) نے لکھا تھا کہ ''کنیاکماری سے لے کر چین تک تمام مرد اور خواتین سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس پہنتے ہیں'' سترہویں صدی میں ہندوستان آنے والے ڈَچ تاجر، فرانسسکو پیلسارٹ Francisco Pelsaert کا بیان ہے کہ شہباز پور اور سونار گاؤں سے لے کر جگناتھ پور تک بنائی کی صنعت ہر کسی کے لیے روزی روٹی کا بنیادی ذریعہ تھی۔ ان کے مطابق تقریباً ہر قصبہ اور شہر بُنکروں سے بھرا ہوا تھا۔ 1620 کی دہائی میں صرف مسولیپٹم میں 7000 بنکروں کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ بنکروں کی اتنی ہی تعداد کی موجودگی 1640 کی دہائی میں بنارس میں ملتا ہے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی میں سوتی کپڑے کی صنعت سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی اور بیرون ممالک ہندوستانی سوتی کپڑے کی بہت مانگ تھی۔ ہندوستانی سوتی کپڑے کو 'کیلیکو' کہا جاتا تھا۔ گجرات، بنگال، سندھ کے میدانی علاقے اور کورومنڈل سوتی کپڑے کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ جبکہ اُڑیسہ میں بالاسور، بنگال میں قاسم بازار اور ڈھاکہ اور جنوب ہندوستان میں بُرہانپور وغیرہ دھاگوں کی کتائی کے لئے کافی مشہور

تھے۔ فرانسیسی سیاح، فرانکوئس برنیئر (Francois Bernier) کے مطابق بنگال میں کپاس اور ریشم کی پیداوار کی بہتات کی وجہ سے ہندوستان اور یوروپ کا خزانہ کہا جاتا تھا۔ ایک انگریز آفسر ہنری پٹولو (Henry Patullo) کے مطابق بنگال کی سوتی کپڑوں کی پیداوار کی صلاحیت میں کبھی بھی کمی نہیں آئے گی کیونکہ کپڑے کی پیداوار میں دنیا کا کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انگریز آفسر کا یہ بیان سوتی کپڑے کی صنعت میں بہترین ٹیکنالوجی کے استعمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

14.2.2 سوتی کپڑے (Cotton Textile)

مغل دور کے ہندوستان میں سوتی کپڑوں کی مختلف اقسام اور معیار تھے۔ حمیدہ خاتوں نقوی نے مغلیہ سلطنت کے پانچ بڑے صنعتی مراکز میں تیار کیے جانے والے کپڑوں کی انتالیس اقسام کی فہرست دیا ہے۔ حالانکہ یوروپین مآخذ میں سَو سے زیادہ اقسام کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں سوتی کپڑوں کی تمام قسموں کی فہرست فراہم کرنا مشکل ہے، کیوں کہ ہر علاقے کی اپنی خصوصیات تھی۔ ابوالفضل کی آئین اکبری اور برطانوی فیکٹری ریکارڈ میں سوتی کپڑوں کی بے شمار قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کورومنڈل کے شمالی علاقے یعنی پولیکٹ کے شمالی علاقے میں 'سفید گیلانا' نامی کپڑے تیار کئے جاتے تھے، جس کی مانگ بحر احمر اور بحر روم کے مشرقی علاقے میں کافی تھی۔ اسی طرح جنوبی کورومنڈل خاص قسم کے لال، نیلے اور دھاری دار کپڑے کے لئے مشہور تھا۔ اور نگ آباد اور بُرہانپور سفید کپڑوں کی پیداوار کے مشہور مراکز تھے۔ جبکہ چَول کتان (لَنن) کے لئے اور کیمبے لحاف کے لئے مشہور تھا۔ ململ زیادہ تر دکن، سونار گاؤں، ست گاؤں اور ڈھاکہ میں تیار کیا جاتا تھا۔ عالمی طور پر مشہور ڈھاکہ کے ململ کو 'آب رواں'، 'شبنم' اور 'گنگا جل' کہا جاتا تھا۔ جبکہ قائم خانی ململ کی ایک عمدہ قسم تھی جسے بنیادی طور پر مغل حکمراں طبقہ اور اشرافیہ استعمال کرتا تھا۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بننے والے سوتی کپڑوں میں سب سے مشہور 'چھینٹ' تھا جسے یوروپیں مآخذ میں چِنٹز کہا گیا ہے۔ خاص طور سے مسولیپٹم کی چھینٹ کے کپڑے ہر لحاظ سے انسانی کاریگری اور فنکارانہ مہارت کی اعلیٰ مثال تھی۔ اس کے علاوہ دہلی، لاہور، سرہند اور ناگپٹنم سوتی اور چھینٹ کپڑوں کے لیے مشہور تھے۔ آئین اکبری کے مطابق شمالی ہندوستان میں چھینٹ کی قیمیت دو روپیہ فی گز تھی۔ صوبہ دہلی کے مچھیواڑہ، گجرات اور ٹھٹّا کا 'بافتا' اعلیٰ قسم کا سوتی ملبوس بہت مشہور تھا۔ کچھ مراکز سوتی کپڑوں کے لئے اس قدر مشہور تھے کہ کپڑے کی قسم بھی اس علاقے کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر دریاآباد کا دریاآبادی، خیر آباد کا خیر آبادی، سَمانا کا سَمیانو، سِلہٹ کا سِلہٹی، دیوگیر کا دیوگیری، کانچی پورم کا کانچِپانی، تنجاوُر کا تنجیرا ناموں سے مشہور تھے۔ 'لٹّا' نامی کپڑے زیادہ تر شمالی کورومنڈل اور شمالی ہندوستان میں تیار کیا جاتا تھا۔ پٹنہ میں تیار کردہ "اَمرِتیز" قسم کا سوتی کپڑا کے تین درجات یعنی 'موٹا'، 'ظفر خانی' اور 'جہانگیری' میں دستیاب تھا۔ سہارنپور کا 'خاصہ' اور 'چَوتَر'، بنارس کا 'گنگا جل'، 'جھونا'، 'مِہرِ کل' اور 'مندل' بڑے مشہور تھے۔ 'دوپٹّا' نامی کپڑا پگڑی بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ 'ڈوریا' قمیص بنانے کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جبکہ 'سوسی' پاجامہ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ 'سِلہَٹی' سوتی کپڑے کی سب سے اچھے قسموں ایک تھی۔ جبکہ 'چَوتَر' اور 'سریسَف' بہت مہنگی تھی۔ عام لوگ موٹے قسم کا 'کمین' جبکہ اشراف لوگ عمدہ قسم کے 'مہین' نامی کپڑے کا استعمال کرتے تھے۔

14.2.3 ریشمی کپڑے (Silk Textiles)

ہندوستان میں ریشم کو شہتوت کے کیڑے کے ذریعے تیار کیا جاتا تھا۔ ریشمی کپڑے کی صنعت بنیادی طور پر گجرات، لاہور اور آگرہ میں پروان چڑھی اور ان جگہوں کے زوال کے بعد کشمیر اور بنگال کے علاوہ صرف بنارام میں ہی پھلا پھولا۔ چَول ریشم بُنکروں کے لئے مشہور تھا۔ قرون وسطی کے اُڑیسہ میں بھی ریشم کی پیداوار کا ذکر آیا ہے۔ جبکہ سترہویں صدی میں بنگال ریشم کے بڑا صنعتی مرکز بن گیا اور جلد ہی چین کی جگہ لے لی تھی۔ گھوڑا گھاٹ، قاسم بازار اور باکلا ریشم کے اہم مراکز تھے۔ فرانسیسی تاجر، جین بَیپٹِسٹ ٹیورنیئر (Jean-Baptiste Tavernier) کے مطابق صرف قاسم بازار سے چوبیس لاکھ پاؤنڈ کا ریشم برآمد کیا گیا۔ سترہویں صدی کا ایک اور فرانسیسی سیاح، بَرنیَر کا بیان ہے کہ ڈچ تاجروں نے قاسم بازار میں ریشم کا کارخانہ قائم کیا۔ مالدہ ریشم اور سوتی کپڑے کی صنعت کا اہم مرکز تھا۔ ٹیورنیَر کے مطابق بنگال سے کچّا ریشم احمد آباد اور سورت لایا جاتا تھا، جہاں بہترین معیار کا ریشمی کپڑے تیار کئے جاتے تھے۔ ریشم کے قسموں میں 'جُوج'، 'کوئلا' اور 'مشرو' (کپاس اور ریشم کا مرکب) دہلی میں تیار کیا جاتا تھا۔ گجرات میں پیدا ہونے والے ریشم کے اقسام میں 'پٹولا' کی بہت زیادہ مانگ تھی۔ بھاگل پور (بہار)، 'ٹسّر' نامی ریشم کی پیداوار کے لئے جانا جاتا تھا۔ ٹیورنیَر نے آسام کو 'مونگا' ریشم کے پیداوار کے طور پر ذکر کیا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر کشمیر کے ریشم سے اس قدر متأثر ہوا کہ اس نے وہاں ریشم پر ریاستی اجارداری قائم کر دی۔ سوتی اور ریشمی کپڑے کی صنعت کے علاوہ قالین کی بنائی کی صنعت پورے ہندوستان میں تھی۔ دہلی، آگرہ، بہار میں داؤد نگر اور اوبرا، لاہور، ملتان، فتح پور سیکری، مرزاپور اور جون پہر قالین کی بنائی کے اہم مراکز تھے۔ اس کے علاوہ جنوب ہندوستان میں وارانگل، مسولیپٹَم قالین بُنائی کے لئے مشہور تھے۔ اکبر نے شاہی کارخانے میں ایرانی قسم کے قالین کے بعد ریشمی قالینوں کی صنعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ جبکہ شاہجہاں کے دور میں کشمیر اور لاہور قالین بُنائی کے اہم مراکز تھے۔

14.2.4 اُونی کپڑے (Wollen Textiles)

مغل دور میں اُون بھی ایک اہم خام مال تھا جس کا استعمال کپڑے بنانے کے لئے کیا جاتا تھا۔ لیکن ہم عصر مأخذ سے اون سے تیار کردہ کپڑوں کے بارے میں زیادہ ذکر نہیں ملتا۔ اگرچہ ابوالفضل نے اُونی کمبل کا ذکر کیا ہے، لیکن تمام دستیاب حوالے سے صرف شال اور قالین کے بارے میں ہی علم ہوتا ہے۔ اونی صنعت میں سب سے مشہور کشمیر کی شال تھی جو پوری دنیا میں برآمد کی جاتی تھی۔ فرانسیسی سیاح، بَرنیر نے شال کا ذکر کشمیر کی سب سے اہم صنعت کے طور پر کیا ہے۔ حالانکہ کشمیری شال میں استعمال ہونے والا باریک اُون تِبّت سے لایا جاتا تھا۔ اگرچہ بادشاہ اکبر نے لاہور میں اون کی صنعت کو فروغ دیا لیکن لاہور میں تیار کردہ شال کشمیری شالوں کے معیار سے مختلف تھے۔ کشمیری شالوں کو تیار کرنے کی کوشش شمالی ہندوستان کے کئی شہروں، جیسے پٹنہ، آگرہ اور لاہور میں کی گئی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس عہد میں اعلی طبقے کے لئے عمدہ قسم کے اونی کپڑے عام طور سے یوروپین تاجروں کے ذریعہ فراہم کئے جاتے تھے۔ جبکہ کمبل تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں اُون سے تیار کئے جاتے تھے۔ دوسرے ملبوساتی اشیاء میں کپاس کی دَری، ریشم اور اون کے قالین، خیمے اور لحاف وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام اشیاء میں قالین کی بُنائی اونی صنعت کی ایک اہم شاخ تھی۔ فرانس کے مرسیلے شہر میں اونی کپڑے کی صنعت کی ترقی کے بعد ہندوستانی کشمیری

شالوں کی مانگ میں کمی آئی۔

14.2.5 نیل کی کھیتی اور صنعت (Indigo Cultivation and Industry)

زراعت پر مبنی صنعت میں نیل کی صنعت بھی کافی مشہور تھی۔ کپڑوں کی رنگائی میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مانگ نہ صرف ہندوستان میں تھی بلکہ اسے بیرونی ملکوں کو بھی بڑے پیمانے پر برآمد کیا جاتا تھا، کیونکہ یوروپ میں اب تک مصنوعی رنگائی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا سوتی کپڑوں کی رنگائی کے لیے یوروپ میں نیل کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی۔ مغل دور میں نیل سب سے اہم نقدی فصلوں میں سے ایک تھی۔ اس کی کاشت اَلوَر (میوات)، بَیانا (آگرہ کے قریب ایک مقام)، سَہون (سندھ)، تلنگانہ اور احمد آباد کے سَرکھیج کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی۔ حالانکہ موٹے قسم کی نیل پورے ہندوستان میں اُگائی جاتی تھی۔ کورومنڈل کے ساحلی علاقے میں موجود ناگیوانچ اچھے قسم کی نیل تیار کیا جاتا تھا۔ حالانکہ کورومنڈل کے جنوبی علاقے میں کمتر معیار کی نیل تیار کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بیجاپور کے دابھول اور وینگورلا میں بھی تیار کی جاتی تھی۔ نَینسی اور سترہویں صدی کے انگریز تاجر، پِیٹر منڈی (Peter Mundy) نے ذکر کیا ہے کہ راجستھان کے میڑتا کے علاقے میں بھی نیل کی کاشت ہوتی تھی۔ بادشاہ جہانگیر کا ہم عصر، پیلسارٹ نے بَیانا میں نیل کی کاشت کی تفصیل سے ذکر کیا ہے، جس میں انہوں نے نیل نکالنے کے عمل کو بھی بیان کیا ہے۔ پودے سے نیل نکالنے کا عمل کافی آسان تھا۔ سب سے پہلے پودھوں کی ڈنٹھلیاں پانی میں ڈالا جاتا تھا، ڈائی پانی میں گھُل جانے کے بعد پانی کو ایک دوسرے ٹب میں کر دیا جاتا تھا، جہاں ڈائی کو ٹب کے نچلے حصے میں بیٹھنے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اس عمل کے بعد اسے کیک کی شکل میں خشک کیا جاتا تھا۔ نیل نکالنے کا یہ طریقہ زیادہ تر گاؤں میں کسان کیا کرتے تھے۔

14.2.6 کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی (Dyeing and Printing of Textiles)

مغل ہندوستان میں سوتی کپڑے کی صنعت کی وجہ سے آزادانہ طور پر کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی کی صنعت کی بھی خوب ترقی ہوئی۔ رنگائی چھپائی کی کاریگری اور فن کے بارے میں آئین اکبری میں بہت کم تفصیلات ملتے ہیں، جبکہ اس فن سے متعلق اٹھارویں صدی کی دو کتابوں، نسخہ خلاصہ مجربات اور منشی ٹیک چند بہار کی کتاب، بہار اعظم میں تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آنند رام مخلص کی کتاب مرآت الاصطلاح میں رنگائی کے لئے دہلی میں استعمال ہونے والا بندھنا طریقہ کار بھی ذکر ملتا ہے۔ رنگائی کے اس طریقہ کار میں کپڑے کے کچھ حصے کو باندھ کر رنگا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار 'باندھنا' یا 'گلبدن' کہا جاتا تھا۔ مغل دور میں احمد آباد چھپے ہوئے رنگین سوتی کپڑے کے لئے مشہور تھا۔ دکن میں برہانپور کپڑے پر چھپائی اور مصوری کا ایک اہم مرکز تھا۔ اسی فن کے لئے احمد آباد کے نزدیک محمود آباد اور جنوب کے مسولیپٹم بھی مشہور تھے۔ شمالی ہندوستان میں پٹنہ، بنارس، لاہور، ملتان، الہ آباد، دریا آباد، خیر آباد بھی چھپے ہوئے رنگین کپڑوں کے اہم مراکز تھے۔ رنگین کپڑوں پر اصلی یا نقلی سونے چاندی کے بیل بوٹے اور پتیوں کی چھپائی کے لئے لکھنؤ اور فرخ آباد خاص طور سے مشہور تھے۔ اس کے علاوہ تن زیب یا چِکن کے کاریگری کے لئے ململ جیسے پتلے کپڑے پر بھی قسم قسم کے بیل بوٹے چھاپے جاتے تھے۔ چھپائی عام طور سے لکڑی کے ٹھپّوں

سے کی جاتی تھی۔ منشی ٹیک چند بہار نے اس طریقہ کار کو "کالِب' کہا ہے۔

14.2.7 شکر کی صنعت (Sugar Industry)

آج کی طرح مغل ہندوستان میں بھی گنے کی کاشت بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، جس سے پورے ملک لئے شکر تیار کی جاتی تھی۔ شکر شہری صنعت نہ ہو کر خاص طور سے ایک دیہی صنعت تھی لیکن اس کا استعمال شہری علاقوں خاص طور سے تجارت کے لئے بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ گنّے کی کاشت شمالی ہندوستان کے تقریبا تمام علاقوں میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، اسی لئے آئین اکبری میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ابوالفضل نے گنے سے تیار کردہ چینی کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے۔ گڑ، باریک دانے والی سفید شکر اور مہنگی کینڈی جس کو مشری کہا جاتا تھا جو ملک کے کئی حصوں میں تیار کیا جاتا تھا۔ بنگال کا سستی چینی پیدا کرنے میں نمایاں مقام تھا۔ گڑ ان تمام علاقوں میں تیار کیا جاتا تھا جہان گنّے کی کاشت ہوتی تھی اور اس کا استعمال مقامی طور پر کیا جاتا تھا۔ حالانکہ باریک دانے والی سفید شکر اور مشرِی کینڈی بنگال، اُڑیسہ، احمد آباد، لاہور، ملتان اور شمالی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں تیار کیا جاتا تھا۔ لال یا بھورے رنگ کی شکر کے لئے احمد آباد مشہور تھا، جبکہ قیمتی مشرِی کینڈی کی پیداوار لاہور کے آس پاس کے علاقوں میں ہوتا تھا۔ سترہویں صدی میں ہندوستان کی سیاحت کرنے والے دو سیاح، رِچرڈ اِسٹیل اور جان کراتھرِ (Richard Steel and John Crowther) کا بیان ہے کہ 'آگرہ اور لاہور کے درمیان تمام علاقوں میں بڑے پیمانے پر بھورا (پاؤڈر شکر) تیار کیا جاتا تھا۔' سرکار حصار فیروزہ میں اعلی معیار کی شکر بنائی جاتی تھی۔ ابوالفضل نے پاؤڈر شکر کی قیمت فی مَن تقریبا 128 دام جبکہ مشری کی قیمت فی مَن 220 دام بتایا ہے۔ شکر کی بڑے پیمانے پر پیداوار کا اندازہ غیر ملکوں کو شکر کی برآمد سے بھی لگایا جاسکتا تھا، مثلاً ہالینڈ ہندوستان سے شکر درآمد کرنے والا ایک بڑا ملک تھا۔ 1630 میں صرف بنگال سے 300000۔350000 آئی بی شکر فارس کو سالانہ برآمد کیا تھا۔ سترہویں صدی میں دکن کے بارے میں لکھتے ہوئے، تھیونوٹ نے کہا تھا کہ ہر کسان جو گنّے کی کاشت کرتا تھا اس کی اپنی بھٹّی تھی۔ گنّا سے شکر نکالنے کین پریس کا طریقہ کار استعمال کیا جاتا تھا جس میں انسانی یا جانوروں کی طاقت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جب کہ گڑ کو کڑھائی یا کھلی بھٹّی میں ابال کر تیار کیا جاتا تھا۔ ابالنے کے عمل کے دوران ہی مختلف قسم اور معیار کا شکر اور گڑ حاصل کیا جاتا تھا۔

14.2.8 تیل کی صنعت (Oil Industry)

تیل نکالنے کی صنعت میں بھی زیادہ تر گاؤں کے لوگ شامل تھے۔ تیل نکالنے کے لیے گنے کی طرح دستی یا جانوروں سے چلنے والے مشینوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس پیشہ سے منسلک ایک خاص ذات تھی جسے تیلی کہا جاتا تھا۔ تیل نکالنے کے بعد کھلی جانوروں کے کھانے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ عہدِ وسطیٰ میں تیل نکانے کی صنعت بھی گڑ کی صنعت کی طرح تجارتی حیثیت تک پہنچ گئی تھی۔ لاہور میں تیل نکالنے کے پیشہ کو اختیار کرنے والوں کے لئے الگ وارڈ تھا۔ تیل کا استعمال چراغ جالانے کے لئے کیا جاتا تھا۔ چراغ جلانے کی اہمیت اس قدر تھی کہ مغل بادشاہوں نے مسجدوں اور مندروں میں چراغ جالانے لے لئے مدد معاش دیا کرتے تھے۔

14.3 معدنیات کی صنعت (Minerals Industry)

ہندوستان کی سولہویں اور سترہویں صدیوں میں بہت گہری کان کنی نہیں کی جاتی تھی، لیکن معدنیات کے حصول کے لئے سطحی کان کنی کی جاتی تھی۔ مؤرخین کے مطابق ہندوستان کی معیشت کے شعبوں میں سے ایک ذیلی شعبہ معدانیات کی صنعت تھی۔ معاشی مؤرخ، ڈبلیو۔ایچ۔مورلینڈ نے اس کے غیر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ یہ کافی حد تک معدنیات کے وسائل ناکافی ہونا بتایا ہے۔اس کے علاوہ گہری کان کنی کی تکنیکیوں سے ناواقفیت کا ہونا بھی معدنیات کی صنعت کی کمزوری کی ایک وجہ رہی ہوگی۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں نمک، شورہ، امونیا نمک، گندھک اور سُھاگہ اہم معدنیات تھے۔ سُھاگہ شمالی بہار کے پہاڑی علاقوں سے حاصل کیا جاتا تھا، جبکہ تھانیسر امونیا نمک کے لئے جانا جاتا تھا۔ حالانکہ گندھک ہر جگہ سے حاصل کیا جاتا تھا اور اس سے وابستہ گھریلو اور دیہی صنعتیں کافی ترقی پذیر تھی اور عوام کو ضرورتوں کو بخوبی پورا کرنے کی استطاعت رکھتی تھیں۔

14.3.1 نمک (Salt)

نمک پیدا کرنے والے دو اہم علاقوں میں صوبہ اجمیر میں سامبھر جھیل اور لاہور میں شمس آباد تھے۔ ان دونوں جگہوں سے ہندوستان کے دیگر تمام حصوں میں نمک کی بڑے پیمانے پر اندرونی تجارت ہوتی تھی۔اس کے علاوہ راجستھان کے ڈِڈوانہ اور مارواڑ کے پچپدرا میں کھروال برادری کے لوگ نمک پیداوار کے پیشہ سے منسلک تھے۔ نینسی رِپورٹس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ صرف پچپدرا علاقے میں 300 سے 325 نمک کی کانیں تھیں۔ مغربی راجستھان میں نمک نکالنے کے لئے دو طریقہ کار استعمال کئے جاتے تھے۔ پہلا طریقہ گڈھا کھود کر نمک نکالا جاتا تھا جبکہ دوسرے طریق میں زمین کے ایک حصے پر پانی پھیلا کر نمک حاصل کیا جاتا تھا۔ نمک کی تجارت میں دو برادری بنجارا اور بنیا شامل تھے۔ نمک کو بنجارے مارواڑ سے پنجاب اور مختلف علاقوں میں مقامی بنیوں کے ذریعے پہونچاتے تھے۔ ابوالفضل نے بھی ان بنجاروں کا ذکر کیا ہے جو نمک کو بہار لاتے تھے۔ بی۔ایل۔ بھدانی کے مطابق 1660 کی دہائی میں راجستھان میں نمک کارکنوں کی تعداد تقریبا 2922-2956 تھی جو 1891 میں گھٹ کر 828 ہوگئی تھی۔ سالانہ آگرہ سے بنگال تک نمک کی ایک بڑی مقدار 10000 ٹن کی تجارت ہوتی تھی۔ گجرات کے ساحل پر موجود مقبول آباد، سرکار بھروچ، نمک کی پیداوار کا اہم مرکز تھا۔ کھمبھات اور سورت میں بخارات (evaporation) کے ذریعہ کھارے پانی سے نمک تیار کیا جاتا تھا۔ نمک کشمیر جیسے دور دراز علاقوں میں یہیں سے جاتا تھا۔ سجان رائے بھنڈاری نے اپنی کتاب خلاص التواریخ میں نمک کی کانوں کا ذکر کیا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں بھی نمک تیار کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر کونکن کا علاقہ نمک کے پیداوار کے لئے بھی جانا جاتا تھا۔ پین، پنویل، نگوتھن، ریودنڈا اور تھانے نمک کی پیداوار کے مشہور مراکز تھے۔ ان علاقوں میں کسان ہی مقامی سطح پر نمک تیار کرتے تھے۔

14.3.2 شورا (Saltpetre)

شورا معدنیات میں سے ایک اہم صنعت تھی جسکی یوروپ میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ قرون وسطی میں شورہ کو بارود اور پانی کو ٹھنڈا

کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسکی زیادہ قیمت ہونے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ عام لوگوں کے لئے دستیاب نہیں تھا۔ بہار کا شورا کو بارود کے لئے بہترین سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بہار میں پٹنہ اور سارن اس کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ حالانکہ احمد آباد اور آگرہ اس کی پیداوار کے دوسرے اہم مراکز تھے۔ اسی طرح احمد آباد سرکار میں چالا بابرہ اور مالپور کا مقام شورہ کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ مغربی راجستھان میں یہ ریاستی سطح پر استعمال ہونے والی چیز تھی۔ راجستھان کے جالور اس کا ایک اہم مرکز تھا۔ پیلسارٹ نے اس کے نکالنے کے عمل کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ زمین میں پائے جانے والے نمک سے شورہ نکالنے کا بہت ہی آسان طریقہ تھا۔ زمین پر اُتلی ذخائر بنائے جاتے اور نمکین زمین کو پانی میں ملا دیا جاتا تھا۔ نمک پانی میں مل جانے کے بعد بچا ہوا مواد نیچے بیٹھ جاتا تھا۔ اسی نمکین پانی کو بڑے برتن میں ابالنے کے دوران پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا اور شورا تیار ہو جاتا۔ شورا بنانے کے لیے ہندوستانی کاریگر زیادہ مٹّی کے برتن کا استعمال کرتے تھے۔ جبکہ یوروپین تامبے اور لوہے کا برتن استعمال کرتے تھے۔ ٹیورنیئر کا بیان ہے کہ ہالینڈ سے درآمد شدہ برتن میں پانی ابالتے تھے۔ ایک مأخذ کے مطابق تو سال 1688 میں تقریباً دو لاکھ من کچے شورے کی پیداوار صرف بہار میں ہوئی۔

14.4 دھاتوں کی صنعت و دستکاری (Metal Industry and Crafts)

14.4.1 سونا اور چاندی (Gold and Silver)

در حقیقت ہندوستان میں مختلف دھاتیں جیسے سونے، چاندی، ہیرے، جستا، تامبا، لوہا وغیرہ پائی جاتی تھیں۔ سونے اور چاندی کے زیورات ہندوستان میں کافی مشہور تھے لیکن ان دونوں دھاتیں کی ہندوستان میں پیداوار کم ہونے کی وجہ سے بیرون ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا۔ یوروپین سیاحوں کی طرف سے جنوب میں سونے کی پیداوار پر ان کی خاموشی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اکبر کے دور میں میسور کی سونے کی کانوں میں کام رک گیا تھا۔ اس عہد میں کماؤں کی پہاڑیوں سے سونا کم مقدار میں حاصل کیا جاتا تھا۔ سترہویں صدی کا ایک انگریز سیاح رالف فچ بیان کرتے ہیں کہ پٹنہ میں لوگ نے ریت کے ذخائر کھود کر سونا نکالتے تھے۔ سوناگنگا اور اس کے معاون ندیوں کی ریت سے بھی نکالا جاتا تھا۔ جبکہ چاندی راجپوتانہ کے اُدے پور میں واقع جوار کی کانوں سے حاصل کی جاتی تھی۔ یہاں چاندی جستے کے ساتھ خام دھات کے طور پر حاصل کی جاتی تھی۔ چاندی کے حصول میں شمالی بَرما میں واقع باڈبِن کی کانوں کو خاص اقتصادی اہمیت حاصل تھی۔ ابوالفضل نے کماؤں کی پہاڑیوں میں سونے اور چاندی کی کانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چاندی کی کانوں کی کچھ باقیات سرمور کی پہاڑیوں میں پائے جاتے تھے۔ لیکن مغل دور میں سونا چاندی زیادہ تر تجارت کے ذریعے ہندوستان آیا۔ اس کا استعمال زیادہ تر زیوارات بنانے کے لئے کیا جاتا تھا، اس کی وجہ سے زیورات کی دستکاری کی ترقی ہوئی۔ بَرنیَر کہتا ہے کہ کوئی بھی ہندوستانی زیوارات کی دستکاری پر یقین نہیں کرے گا، لیکن ان اشیاء بہترین کاریگری کسی بھی یوروپین سنار سے زیادہ بہتر تھی۔

14.4.2 ہیرے (Diamonds)

معدنیات کے پیداوار میں ہیروں کی پیداوار کا خاص ذکر ملتا ہے۔ عہدِ وسطی کے ہندوستان میں چھوٹا ناگپور ہیروں کے لئے جانا جاتا

تھا، جس جی وجہ سے جہانگیر نے 1612 اور 1615 میں دو فوجی مہمات بھیجے تھے۔ دُر جنشال سے ہیروں کی بہت بڑے مال غنیمت حاصل ہوئی تھی۔ ٹیوَرنیَر نے چھوٹاناگپور کے سُمیل پور (لوہردگا ضلع) میں ہیروں کی کان کنی کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ بہار کا کوکرادیش ہیروں کے کانوں کے لئے مشہور تھا۔ جہاں کے گورنر ابراھیم فتح جنگ نے بادشاہ کو نو ہیرے بھیجے تھے۔ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کی سب سے اہم ہیروں کی کانیں راؤلکونڈہ میں تھیں اور گولکڈہ کی قطب شاہی سلطنت کی سب سے اہم ہیروں کی کانیں کرشناندی کے کنارے کلور میں تھیں۔ دنیا کا مشہور ہیرا کوہ نور اسی کان سے ملا تھا۔ ان علاقوں میں جہاں ہیرے پائے جاتے تھے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کام کرتی تھی۔ اسی لئے یہ صنعت اعلی سطحی تنظیم کی علامت تھی۔ سترہویں صدی دوران صرف کلور کان میں 30000 سے 60000 مزدور کام کرتے تھے۔ 1680 میں گولکُنڈا کی ہیروں کی کانوں سے 1 کروڑ 20 لاکھ روپئے کی آمدنی ہوئی تھی۔ ٹیوَرنیَر پیشے سے خود ایک جوہری تھا، اس نے گولکنڈا میں اس صنعت کی تنظیم کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس نے کانوں سے ہیرے نکالنے کے تین طریقہ کار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

14.4.3 جستہ، تامبا اور لوہا (Zinc, Copper and Iron)

ان تینوں دھاتوں کی پیداواری صلاحیت کے مطابق موصول ہونے والے حوالوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہندوستان کی کانوں سے پیدا ہونے والی پیداوار مقامی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ ریاست کو تامبے کی مسلسل فراہمی کو برقرار رکھنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ کیونکہ یہ سکے بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔ تامبا کماؤں کی پہاڑیوں، راجستھان اور صوبہ لاہور میں واقع، سکھیت منڈی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ سترہویں صدی میں ڑاجستھان اور وسط ہندوستان میں اراولی پہاڑی کی کانوں سے تانبا حاصل کیا جاتا تھا لیکن مقامی رسد کی طلب پوری نہ ہونے کی وجہ سے اسے یوروپین ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا۔ سوجَت، ٹوڈا بھیم، بَیراٹ، سندھانہ، اُدے پور، کوٹ پُتلی اور ناگور راجستھان میں موجود اہم تامبے کی کانیں تھیں۔ ان تمام دھاتوں میں سب سے اہم اور وسیع پیمانے پر استعمال ہونے والی معدنیات لوہا تھا، جو زیادہ تر کاشتکاری کے اوزار اور فوجی ہتھیار بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔ لوہا زیادہ تر مقامی سطح پر حاصل کیا جاتا تھا۔ یہ بنگال، کشمیر، گجرات، اجمیر لاہور، کالنجَر اور گوالیر میں تیار کیا جاتا تھا۔ لوہا زیادہ تر پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا تھا۔ ہمالیہ (کماؤں اور شوالک) کے آس پاس کے پہاڑی سلسلوں میں بھی لوہے کی کانیں تھیں۔ دکن لوہا ایشیا کے مشرقی اور وسطی ممالک کو برآمد کرتا تھا۔ مسولی پٹنم، پیٹاپولی، پولی کٹ وغیرہ لوہے کی برآمد کے اہم مراکز تھے۔ سرکار سورت کے ساحلی چِکھلی میں بھی لوہے کی کانیں تھی۔ لوہے کی مصنوعات میں، ہندوستان کو اپنی انتہائی عمدہ قسم کے تلواروں کے لئے خاص شہرت حاصل تھی۔ کالنجَر، بنارس، لاہور، سیالکوٹ، گولکنڈہ، گجرات میں بھُج، اون اور سروہی تلوار بنانے کے لئے مشہور تھے۔ پاٹن اپنی تلواروں کے لئے بھی جانا جاتا تھا کیونکہ وہاں کے کنوؤں کے پانی کی وجہ سے لوہے کو کافی سختی ملتی تھی۔ کورِج کے مشہور تلواریں کچھ کے علاقے سے حاصل کردہ لوہے سے اسٹیل میں تبدیل کر کے بنائی جاتی تھی۔ کماؤں اپنی تلوار اور خنجر کے لئے جانا جاتا تھا۔ اِندَلوائی (نظام آباد کے نزدیک) تلواروں، خنجروں اور نیزوں کے بنانے کا ایک اہم مرکز تھا۔ یہاں زیادہ تر کالا گھاٹ پہاڑیوں سے حاصل شدہ خام لوہا استعمال ہوتا تھا۔ احمد آباد اپنی اسلحہ سازی کے لئے مشہور تھا۔ بھروچ، سورت، نَوساری، گندیوی، دَمَن میں جہاز سازی کی صنعت نے ترقی کی، یقیناً یہ ترقی گجرات میں پیدا ہونے والے لوہے کی وجہ سے تھی۔ میواڑ اور سیالکوٹ میں توڑے دار بندوق تیار کئے جاتے تھے۔

14.5 لکڑی کی صنعت (The Wood Industry)

لکڑی کی صنعت نے بڑے پیمانے پر مختلف قسم کی دستکاری کی بنیار کھی۔ اس سے بنائے جانے والے سامان میں پالکی اور بیل گاڑی قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں سامان مختلف انداز سے بنائے جاتے تھے جسے امیر طبقے کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ انہیں تراش کر نقش و نگاری کے ذریعے سجایا بھی جاتا تھا۔ لکڑی کا استعمال ایک بڑے پیمانے پر کشتی اور سمندری جہازوں کو بنانے کے لئے کیا جاتا تھا۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ ہندوستان ایک طویل ساحلی علاقے سے گھرا ہوا ملک ہے جہاں بڑی تعداد میں ندیاں بہتی ہیں۔ لہٰذا مختلف قسم کی کشتیاں بنائی جاتی تھی۔ تفریحی سفر کے لیے چھوٹی کشتیوں سے لے کر سامان کی ڈھلائی کے لیے بڑے سمندری جہاز بنائے جاتے۔ بحرِ عرب کے ساتھ ساتھ خلیج بنگال کی بدرگاہیں جیسے تھٹّا، سورت، بیسین، گوا، کرانور، کوچن، مسولیپٹم اس کے پڑوس میں نورس پور، ہریہرپور، ستگاؤں اور چٹاگاؤں جہاز سازی کے اہم مراکز تھے۔ جب یوروپین تاجروں کی تجارتی سرگرمیاں تیز ہوئیں تو وہ لوگ انہیں جگہوں پر اپنے جہاز کی مرمت کراتے تھے۔ ان لوگوں نے ہندوستانی بحری جہازوں کو مشرقی سمندری علاقوں کے لیے بہتر بنایا۔ اسی لیے وہ لوگ ہندوستان میں تیار کردہ جہاز خرید تے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سترہویں وار اٹھارویں صدی کے اوائل میں جہاز سازی کی صنعت کو کافی فروغ ملا۔ لکڑی کے دیگر استعمال مثلاً دروازے، کھڑکیاں، گھریلو فرنیچر، بکس وغیرہ کو بنانے میں ہوتا تھا۔ کشمیر اور کرناٹک لکڑی کے دستکاری اور فنکارانہ اشیاء کے لئے مشہور تھے۔ جبکہ کمان اور تیر سازی کے لیے ملتان، سرہند اور سورت اہم مراکز تھے۔

14.6 کاغذ کی صنعت (The Paper Industry)

کاغذ کی دستکاری بھی اس عہد میں ایک اہم صنعت تھی۔ ڈچ فیکٹری کا ڈائریکٹر، ٹُوسٹ جان وَین نے 1638 میں ذکر کرتے ہیں کہ احمد آباد کو کاغذ تیار کرنے کے واسطے خام مال کے لئے مالا بار پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ احمد آباد، دولت آباد، لاہور، سیالکوٹ، پٹنہ اور بہار شریف کاغذ کی صنعت کے اہم مراکز تھے۔ احمد آباد میں کئی اقسام کے کاغذ تیار کئے جاتے تھے جسے عرب، ترکی اور ایران کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کشمیر کا کاغذ بھی کافی مشہور تھا۔ شمالی ہندوستان کے کئی جگہوں پر مقامی ضروریات کے لئے کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ جبکہ جنوبی ہندوستان میں کاغذ کی صنعت بہت ہی محدود تھی۔ عہد وسطی کے ہندوستان میں خاص طور سے سیالکوٹ اور سرہند میں مختلف اقسام کے کاغذ بنائے جاتے تھے۔ مانسدھی، کھرپوری، جہانگیری اور سیالکوٹی نامی کاغذ کی قسمیں اپنے اچھے معیار کے لئے مشہور تھے۔ اسی طرح کالپی (موجودہ فرخ آباد) کا "مہاجال" نامی کاغذ اعلی معیار کا تھا۔ اس کے علاوہ بانسی، تُلوت، شمی سادہ، ریشمی نامی کاغذ بھی استعمال میں تھے۔ اس کا استعمال دولت مند تاجر، مخطوطہ نگار اور بنیادی طور پر سرکاری افسران کیا کرتے تھے۔ ابتداء میں تو مغل پینٹنگ میں مصوری کے لئے ایرانی اور اصفہانی کاغذ کا استعمال کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں ہندوستان میں تیار کردہ کاغذ کا استعمال کیا جانے لگا۔ ابوالفضل کے مطابق آگرہ اور لاہور کے شاہی کارخانوں میں افسران کے استعمال کے کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ کاغذ زیادہ اکثر ہاتھ سے بنایا جاتا تھا جو موٹے قسم کے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے بانس کی چھال، پُرانے چیتھڑے اور پُرانے کاغذ کی ردّی سے بھی بنایا جاتا تھا۔

14.7 چمڑے کی صنعت (The Leather Industry)

چمڑے سے زین (چمڑے کی بالٹی)، گھوڑے کی لگام، زین، چابُک اور جوتے بنائے جاتے تھے۔ چمڑے سے تیار کردہ سامان زیادتر دہلی، لاہور، آگرہ اور تھٹّا جیسے شہروں میں فروخت کئے جاتے تھے۔ سرہند ترکش اور جوتے کے لئے مشہور تھا۔ سمبھل میں گینڈے کی کھال سے اعلیٰ قسم کے ڈھال بنائے جاتے تھے، جبکہ کیمبے میں کچھوئے کے کھال سے ڈھال بنائے جاتے تھے۔

14.8 متفرق صنعتیں (Miscellaneous Industries)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں دستکاریوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں ان تمام کی تفصیلات ممکن نہیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ ہر علاقے کی اپنی کچھ مخصوص دستکاری تھی، جس کے لیے وہ شہر یا علاقہ مشہور تھا۔ یہاں صرف چند اہم دستکاریوں کا ذکر کیا جائے گا۔ ان میں سے پتھر کاٹنے، برتن بنانے، شیشے وغیرہ سے سامان تیار کرنے کی دستکاریاں اہم تھیں۔ ہم عصر مأخذ میں مٹی کے برتن کی دستکاری کے بھی حوالے ملتے ہیں، جسے لوگ کھانا پکانے، پانی اور اناج وغیرہ کو ذخیرہ کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ مٹی کے برتنوں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ ہندوستان کے بڑے گاؤں میں کمہار ہوتے تھے جو روزانہ استعمال میں لانے والے برتین بناتے تھے۔ مٹی کے موٹے برتنوں کے علاوہ اچھے قسم کا برتن بھی بنائے جاتے تھے۔ منوچی نے مٹی کے ایسے ظروف کا ذکر کیا ہے جو شیشے سے زیادہ باریک اور کاغذ سے ہلکے ہوتے تھے۔ مارشل نے بھی ہندوستان میں عمدہ قسم کے ظروف دیکھا تھا۔ مٹی سے بنے ٹائل (کھپریل) کا استعمال گھر کی چھتوں میں کیا جاتا تھا۔ دہلی بنارس اور چُنار مٹی کے برتن کے لئے مشہور تھا۔ پٹنہ میں تیار کردہ مٹی کے برتن اتنے اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے کہ اسی موٹائی کا غذ جیسی پتلی ہوتی تھی۔ ان تمام دستکاری کے علاوہ، ہندوستان کے کئی حصوں میں شیشے سے بنائے جانے والے سامان کی صنعت کی بھی موجود تھی۔ ان تمام مصنوعات کے علاوہ، ہندوستانی کاریگر دیگر متفرق اشیاء جیسے صابن، عطر، ہاتھی دانت، خول اور سینگ سے بنے سامان بھی بناتے تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں مختلف قسم کے عطر اور صابن بنانے کے طریقہ کار کا ذکر کیا ہے۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح پور سیکری میں عطر بنانے کا شاہی کارخانہ تھا۔ اس کے علاوہ قنوج اور غازی پور عطر کی صنعت کے لئے مشہور تھے۔ سترہویں صدی میں لکھی گئی ایک کتاب، بیاض خوشبوئی میں بھی صابن اور عطر بنانے کے مختلف طریقہ کار کا ذکر کیا گیا ہے۔ کئی دستکاریاں جنگل پر منحصر تھیں مثلاً لاکھ کا استعمال چوڑیاں، کھلونے، دروازے اور سرخ رنگ بنانے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ لاکھ بنگال، بہار، آسام، اُڑیسہ، مالوا، گجرات، مالابار وغیرہ کے جنگلات سے کیا جاتا تھا۔ بنگال کا لاکھ بہترین سمجھا جاتا تھا۔ لاکھ سے چوڑیاں بنانے کا اہم مرکز سورت تھا۔ اس کا استعمال نقش مہر کے لئے بھی کیا جاتا تھا۔

14.9 شہر کاری (Urbanization)

مسلم حکمرانوں نے نہ صرف نئے شہر اور قصبے بسائے بلکہ قدیم شہروں کو از سر نو تعمیر کر کے ان کو تجارتی، ثقافتی، انتظامی اور صنعتی مراکز کے طور پر فروغ دیا۔ ہر شہر کا عروج اور زوال سیاسی استحکام، صنعتی ترقی، تجارتی امکانات، یا اہمیت جیسے عوامل پر منحصر تھا اس باب میں شہروں کے عروج کے اسباب کے ساتھ کچھ شہروں کے زوال پر مدلل بحث شامل ہے۔

مغل بادشاہ بھی پہلے حکمرانوں کی طرح موجودہ قصبوں اور شہروں کی ترقی کو فروغ دینے اور نئے شہر آباد کرنے میں دلچسپی لیتے تھے۔ طبقات اکبری کا مصنف نظام الدین احمد نے لکھا ہے کہ اکبر کے دور میں تقریباً 120 بڑے شہر اور 3200 قصبے موجود تھے۔ مؤرخین نے مغل دور میں شہر آبادکاری کے لئے کئی وجوہات بیان کئے ہیں۔ ان وجوہات میں شامل کارآمد عوامل بنیادی طور پر چار قسم کے شہری مراکز جیسے انتظامی، مذہبی، فوجی اور بازار کے ظہور کو ظاہر کرتے ہیں۔ انتظامی قصبے وہ جگہ تھی جہاں سے سلطنت کے نظم و نسق چلایا جاتا تھا۔ آگرہ، فتحپور سیکری، لاہور، دہلی، الہ آباد وغیرہ قصبے کے انتظامی زمرے میں شامل ہیں۔ بنارس اور متھرا مذہبی مراکز کے زمرے میں آتے ہیں جو پہلے سے مشہور زائرین کے لئے پرکشش مقامات تھے۔ فوجی شہر وہ کہلاتے تھے جنکی ترقی بنیادی طور پر فوجی چھاؤنی کے طور پر ہوئی جس نے آہستہ آہستے شہری آبادی کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ اٹک اور اسیر گڑھ کے قصبے اس زمرے میں شامل ہیں۔ آخر میں کچھ مقامات ایسے بھی تھے جو ابتدا میں بازار کے طور پر ظاہر ہوئے لیکن بڑے پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں نے ان مقامات کو شہر بنایا۔

مغل ہندوستان کے شہری مراکز بڑے اور چھوٹے شہر لوگوں کی توجہ کے مرکز تھے، کیونکہ عوام کو روزگار فراہم کرتے تھے۔ اس دور کے شہری مراکز میں ہر قسم کے دستکاری اور صنعتی پیداوار جیسے کپڑے کی صنعت، قالین سازی، زیورات، رنگ، تیل، چینی، خوشبو، صابن، کاغذ، سیاہی، شیشہ، ہتھیاروں کی دستکاری، اوزار، گھریلو برتن، ہر قسم کے دھات، لکڑی، پتھر، چمڑے کی دستکاری، ٹکسال، تعمیر، جہاز سازی وغیرہ کے مرکز تھے۔ یہ تمام دستکاری اور صنعت شہری پیشے میں شامل تھیں۔ حالانکہ فنون اور دستکاری کے درمیان ایک فرق تھا۔ اگرچہ ہر شہر میں متعدد دستکاریاں تھیں، لیکن ہر شہر ایک خاص صنعت یا دستکاری سے منسلک تھی۔ مثال کے طور پر احمد آباد، بھروچ، بڑودہ، لاہور، ملتان، تھانے، دکن، مالدہ، قاسم بازار، بُرہانپور، مَسولیپٹنم، کانچیپورم وغیرہ اپنے کپڑوں کے لئے مشہور تھے۔ اسی طرح سرکھیج، کیمبے، بیانا، سری نگر رنگو کے لئے، جبکہ آگرہ، دہلی، سیالکوٹ، لاہور، ہتھیاروں کے لئے، بڑودہ، پٹنہ، بہار شریف، سیالکوٹ، ظفر آباد کاغذ کے لئے جانے جاتے تھے۔ ساحلی شہر جیسے سورت، چٹاگاؤں، نَرسَپور، کیمبے جہاز سازی کے لئے مشہور تھے۔

ان تمام شہروں کے چھوٹے یا بڑے بازار اہم تجارتی مرکز تھے۔ ان میں سے کچھ جیسے دہلی، احمد آباد، لاہور اور جونپور میں درجنوں بازار تھے۔ ہر ایک بازار مختلف قسم کے اشیاء کے لئے مشہور تھے۔ بنارسی داس جونپور کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صرف جونپور میں 52 ہول سیل بازار تھے۔ اور انہیں بازار کی وجہ سے جونپور مشہور تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں دہلی میں 36 بازار تھے، جہاں ہر بیش قیمتی سامان ملتا تھا۔ دہلی کے بازاروں کی کثرت تھی جن میں سب سے مشہور چاندنی چوک کا بازار تھا، اس کو بہت سے مبصرین نے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے ہنگامہ خیز دور میں بھی دہلی کے بازاروں کی رونق برقرار رہی، جیسا کہ مرقع دہلی کے مصنف درگاہ قلی خان نے اس کی تصدیق کی ہے۔ قرون وسطی کے ادبی مآخذ شہری بازاروں کی واضح تفصیل پیش کرتے ہیں: کسی شہر کی تصویر کشی کرتے ہوئے حقیقی یا خیالی طور پر ایک شاعر بازار کی دولت اور فراوانی کی اُتنی ہی آرائشی طریقے سے تعریف کرتا ہے جس طرح وہ بادشاہ کی طاقت اور ان کے محل کی شان و شوکت کی تعریف کرتا ہے۔

14.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مغل دور کے ہندوستان میں زرعی اور غیر زرعی معیشت کافی اہمیت کی حامل تھی۔اس اکائی میں مغل ہندوستان کی زراعت اور غیر زراعت پر مبنی دستکاریوں اور صنعتوں کا ذکر شامل ہے۔اس کے علاوہ خام مال اور ان سے تیار کردہ دستکاری اور صنعتوں کے مراکز اور ان کے طریقہ کار پر گفتگو کیا ہے۔ مندرجہ بالا صفحات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں کپڑوں کی صنعت خاص طور پر سوتی کپڑے کی صنعت کو وسیع پیمانے پر ترقی ملی۔ دیگر صنعت کو بھی جیسے سوتی ریشمی، اونی، چھپائی، رنگائی، چینی، تیل، لکڑی، کاغذ، چمڑے وغیرہ کو فروغ ملا۔ ان صنعتوں اور دستکاری کا مغل ہندوستان کی معیشت اور شہری آبادکاری میں کافی اہم کردار تھا۔ غیر زرعی صنعت میں نمک کی پیداوار گھریلو ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی تھی، جبکہ شورا ایک اور اہم صنعت تھی جسے بڑے پیمانے پر ہندوستان میں تیار کیا جاتا تھا۔ایسا لگتا ہے کہ یہ تمام چیزیں برآمدات کے لئے کافی مقدار میں موجود تھی۔ لوہے اور تامبے سے تیار کردہ سامان بھی کافی مقدار میں تیار کئے جاتے تھے۔ ، جبکہ ان کے بالمقابل سونے اور چاندی کی پیداوار ہندوستان میں کم تھی، اس لیے غیر ملکوں سے اس کو درآمد کرکے ضرورت پوری کی جاتی تھی۔اس عہد کی صنعتی معیشت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان میں جہاز سازی کی صنعت کی بہت ترقی ہوئی۔ چیزوں کو تیار کرنے والے خام مال سے متعلق مندرجہ بالا گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غیر زرعی شعبے میں دستکاریوں کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ انفرادی کاریگر کے ذریعے کی جاتی تھی۔ حالانکہ کچھ شعبوں جیسے شورا اور ہیرے کی کان کنی میں، ہیرے کی تلاش انفرادی طور پر نہیں تھی بلکہ کانوں میں کاریگروں اور مزدوروں کی ایک بڑی تعداد مشترکہ طور پر کام کرتے تھے۔ مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام صنعتوں اور دستکاریوں کے تقریباً ہر بڑے شہر میں بازار تھے کیونکہ بڑے شہروں میں بازاروں کی تعداد کی کثرت تھی۔اس کے علاوہ مغل ہندوستان میں ان صنعتوں کی وجہ سے مختلف شہروں کی ترقی ہوئی اور لاتعداد قصبے شہروں میں تبدیل ہوگئے۔ کچھ شہر تو اپنے مخصوص صنعت کے لئے بہت مشہور ہوئے۔

14.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

بندھنا طریقہ کار : رنگائی کے لئے دہلی میں استعمال ہونے والا بندھنا طریقہ کار۔

چھینٹ : ایسا کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بننے والے سوتی کپڑوں میں سب سے مشہور 'چھینٹ' تھا۔

14.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

14.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سوتی ملبوس تیار کرنے والے چند اہم مراکز کا نام بتایئے۔
2. مغل ہندوستان میں کن مقامات کی نیل اچھی معیار کی تھی؟

3. شورا بنانے کا طریقہ کار کیا تھے؟
4. کس یوروپین سیاح نے گولکنڈا سے ہیرے نکالنے کے طریقہ کار کا ذکر کیا ہے؟
5. سوتی کپڑوں کے کچھ قسموں کے نام بتایئے۔
6. کاغذ کے مختلف قسموں کے نام بتایئے۔
7. کون سی دھات ہندوستان میں سب سے زیادہ پائی جاتی تھی؟
8. جہاز سازی کے مراکز کا نام بتائے۔
9. بہار کے کس مقام سے سب سے زیادہ شورہ حاصل کیا جاتا تھا؟
10. اکبر کے عہد کے کس مؤرخ نے شہروں اور قصبوں کی تعداد بیان کیا ہے؟

14.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغلیہ عہد میں لوہے کی صنعت کی ترقی کے اسباب پر نوٹ لکھیے۔
2. اونی دستکاری کے مراکز اور تجارتی اہمیت پر تبصرہ کیجیے۔
3. دھاگا تیار کرنے کی صنعت پر ٹوٹ لکھیئے۔
4. لکڑی کی صنعت کی مغل عہد میں ترقی کا تجزیہ کیجیے۔
5. ہیرے کی کان کنی پر نوٹ لکھیے۔

14.2.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. زراعت پر مبنی کسی دو صنعت پر گفتگو کیجیئے۔
2. سوتی ملبوس کی صعنت اور اس کی خصوصیات پر ایک تفصیلی مضمون لکھیئے۔
3. عہدِ وسطیٰ اور مغلیہ عہد میں متفرق صنعتوں کی افادیت پر نوٹ لکھیے۔
4. ہندوستان میں پائے جانے والے دھاتوں کی صنعتی ترقی پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
5. شہری آبادکاری کے مختلف اسباب کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

14.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).

3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
4. Chandra, Satish, *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans*, Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta, 1986.
5. Chitnis, K.N., *Medieval Indian History*, Atlantic Publishers and Distributors, New Delhi, 2008 (first pub. in 2003).
6. Habib, Irfan and Tapan Raychaudhuri eds., *The Cambridge Economic History of India*, *Vol. 1*, Cambridge University Press, Cambridge, 1982.
7. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
8. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
9. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1997).
10. Hasan, Saiyid Nurul, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, New Delhi, 1990 (first pub. in 1973).
11. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
12. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black, Ranikhet, 2016.
13. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*, *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers Pvt., Ltd., New Delhi, 1995 (first pub. 1983).
14. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. in 1923).
15. Moosvi, Shireen, *The Economy of the Mughal Empire, c. 1595*: *A statistical Study*, Oxford University Press, New Delhi, 1987.
16. Naqvi, Hameeda Khatoon, *Urban Centres and Industries in Upper India*, *1556-1580*, Asia Publishing House, Bombay, 1968.
17. Richards, Jhon F., *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, New Delhi, 2016.
18. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *Mughals and Franks*, Oxford University Press, New Delhi, 2014 (first pub. in 2005).
19. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *From the Tagus to the Ganges*, Oxford University Press, New Delhi, 2011 (first pub. in 2005).
20. Vanina, Eugenia, *Urban Crafts and Craftsmen in Medieval India* (Thirteenth-Eighteenth Centuries), Munshiram Manoharlal Publisher, New Delhi, 2004.

اکائی 15۔ بڑے صنعتوں کی تنظیم

(Major Industries: Organization)

اکائی کے اجزاء

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 صنعت اور تنظیمیں

15.3 دادنی نظام

15.4 مغل کارخانوں کا نظام

15.4.1 بیوتات

15.5 عہدہ داروں کے طبقے

15.5.1 دیوان بیوتات

15.5.2 مشرف کل وجز

15.5.3 داروغہ

15.5.4 تحصیلدار

15.5.5 مستوفی

15.5.6 داروغہ کچہری

15.5.7 نزیر

15.6 کام کرنے کا انتظامی طریقہ کار

15.7 کارخانوں سے متعلق شاہی مفادات

15.8 سولہویں اور سترہویں صدیوں میں کاریگروں کی حالت

15.9 مغل کارخانوں کے اثرات اور زوال

15.10 اکتسابی نتائج

15.11 کلیدی الفاظ
15.12 نمونہ امتحانی سوالات
15.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید (Introduction)

مغل دور میں زرعی اور غیر زرعی پیداور کی مختلف صنعتوں کی ترقی ہوئی۔ زرعی پیداوار پر مبنی بڑی صنعتوں میں کپڑوں سے متعلق سوتی، ریشمی، اونی، دگھاگے کی کتائی اور بُنائی کے علاوہ نیل، رنگائی چھپائی، شکر اور تیل کی صنعتیں شامل تھیں۔ جبکہ غیر زرعی صنعتوں میں معدنیات (نمک، شورا)، دھاتوں کی دستکاریاں (سونا، چاندی، ہیرے، جست، تامبااور لوہا) لکڑی، کاغذ، چمڑے وغیرہ کی صنعتیں شامل تھی۔ ان تمام صنعتوں اور دستکاریوں کے اپنے خاص اہم مراکز بھی تھے جس نے شہر آباد کاری میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان تمام صنعتوں اور ان کے مرکز کے بارے میں آپ نے اکائی 14 میں تفصیلاً مطالعہ کیا ہے۔ چونکہ ان صنعتوں اور دستکاریوں کی پیداواری نظام بھی مغل عہد میں موجود تھا۔ اس اکائی میں ہم اپنی پیداواری تنظیموں کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل عہد کے صنعت کے پیداواری نظام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- دادنی نظام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغل کارخانوں کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر سکیں گے۔

15.2 صنعت اور تنظیمیں (Industry and Organisations)

جہاں تک غیر زرعی پیداوار اور صنعتوں کی تنظیم سے متعلق کچھ وسیع خصوصیات کا تعلق ہے تو پورے بر صغیر میں ان کی کافی یکسانیت تھی۔ زیادہ تر دستکاریوں میں دیہی کردار ہوتا تھا۔ ذات کے نظام نے پیداواری عمل میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ گاؤں کی برادری (village community) سے کچھ خاص کاریگر اور دستکار منسلک تھے۔ غیر زرعی پیداوار چار قسم کے کاریگروں پر مشتمل تھیں۔ گاؤں کے کاریگر، خود مختار کاریگر جو اپنے ذاتی آلے اور سرمائے سے اشیاء بناتے تھے اور دادنی یا پٹنگ آؤٹ سسٹم (Putting Out System) جس کے تحت کاریگروں کو پیسہ یا خام مال دیا جاتا تھا اور شاہی کارخانوں میں کام کرنے والے کاریگر تھے۔ دراصل دور وسطی میں گاؤں ہی صنعتی پیداواری کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ ایسے کاریگر گاؤں کی برادری سے منسلک تھے جسے مراٹھ سلطنت میں بلوطہ دار اور جنوبی ہندوستان میں آیا گر کہتے تھے۔ وہ تمام کاریگر پورے گاؤں کے لئے اشیاء تیار کرتے جو بازار میں فروخت کے بجائے گاؤں کے لوگوں کے

استعمال کے لئے ہوتے تھے۔ پھر بھی ہر ہنر مند کاریگر اور دستکار اپنا سامان قصبوں کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ جن میں جوتے، کمبل، کپڑا، لکڑی سے بنے ہوئے سامان وغیرہ شامل تھے۔ گاؤں کی برادری (Village Community) اور اس کے فرائض و حقوق کے بارے میں اکائی 13 میں ہم پڑھ چکے ہیں۔

عہد وسطی میں شاید ہی کوئی باقاعدہ منظم افرادی قوت (labor force) کا تصور تھا۔ انفرادی کاریگر اپنے خاندانی افرادی قوت اور اپنے گھروں میں موجود اپنے سرمائے سے چیزیں بناتے تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کے آلات زیادہ تر خام تھے لیکن انہیں اپنی کاریگری یا دستکاری میں اعلی کارکردگی حاصل تھی۔ اسی کو مؤرخین نے تین اصطلات سے نوازا ہے۔ کال مارکس (Karl Marx) نے اسی کو 'ایشیائی' (Asiatic) اور 'پیٹی' (Petty) موڈ آف پروڈکشن (Asiatic and Petty Mode of Production) کا نام دیا ہے، جبکہ ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلنڈ (W. H. Moreland) نے اس کو 'پیداوار کا فنکارانہ نظام' (Artisanal System of Production) کا نام دیا ہے، اور عرفان حبیب نے اسے 'قرود وسطی کے ہندوستانی پروڈکشن (Medieval Indian Production) سے تعبیر کیا ہے۔

شمالی ہندوستان میں، خاص طور سے مغل عہد میں ریاست سب سے بڑی پیداواری قوت تھی اور شاہی کارخانوں میں بہترین ماہرین ہنر مند کاریگر کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود کاریگروں کی ایک بڑی تعداد آزادانہ طور پر اشیاء یا دستکاری تیار کرتے تھے اور مقامی استعمال کے ساتھ ساتھ ان کے سامان کی مانگ دور دراز کی منڈیوں میں بھی ہوتی تھی۔ لاہور قالین سازی کے لیے مشہور تھا۔ بقول نِکولاو منوچی (Niccolao Manucci) لاہور کے اونی دستکاری پیداوار کے بیس اقسام آگرہ کے بازار میں فروخت ہوتے تھے۔ مغل عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے تپَن رائے چودھری کہتے ہیں کہ 'مغل ہندوستان میں صنعتی پیداوار بنیادی طور پر ایک دیہی سرگرمی تھی جس میں زیادہ تر شہری مراکز بھی تھے جن کی اہم صنعتوں میں خاص طور پر کچھ عیش و عشرت کے ساز و سامان یا اشیاء شامل تھے۔ بُنکر اور رنگریز گاؤں کی برادری کا حصہ نہیں تھے۔ لیکن اس صنعت کی بنیاد دیہی تھی۔ دھاگے کی کتائی کا کام زیادہ تر عورتیں اجرت کی بنیادوں پر کرتی تھیں۔ بُنکر دھاگہ آزاد کتائی کاریگر سے خریدتا تھا۔ دھاگے کی پیداوار کے اہم مراکز بالاسور، قاسم بازار اور بروچ تھے۔ ندّاف گاؤں اور کچھ حد تک شہری مراکز میں گھر گھر جاکر بنکروں کی خدمات بجالاتا تھا۔ کچھ کاریگر خاص طور پر بنکر اور تیلی اپنے اشیاء قریب کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ بقول جاپانی مؤرخ ہروشی فُکازاوا (Hiroshi Fukazawa) دکن میں بُنکر اور رنگریز اکثر دیہی علاقوں میں سکونت پذیر تھے۔ کے۔ این چودھری (K. N. Chaudhri) سترہویں صدی ہندوستانی کپڑے کی صنعت پیداوار کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''شمالی ہندوستان میں زیادہ شہری علاقے مرکوز تھے جبکہ جنوب اور بنگال میں پیداوار پورے ملک میں بکھری ہوئی تھی۔''

جنوبی ہندوستان میں مختلف پیشوں اور ذاتوں سے وابستہ کاریگروں کی اجتماعی شناخت تھی، جسے کرناٹک میں پنچال، آندھرا میں پنچنا مورو اور تمل ناڈو میں کملار کہتے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں مندروں کے احاطے میں کاریگروں کی بستیوں کو تِرومادیلاگم کہتے تھے۔

مندروں سے منسلک کاریگر مقامی دیہاتوں کے کاریگروں جیسے سادہ لوہار وغیرہ سے بہت مختلف تھی۔ دونوں میں بہت بڑا سماجی اور اقتصادی فرق تھا۔ انہیں مندر کی سرپرستی حاصل تھی اور اسے انتظام میں حصہ لینے کا حق حاصل تھا۔ وہ مندروں کی خدمات انجام دیتے تھے۔ شاہی کارخانوں کے کاریگروں کے برعکس وہ نہ صرف اپنے سرپرستوں بلکہ بازاروں کی ضرورت کو بھی پورا کرتے تھے۔ کاریگر یوروپین عوامل کے تحت دلال کے ذریعے کام کرتے تھے جو اندرونی علاقوں سے سامان کی خریداری میں سہولت کار کے طور پر کام کرتے تھے۔ کیلکو پرنٹرز (Calico Printers) کو پیشگی رقم بھی ادا کی جاتی تھی۔ اگرچہ دلالوں نے ابتدا میں بُنکروں کی مدد کی، تاہم وہ لوگ پیداواری عمل میں تاجروں کی مداخلت کا باعث بنے تھے۔ رقم فراہمی کو یقینی بنانے کے لئے یوروپین کمپنیوں نے بنکروں کو فیکٹریوں کے قریب ہی آباد کیا تھا۔

دور وسطی میں گلڈز کی کارکردگی پر مؤرخین نے تشویش کا اظہار کیا ہے۔ باوجود اس کے شہروں اور گاؤں کے پیشہ ور لوگ ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ مہاراشٹر میں ذات بنیادی پیشہ وارانہ تنظیم تھی۔ جنوبی ہندوستان میں بُنکر 'تاجر یا بُنکروں کے باضابطہ پیشہ وراساتذہ دیکھنے کو ملتے ہیں، جو اپنے ماتحت کاریگروں کو دونوں کام اور قسب دیتے تھے۔ اس کا ایک اضافی فائدہ یہ تھا کہ اس کے ذریعے نہ صرف کاریگر بلکہ پورے گھرانے کی شمولیت کو یقینی بنایا جاتا تھا۔ ڈچ کمپنی نے اس قسم کے اساندہ سے بھرپور کام لیا تھا۔ اس طرح کے معاہدوں پر انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلوار اور جزاور کی بنائی کرنے والے استاد بنکروں کے باضابطہ معاہدے کیے تھے۔ اس معاملے میں استاد بنکر بنکروں کے ساتھ ساتھ کمپنی کے مفادات کی نمائندگی کرتا تھا۔

15.3 دادنی نظام (Putting out System)

لفظ 'دادن' فارسی زبان کی اصطلاح ہے، جس کا مطلب 'دینا' ہوتا ہے۔ اسی لفظ سے دادنی (putting out system) ماخذ ہے۔ عام طور پر اس کے تحت تاجروں یا بُنکروں کو ایک پیشگی رقم کی ادائیگی کی جاتی تھی۔ لیکن تاجر کے ذریعے لگایا گیا سرمایہ نقد یا خام مال کی شکل میں ہوتا تھا۔ ہندوستان میں کاریگر اپنے خود کے سرمایہ سے پیداوار نہیں کرتے تھے، حالانکہ کہیں پر وہ اپنی ذاتی اوزاروں اور انسانی وسائل سے بھی پیداوار کرتے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں موجود 'ویرلاگ' دادنی سے کافی یکسانیت رکھتا تھا جس کے تحت تاجر بُنکروں کو پیشگی کے طور پر خام مال فراہم کرتا تھا۔ اس کی ابتدا یوروپین تجارتی کمپنیوں کے زیر اثر عمل میں آئی جنہیں ایک مخصوص کپڑے کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ حالانکہ مطلوبہ مقدار اور معیار کا تعین سرمایہ دار ہی کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے کاریگروں کو ذاتی پسند کا اختیار نہیں تھا۔ کیونکہ ان کے اوزار، محنت اور خام مال کا انتخاب سرمایہ داروں کے ماتحت ہی تھا۔ دراصل تاجر کاریگروں کو اُن کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کی بنیاد پر کام اور سرمایہ دیتے تھے۔ سورت کے سوماجی چِتّان سود پر رقم وصولی میں ایک فیصد کمیشن کے بجائے 12 فیصد وصول کیا کرتا تھا۔ دراصل بنکروں نے معیار کے انتخاب، پیداوار کی مقدار کو طے کرنے اور سب سے بڑھ کر تیار مال کی قیمتوں کے تعین میں اپنی آزادی کھودی۔ دادنی نظام نے اُن کو کرایہ کے مزدوروں کی سطح تک لایا تھا۔

15.4 مغل کارخانوں کا نظام (The System of Mughal *Karkhanas*)

قرون وسطی کے حکمرانوں، اُن کے درباروں اور محلات کی شان وشوکت اور عیش وعشرت کا ساز وسامان عام بازار میں تیار کرنا مشکل تھا، کیونکہ وہ بڑے پیمانے پر ریاستی پیداوار کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے مغل بادشاہ ان ضرورت کی چیزوں کو اپنے ہی شاہی کارخانوں میں تیار کرتے تھے۔ حکومت کی ضرورت اس لحاظ سے اہم تھی کہ ان کو سال میں دو مرتبہ یعنی ٹھنڈ اور گرمی میں منصبداروں کو لباس فراہم کرنا ہوتا تھا۔ کارخانوں کے اندر ایسے گودام موجود تھے جس کا انتظام حکومت اپنے ریاستی استعمال کے لئے کرتی تھی۔ ہیرے، جواہرات اور موتی سے لے کر تلواروں، تیغوں، توپوں، بندوقوں اور گولا بارود تک کی خرید وفروخت اور اس کا انتظام شعبہ کارخانے کے تحت ہوتا تھا۔ یہ محکمہ ہر قسم کا سامان بناتا اور ذخیرہ کرتا تھا۔ ان میں جنگی ہتھیار اور عیش وعشرت کے ساز وسامان ہوا کرتے تھے۔

شاہی خاندان کے زیر استعمال زیادہ تر اشیاء مختلف شاہی کارخانوں میں تیار کی جاتی تھی۔ اگرچہ شاہی کارخانے اور اُن کے ناظم وغیرہ کا تقرر حکومت کے حدِ اختیارات میں تھا، تاہم ان کا سامان تجارتی بنیادوں پر ہی فروخت کیا جاتا تھا۔ مغل سلطنت میں حکومت خود یعنی ضرورت کے تمام اشیاء تیار کرتی اور فراہم کرتی تھیں۔ جادوناتھ سرکار کا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے مغلوں کا اپنے نوکروں اور رعایا کے ساتھ پدرانہ رشتہ تھا۔

15.4.1 بیوتات (*Buyutat*)

بیوتات دراصل مغل کارخانے کے لئے استعمال ہونے والی ایک اصطلاح ہے جو عربی زبان کا لفظ 'بیت' سے ماخوذ ہے، جس کے معنے گھر کے ہوتے ہیں۔ کے۔ ایم۔ اشرف (K. M. Ashraf) کا خیال ہے کہ کارخانوں کا یہ نظام اور طریقہ کار فارس کی دین ہے، حالانکہ کارخانوں کا ذکر ہمیں موریہ اور دہلی سلطنت کے عہد میں بھی ملتا ہے۔ سترہویں صدی کے آخر میں فرانسیسی ڈاکٹر برنیئر نے مغل دارالحکومت میں چلنے والے کارخانوں میں کام ہوتے دیکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے ''گڑھی کے اندر کئی مقامات پر بڑے بڑے کمرے دیکھے جا سکتے ہیں جنہیں کارخانے یا کاریگروں کے کام کرنے کی جگہ کہا جاتا ہے۔ ایک کمرے میں ایک استاد کی نگرانی میں کاریگر کڑھائی یا کشیدا کاری کرنے میں لگے رہتے ہیں، دوسرے کمرے میں سُنار، تیسرے کمرے میں مصور، جوتھے میں لاکھ پالش کرنے والے، پانچویں میں زیور، درزی، موچی، چھٹے میں ریشم بنانے میں مصروف ہیں۔ یعنی وہ ایسی باریک ململ بناتے ہیں کہ جس سے زریدار پگڑیاں اور کمر بند بنائے جاتے ہیں۔ خواتین کا ایسا پاجامہ بنائے جاتے ہیں جس پر خوبصورت کشیدا کاری کی جاتی ہے۔ کشیدا کار اپنے بیٹے کو کشیدا کار، سنار اپنے بیٹے کو سنار، اور شہر کا حکیم اپنے بیٹے کو حکیم ہونے کی تربیت دیتا ہے۔''

15.5 عہدہ داروں کا طبقہ (Officials' Class)

میر ساماں، شعبہ کارخانہ کا اہم سربراہ اور عہدہ دار تھا۔ شعبہ کو خوش اسلوبی سے چلانے اور اس کی نگرانی کرنے کی اہم ذمہ داری میر ساماں کی تھی۔ خارنہ میں تیار شدہ تمام اشیاء پر اس کی مہر لگائی جاتی تھی اور اس سے متعلق تمام دستاویز پر اس کے جوابی دستخط ضروری تھے۔

15.5.1 دیوان بیوتات (*Diwan Buyutat*)

یہ دراصل محکمہ کارخانہ کی انتظامی اور مالی ذمہ داریوں کو سنبھالتا تھا۔ ان دونوں مشترکہ کاموں کے لیے وہ ذاتی طور پر ذمہ دار تھا۔

15.5.2 مشرفِ کل و جز (*Mushrif–I Kul wa Juz*)

یہ عہدہ دار کارخانے کا اہم اکاؤنٹنٹ تھا۔ مغل سلطنت کے انتظامی تاریخ میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ کسی بھی محکمہ کے ہر ایک شعبے میں ایک اکاؤنٹنٹ یعنی مشرف ہوتا تھا۔

15.5.3 داروغہ (*Darogha*)

کارخانے کے ہر ایک شعبے کا ایک الگ داروغہ ہوتا تھا جو ہر روز کاریگروں کو کام تقسیم کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کاریگروں کو دئے جانے والے خام مال کا ذمہ دار تھا۔

15.5.4 تحصیلدار (*Tahsildar*)

یہ دراصل کارخانے کے ہر ایک شعبے کے لئے درکار سامان اور نقدی کا ذمہ دار تھا۔

15.5.5 مُستَوفی (*Mustaufi*)

یہ کارخانے کا آڈیٹر تھا جو اخراجات کا دستاویز تیار کر کے اس پر دستخط کر کے محکمہ کے دیوان کے سامنے پیش کرتا تھا اور آخر میں اس پر میر ساماں کی مہر لگائی جاتی تھی۔

15.5.6 داروغہ کچہری (*Darogha Kachahri*)

یہ عہدہ دار کارخانے کے دفتر کی عام نگرانی کا ذمہ دار تھا۔ اس کا کام اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ دستاویزات، رجسٹر وغیرہ ایک عہدہ دار سے دوسرے عہدہ دار تک صحیح طریقے سے پہونچے، اور ملازم اور عہدیداروں کے درمیان ایک ہموار رشتہ ہو۔ وہ دونوں کے بیچ میں ایک ثالث کا کام کرتے تھے۔

15.5.7 نذیر (*Nazir*)

اس کا عہدہ محکمے کے دیوان سے کم تھا۔ وہ کھاتوں اور مالیات کا دوبارہ جائزہ لیتا اور کام زیادہ موثر طریقے سے ہونے کو یقینی بناتا۔

15.6 کام کرنے کا انتظامی طریقہ کار (Administrative Procedure of the *Karkhana*)

کارخانے میں کام کو عملی طور پر کرانے کی ذمہ داری میر ساماں کی تھی۔ اس کے پاس داروغہ، مشرف، اور تحصیلداروں کی تقرری،

برطرفی اور تادیبی کاروائی کا حق تھا۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے وہ نذیر، مستوفی اور مشرف سے کام لیتا تھا۔ ضرورت پر مستوفی تمام ضروری دستاویز جمع کر کے اپنے اوپری عہدیداروں کو پیش کرتا تھا۔ ان میں تحصیلدار اور مشرف کے شعبوں سے وابستہ روزانہ داخلی رجسٹر، نقد رسیدوں اور پیسوں کی ادائیگیوں سے متعلق تفصیلات ہوا کرتیت ھی۔ اکاؤنٹنٹ کی منظوری کے بعد ڈیمانڈلیٹر تیار کیا جاتا تھا اور اس پر دیوان کے دستخط کے بعد داروغہ کچہری کو رقم سمیت حوالے کر دیا جاتا۔ کارخانے کے تمام معاملات اور دستاویز کے لئے دیوان بیوتات ذمہ دار تھا۔ کارخانے کے ہر ایک شعبے کی ضروریات کے لئے درکار رقم اور خام مال تحصیلدار کے پاس ہوتا تھا۔ داروغہ اس سے پیسے یا سامان لے کر اپنے ماتحت کاریگروں میں تقسیم کرتا تھا اور شام کو اس چیز کی پیداواری کی حالت اور ہر کاریگر کے کام کی رقم کا حساب لکھ کر دوبارہ تحصیلدار کے پاس جمع کرتا تھا۔ کسی اشیاء کے تیار ہو جانے کے بعد اس کی قیمت کا تعین باقاعدہ اندراجات کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔ اس طرح تحصیلدار اور داروغہ کا دستکاروں اور کاریگروں سے براہ راست رابطہ تھا۔ مشرف روزانہ حساب کتاب کرتے تھے۔ پیشگی (advanced) میں دیئے گئے پیسوں کے روزانہ اندراج، خام مال اور کاریگروں کے کام کا پورا حساب مسطوفی کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اس کے لئے تحصیلدار، داروغہ اور مشرف مشترکہ طور پر ذمہ دار تھے۔ میر ساماں ششماہی بنیادوں پر کارخانوں کی مالی ضروریات کا بیان تیار کر کے بادشاہ کی منظوری کے لئے پیش کرتا۔ بادشاہ اپنی دلچسپی کے مطابق کسی بھی چیز کو بنانے کا حکم دیتا، اس کے علاوہ دوسرے محکموں یا شہزادوں اور امیروں کے درخواست پر منظوری بھی دیتا تھا۔ بادشاہ کا یہ اختیار بھی تھا کہ صوبائی کارخانوں میں تیار شدہ قیمتی اور فنی اشیاء کو اس کے کاریگر سمیت دیوان عام میں پیش یا حاضر کرواسکتا تھا۔ جنگی ہتھیار، عیش و عشرت کے اشیاء ایسے تھے جو اپنی اہمیت یا کاریگری کی وجہ سے بادشاہ کی دلچسپی کا موضوع تھے۔ شاہی کارخانوں میں تیار ہونے والے اشیاء میں خلعت (عزت کا لباس) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کاریگر اپنے بہترین فن کاری یا اصلی نمونے بادشاہ کو پیش کرنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ بہترین کاریگری کے لیے ان کو انعام سے نوازا جاتا تھا۔

15.7 کارخانوں سے متعلق شاہی مفادات (Imperial Interests in Factories)

درباریوں، مؤرخیں اور غیر ملکی سیاحوں کے تبصروں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغل بادشاہوں نے کارخانوں میں کافی دلچسپی لی۔ ابوالفضل اپنی کتاب آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ ''شہنشاہ اکبر مختلف چیزوں پر بہت زیادہ توجہ دیا کرتا تھا۔ انہوں نے ملک میں ہنر مند ماہرین اور کاریگروں کو آباد کیا تاکہ وہ لوگوں کو پیداور کے بہتر طریقہ کار سکھا سکے۔ لاہور، فتحپور سیکری، احمد آباد، گجرات میں واقع شاہی کارخانہ کاریگری کی کئی منفرد مثالیں پیش کرتی ہیں۔ کاریگروں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے اس لئے یہاں کے ہوشیار کاریگر جلد ہی اپنے کام میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ شاہی کارخانہ وہ تمام سامان مہیا کرتی ہیں جو دوسرے ممالک میں ملتی ہیں۔ باریک چیزوں میں دلچسپی عام ہو گئی ہے اور عید کے تہواروں کے دوران استعمال ہونے والے کپڑوں کو بیان کرنا مشکل ہے۔'' فادر مونسرات (Father Monserrate) کہتا ہے کہ 'اکبر خود بھی کھڑے ہو کر عام کاریگروں کو کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور کبھی کبھی وہ خود بھی کام کرنے میں تکلف محسوس نہیں کرتے تھے۔ 'اکبر نے اپنے امیروں میں سے کچھ لوگوں کو مخصوص قسم کے مقامی لباس پہننے کی ہدایات دی تھیں۔ اُس نے لاہور میں ایک ہزار کارخانے قائم کئے۔ اس نے فارسی قالین بنانے والوں کو آگرہ، فتحپور سیکری اور لاہور میں آباد کیا۔ اس قسم کی سرپرستی سے ملک کی ریشم، قالین اور شال

کی صنعتوں کو بے حد بڑھاوا ہوا اور ان کاموں میں مصروف کاریگروں کی حالت بہتر ہوئی۔ مارچ 1601ء میں اکبر نے ہنر مند کاریگروں کا ایک وفد گوا کے پرتگالی گورنر کو ایک خط سمیت بھیجا تا کہ وہ وہاں رائج مختلف فنی مہارتوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔ واپسی پر اکبر نے اُن تمام کاریگروں کی مہارت کو سراہا۔

جہانگیر اور شاہجہاں نے بھی کارخانوں کی سرپرستی کی۔ جہانگیر کے زمانے میں انوکھی چیزیں بنانے اور ہنر مندوں کو انعامات دینے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن کی بہترین مثال ایک چھری کی ہے جس کا ہینڈل مچھلی کے دانت سے بنا ہوا تھا، جس پر سیاہ دھبے تھے۔ اس کے علاوہ جہانگیر کو ایک تلوار، ایک چاقو ملا جس کو استاد داؤد نے سَو تولے الکا پتھر اور عام لوہے کو ملا کر بنایا تھا۔ اس تلوار کی دھار اتنی تیز تھی کہ یہ بہترین پانیدار تلوار کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ جہانگیر نے لاہور اور امرتسر میں اونی کپڑے کے کارخانے قائم کئے۔ جب بنگال کے مغل گورنر اسلام خان دارالحکومت سے ڈھاکہ منتقل ہوئے تو انہوں نے بڑھئیوں، لوہاروں، ہتھیار بنانے والوں اور دیگر کاریگروں کی مدد سے سرکاری گودام اور کارخانے بنوائے۔

شاہجہاں نے گھریلو صنعتوں کو تکنیکی توجہ اور سرپرستی دی، اس کا اندازہ ان کے عطیہ کی ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ بادشاہ بننے سے پہلے جب ان کی بیٹی بیگم صاحبہ بیمار ہوئیں تو انہوں نے پانچ لاکھ روپے مکہ بھیجنے کی منت مانگی۔ بادشاہ بننے کے بعد اس نے اپنی منت پوری کی، لیکن اکبر اور جہانگیر جو مکہ نقد روپے بھیجا کرتے تھے، کے بجائے شاہجہاں نے احمد آباد سے اتنے رقم کا مال خرید کر حجاز بھیجا اور اسکی فروخت سے جو رقم حاصل ہوا اسے مسکینوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے بیس لاکھ کی لاگت سے شاہی کاریگروں سے ایک لیمپ بنوا کر مکہ بھیجا۔ شاہجہاں کے عہد میں کشمیر اور لاہور کی قالین کی صنعت اتنی عروج پر پہنچی کہ سو روپئے فی گز کے حساب سے بننے والے اونی قالینوں کے مقابلے ایران کے شاہی کارخانوں میں بنے اونی قالین ٹاٹ کے پوش نظر آتے تھے۔

اورنگزیب نے دکن میں اپنے قیام کے دوران مسول پٹنم کے کپڑے پر چھپائی کرنے والے ہنر مند کو دہلی یا آگرہ کے شاہی کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ جو جبری کام کی ایک مثال بھی ہے۔ ان کے دور حکومت میں لاہور، آگرہ، احمد آباد، برہانپور اور کشمیر صوبوں میں شاہی کارخانے تھے اور یہاں کے صوبیدار مقامی کاریگروں کو ترقی دیتے تھے۔ گولکنڈہ کے سلطان کا اپنا کارخانہ تھا۔ منوچی کہتا ہے کہ 'بادشاہ اور شہزادوں نے ان میں سے ہر ایک صوبے میں اپنے نوکر رکھتے تھے، جن کا کام ان جگہوں سے بہترین چیزیں لانا اور انہیں دینا تھا۔ وہ مسلسل نگرانی کرتے رہتے تھے کہ ان صوبوں کے حکام اس سمت میں کیا کوشش کر رہے ہیں' ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ کے مطابق مغل دور میں صوبیداروں کے بھی اپنے ذاتی کارخانے تھے۔ کچھ مقامی حکمران جیسے بنارس کے مہاراجہ، نے رام نگر میں اپنا کارخانہ قائم کیا تھا۔ اکبر، جہانگیر اور اورنگزیب نے بھی کاریگروں پر عائد کئی ٹیکسوں میں چھوٹ دینے کی کوشش کی۔ اکبر نے چمڑے کی رنگت اور چونے کی پیداوار جیسی مخصوص صنعتوں میں کام کرنے والے کاریگروں کو ٹیکس میں چھوٹ فراہم کیا۔ مرآت احمدی میں مذکور ہے کہ اورنگزیب نے کاریگروں پر عائد مختلف قسم کے ٹیکس ختم کر دیئے۔

15.8 سولہویں اور سترہویں صدیوں میں کاریگروں کی حالت

(The Condition of Artisans during the Sixteenth and Seventeenth Centuries)

غیر ملکی مسافروں کی تفصیل، بابر اور آئین اکبری کے حوالوں سے اس وقت کے مزدوروں کی معاشی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ باہر ہندوستان کو لاتعداد کاریگروں کا ملک سمجھا جاتا تھا۔ ان کے مطابق مختلف دستکاریوں اور صنعتوں میں لاتعداد کاریگروں کا ہونا ہندوستان کے لیے فائدہ مند تھا۔ ابوالفضل استادوں اور کاریگروں کے ملک میں آباد ہونے کی بات کرتا ہے۔ اس نے ہنر منداور غیر ہنر مند کاریگروں اور دستکاروں کے معاوضوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ برنیئر (Bernier) کہتا ہے کہ ''انڈیز کے ہر حصے میں ہنر مند لوگ موجود تھے۔'' وہ غربت کے حالات میں رہنے والے ہندوستانی مزدوروں کے ہنر کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ایسی بہت سی مثالیں ہیں جہاں کاریگروں نے خوبصورت دستکاری تخلیق کی ہے اور یہ کاریگر ایسے ہیں جن کے پاس نہ تو اپنے اوزار ہیں اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں تربیت دی گئی ہے۔ کچھ استاد بعض اوقات وہ یوروپی چیزوں کو اتنی خوبصورتی سے نقل کرتے ہیں کہ اصلی اور نقلی میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی کاریگر عمدہ بندوقیں، شکاری بندوقیں اور سونے کے ایسے خوبصورت زیورات بناتے ہیں کہ یوروپی سناروں کے لئے انکی کاریگری کو مات دینا ممکن نہیں لگتا۔''

یہ ایک سچی حقیقت ہے کہ قرون وسطی خاص طور سے مغل عہد میں ہنر مندوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن کیا وجوہات تھے کہ اُن کے ہاں اپنا کوئی آزاد کارخانہ نہیں تھا اور سولہویں اور سترہویں صدیوں کے مآخذ میں بار بار محنت کشوں کی غربت اور ان کی غیر معاشی حالت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مورلینڈ کے مطابق سترہویں صدی کے وسط میں ان لوگوں کی حالت خراب تھی۔ عہد وسطی کے کاریگر انتہائی سخت حالات میں کام کرتے تھے۔ انہیں بہت سے مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا، خاص کر اُن کے کام کا معاوضہ بہت ہی کم تھا۔ فرانسسکو پیلسارٹ (Francisco Pelsaert) جو آگرہ میں ڈچ کارخانہ کے سربراہ تھے، جہانگیر کے سات سال کے تجربے کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ''تین طبقے کے لوگ تھے جو نام کے تو آزاد تھے لیکن حقیقت میں ان کی حیثیت یہ تھی کہ رضاکارانہ غلامی میں وہ مزدوروں، نوکروں اور چھوٹے دکانداروں سے مختلف نہیں تھے۔ ان میں سے مزدوروں جیسے (سنار، پینٹر، کڑھائی کرنے والے، قالین بنانے والے وغیرہ دوہری مار سے دوچار تھے۔ اول تو ان کا معاوضہ بہت کم تھا۔ صبح سے شام تک کام کرنے کے بعد بھی وہ صرف پانچ یا چھے ٹنکے یا پانچ روپئے ہی کما پاتا تھا۔''

شاہی کارخانوں کے نظام کے تحت کاریگروں کو آزادی کے عوض تحفظ ملتا تھا۔ انہیں پورا دن عام مزدوروں کی طرح سخت نگرانی میں کام کرنا پڑتا تھا۔ پیلسارٹ نے بیان کیا ہے کہ ایک یوروپین کاریگر تین یا چار ہندوستانی مزدوروں کے مساوی کام کرتا تھا۔ یہ حقیقت دو امکانات کو ظاہر کرتی ہے۔ یا تو ہندوستانی کاریگر بہت سست تھے یا یہاں کی خصوصیات بہت زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔ مورلینڈ نے آئین اکبری میں دی گئی کاریگروں کے یومیہ اجرت کی شرح کو جدید کرنسی میں یوں بیان کرتے ہیں۔

عام مزدور	۲دام یا۵آنہ
تھوڑااونچاکاریگر	۳۔۴دام یاساڑھے آٹھ آنہ
بڑاکاریگر	۳۔۷آنہ یاساڑھے آٹھ آنہ
درباری غلام	۱۲ آنہ فی مہینہ

پیلسارٹ کے مطابق دوسری اہم بات یہ تھی کہ صوبیداروں،امیروں، کوتوالوں، بخشیوں اور دیگر سرکاری اہلکاروں کے ذریعے کئے جانے والے مظالم تھے۔ جب بھی ان کو کسی مزدور کے کام کی ضرورت پڑتی تو اسے گھر یا بازار سے اُٹھا کر لاتے تھے۔ اگر اس نے احتجاج کرنے کی کوشش کی تو اسے مارا پیٹا جاتا تھااور کام کے بعد آدھی اجرت دے کر بھگا دیا جاتا تھا۔ گجرات کے دیہاتوں اور شہروں میں کاریگروں کو سرکاری اہلکاروں کی جبری ملازمت کی وجہ سے کس حد تک نقصان اٹھاناپڑا۔اس کااندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بادشاہ اورنگزیب کو اس روایت کو ختم کرنے کے لیے ۱۶۶۵ء میں ایک فرمان جاری کرناپڑا۔

ایک اور چیز جو کاریگروں اور مزدورں کے خلاف تھی وہ دلالی تھی۔ کاریگروں کو اپنے منافع کاکافی حصہ دلالوں کو دیناپڑتا تھا، کیونکہ صارف اور کاریگر کے درمیان کئی سطحوں پر دلال موجود تھے۔ بَرنیَر (Bernier) اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 'وہ(مزدور) کبھی امیر نہیں ہو سکتااور اس کے لئے بھوک مٹانااور اپنے جسم کو موٹے کپڑوں سے ڈھکنا بہت بڑی بات ہے۔ اگر کسی کو پیسہ ملتا ہے تو وہ تاجر ہے،مزدور نہیں'ایسی صورت میں کاریگروں کا غیر اقتصادی ہونا فطری تھا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ کام عام لوگوں کے پست معیار زندگی سے جڑا ہوا تھا جس کی تصدیق پیلسارٹ اور دیگر سیاحوں اور تاجروں نے بھی کیا ہے۔ معاشی سطح کو بلند کرنے کی خواہشات کا فقدان اور مسابقت کا جذبہ جزوی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مزدوری کی تقسیم اور سخت ذات پات کے نظام کی وجہ سے تھا، جس کی تصدیق بَرنیَر اور پیلسارٹ کرتے ہیں۔ ذات پات کے نظام کی سختی کی وجہ سے کارکنوں کی نقل و حرکت بھی انتہائی محدود تھی۔ کاروباری منافع کے لئے ترغیب کا فقدان بھی کاریگروں کی نقل و حرکت میں رکاوٹ تھی۔

خام مال کی قیمت بہت زیادہ تھی اور کاریگروں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ اپنا کام خود شروع کر سکے۔ نتیجتاً وہ شاہی کارخانوں میں کام حاصل کرنے لے لئے بہت بے چین رہتے تھے۔ تمام منفی حالات کے باوجود کچھ سازگار حالات بھی موجود تھے، جن کی وجہ سے بَرنیَر کہتا ہے کہ ''فنی دستکاری کا زوال نسبتاً سست تھا۔اول تو شاہی کارخانوں کی وجہ سے اور دوسرا کچھ طاقتور سرپرستوں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ''اس بات کی تصدیق جین دے تھیونا ٹ (Jean de Thevenot) نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ برنیئر کا یہ تبصرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''اگر کاریگروں اور صنعت کاروں کی حوصلہ افزائی کی جائے تو مفید فنون،اور فنون لطیفہ پروان چڑھے گیں، لیکن بدقسمتی لوگ حقیر ہیں۔ان کے ساتھ بدتمیزی کی جاتی ہے اوران کے کام کے لئے مناسب مزدوری بھی نہیں دی جاتی۔''

15.9 مغل کارخانوں کے اثرات اور زوال (Impact and Decline of the Mughal Karkhanas)

مغلوں کے کارخانہ نظام کی وجہ سے سونے اور چاندی کی دستکاری، تامبے کے برتن سازی، کپڑے اور قالین کی صنعتوں، گودے اور ہاتھی دانت کے کام میں جو معیار قائم کئے گئے تھے ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ مغل دور میں یہ دستکاری ملکی معیشت میں بہت اہم تھی اور شاہی خاندان سے وابستہ کارخانے نے ان کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نظام نے نہ صرف ریاست کی ضروریات کو مناسب قیمتوں پر پورا کیا بلکہ صنعتوں کو حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان کارخانوں کے کام کرنے کے بہتر طریقے تھے اور یہاں تیار ہونے والی اشیاء کو مثالی اور معیاری سمجھا جاتا تھا جس کی اور دوسرے کاریگروں اور دستکاروں نے پیروی کی۔ درباروں اور امیروں کے اسراف کو پورا کرنے کے لئے پر تعیش اشیاء کی مانگ معیار اور مقدار میں بہتری کا باعث بنا۔ کارخانوں کا بہت سے دوسرے شعبوں پر بھی اثر پڑا۔ شاہی بھلوں کی دکان نے پھلوں کی بہتر اقسام کی کاشت کی حوصلہ افزائی کی۔ شاہی کتب خانوں میں بہترین خطاط اور مصور مقرر کئے گئے تھے۔ اس طرح ان فنون اور کتابوں کی جلد باندھنے کے میدان میں نئے تجربات کئے گئے۔ کارخانوں نے شہری زندگی اور دیہاتوں اور قصبوں کے درمیان تعلقات کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ ان سے دیہات سے شہروں تک کارکنوں کی نقل و حرکت میں مدد ملی۔ دیہی علاقوں کے مشہور کاریگروں کو شاہی کارخانوں میں رضاکارانہ طور پر زبردستی لایا جاتا تھا۔ اس طرح کاریگروں کو یہ اہمیت اپنی کاریگری میں خاص قابلیت ہونے کی وجہ سے ملا۔ اس کے علاوہ کارخانوں نے ذاتوں اور دستکاری یونینوں کی تنظیموں کو مضبوط بنایا۔

دستکاری کے نقطہ نظر سے، پتھر سازوں، کاریگروں اور بڑھئیوں کو تعمیراتی کام میں قدرتی طور پر حوصلہ افزائی ہوئی۔ اسی دوران ایک متوسط طبقہ بھی ظاہر ہونے لگا جس میں دکاندار، تاجر، دلال، جہاز ساز وغیرہ شامل تھے۔ پیلسارٹ کا بیان ہے کہ ''دکانداروں کو کاریگروں سے زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے کچھ کا تعلق اچھے گھرانوں سے ہوتا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو سامنے نہیں آنے دیتے۔'' شاہی کارخانے فنکاری اور ہنر کو پھیلانے اور ملک کی ثقافتی سطح کو بلند کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ تمام ہنرمند اور تربیت یافتہ کاریگر جیسے کہ مصور اور موسیقار، ان کارخانوں میں جگہ نہیں پا سکتے تھے۔ باقی لوگوں کو امیر اور مقامی بادشاہوں نے اپنے پاس رکھا جس سے فنون لطیفہ کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ضوابط عالمگیری کے مطابق سترہویں صدی کے آخر تک مغل شاہی کارخانوں کی تعداد ۶۹ تھی لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں شاکر خان کے مطابق شاہی کارخانوں کی تعداد صرف ۳۶ رہ گئی تھی۔ جو کہ مغل سلطنت کے آخری حصے میں آئے زوال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دراصل کارخانوں کا وجود مغل بادشاہوں اور ریاست کی ضروریات پر مبنی تھا۔

15.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مندرجہ بالا صفحات کی گفتگو سے ہم نے مغل عہد کے مختلف صنعتوں اور دسکاریوں کے پیداواری نظام جیسے دادنی، مغل کارخانوں کے نظام پیداواری سے متعلق مختلف عہدہ دار طبقوں، افسران اور مفادات کے بارے میں علم ہوا۔ اس اکائی سے مغل کارخانوں کے معاشی کردار اور اثرات اور اس کے زوال کے بارے میں بھی معلومات ہوئی۔ قرون وسطی کی معیشت اپنے دور کے اختتامی سالوں میں یعنی سترہویں

اور اٹھارویں صدیوں میں عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ہندوستانی کاریگر نے اپنی مہارت اور فنکارانہ ہنر سے یوروپین سیاحوں کی توجہ حاصل کی تھی۔ مغل ہندوستان نے اجناس اور اشیاء کی پیداوار اور بناوٹ کی اعلیٰ مثال قائم کی تھی۔

15.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

مشرف کل وجز	:	کارخانوں کا اہم اکاؤنٹنٹ۔
داروغہ	:	کاریگروں کو خام مال اور کام دینے والا
دادنی	:	پیشگی رقم یا خام مال جو تاجروں کے ذریعے کاریگروں یا دستکاروں کو دیا جاتا تھا۔
مستوفی	:	آڈیٹر
داروغہ کچہری	:	کارخانے کے دفتر کا عام نگراں۔
میر ساماں	:	کارخانے کا اہم سربراہ۔

15.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. کس سیاح نے کہا ہے کہ بادشاہ اور شہزادے ہر ایک صوبے میں اپنے کارندے رکھتے تھے؟
2. بڑھئی کو کتنی مزدوری ملتی تھی؟
3. کس نے کہا ہے کہ کاریگروں کی بھوک مٹانا اور موٹے کپڑے سے تن ڈھانک لینا بڑی بات تھی۔؟
4. ایشیاٹک موڈ آف پروڈکشن کس کی اصطلاح ہے۔
5. دادنی کا لفظی معنی کیا ہے؟
6. مشرف کل کون تھا۔

15.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کارخانے میں داروغہ کے کیا فرائض تھے؟
2. کاریگروں اور دستکاروں کی حالت پر برنیر نے کیا کہا ہے؟
3. مغل کارخانے پر برنیر کے تبصرہ کو پانچ جملوں میں لکھیئے۔
4. کارخانے کے مغل عہدہ دار اور کاریگر کے رشتہ پر پانچ جملے لکھیئے۔
5. داروغہ کچہری پر تین جملے لکھیئے۔

15.2.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دادنی نظام کے تحت اشیاء کے پیداوری پر تفصیلی بحث کیجیئے۔
2. کس طرح کارخانے سے شاہی مفاد منسلک تھے؟ایک مضمون لکھیئے۔
3. کارخانے اور مختلف صنعتوں میں مغل بادشاہوں کی دلچسپی پر ایک نوٹ لکھیئے۔

15.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).
3. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
4. Chandra, Satish, *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans*, Centre for Studies in Social Sciences, Calcutta, 1986.
5. Chitnis, K.N., *Medieval Indian History*, Atlantic Publishers and Distributors, New Delhi, 2008 (first pub. in 2003).
6. Habib, Irfan and Tapan Raychaudhuri eds., *The Cambridge Economic History of India*, *Vol. 1*, Cambridge University Press, Cambridge, 1982.
7. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
8. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
9. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1997).
10. Hasan, Saiyid Nurul, *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India*, People's Publishing House, New Delhi, 1990 (first pub. in 1973).
11. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
12. Khan, Iqtidar Alam, *India's Polity in the Age of Akbar*, Permanent Black, Ranikhet, 2016.
13. Mehta, J.L., *Advanced Study in the History of Medieval India*, *Vol. III*, *Medieval Indian Society and Culture*, Sterling Publishers Pvt., Ltd., New Delhi, 1995 (first pub. 1983).
14. Moreland, W.H., *From Akbar to Aurangzeb*: *A study in Indian Economic History*, Manohar, New Delhi, 2022 (first pub. in 1923).
15. Moosvi, Shireen, *The Economy of the Mughal Empire, c. 1595*: *A statistical Study*, Oxford University Press, New Delhi, 1987.
16. Naqvi, Hameeda Khatoon, *Urban Centres and Industries in Upper India*, *1556-1580*, Asia Publishing House, Bombay, 1968.
17. Richards, Jhon F., *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, New Delhi, 2016.
18. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *Mughals and Franks*, Oxford University Press, New Delhi, 2014 (first pub. in 2005).
19. Vanina, Eugenia, *Urban Crafts and Craftsmen in Medieval India* (Thirteenth-Eighteenth Centuries), Munshiram Manoharlal Publisher, New Delhi, 2004.
20. Verma, Tripta, *Karkhanas under the Mughals from Akbar to Aurangzeb: A Study in Economic Development*, Pragati Prakashan, Delhi, 1994.

اکائی 16۔سائنس اور ٹکنالوجی

(Science and Technology)

اکائی کے اجزاء

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 مغل عہد میں سائنس کا مقام

16.2.1 علم طب کی ترقی

16.2.2 زرعی ٹکنالوجی اور زراعت پر اس کے اثرات

16.2.3 قلمکاری کے فائدے

16.2.4 آبپاشی کی تکنیک

16.2.5 نہروں کی تعمیر اور اس کے فوائد

16.3 جنگی ٹکنالوجی

16.3.1 توپ خانہ

16.3.2 دستی بندوق

16.3.3 کپڑے کی ٹکنالوجی

16.3.4 کاغذ اور پرنٹنگ

16.5 کان کنی، فلزیات یا دھات کاری

16.5.1 لوہا

16.5.2 اسٹیل

16.5.3 تامبہ، ٹِن، کانسہ اور جست

16.6 کیمیا

16.6.1 عرق کشیدی

16.6.2 اطالوی عرب برتن
16.6.3 ٹھنڈا کرنے کا عمل
16.6.4 شیشہ
16.7 جہاز سازی
16 .7.1 لوہے کا لنگر
16.8 اکتسابی نتائج
16.9 کلیدی الفاظ
16.10 نمونہ امتحانی سوالات
16.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید (Introduction)

مغل ہندوستان میں مختلف سائنسی علوم اور ٹکنالوجی کی ترقی ہوئی، جس میں مقامی اور بیرونی تکنیک شامل ہیں۔ اس کائی میں زیادہ تر گفتگو ٹکنالوجی پر کی گئی ہے جو کم و بیش اقتصادی اثرات سے وابستہ تھی، جیسے زراعت، نقل و حمل اور جنگی ٹکنالوجی وغیرہ۔ مغل ہندوستان میں زراعت، جنگ، قلم کاری، کپڑے بنانے، آبپاشی، مختلف اقسام کے دھاتوں، کاغذ بنانے، عرق کشیدی، پانی ٹھنڈا کرنے اور جہاز سازی کے میدان میں تکنیکی ترقی ہوئی۔ سائنسی علوم کے حوالے سے مغل عہد میں زیادہ ترقی دیکھنے کو نہیں ملتی لیکن کیمیا اور ادویات کے بارے میں ترقی کے ثبوت ملتے ہیں۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل عہد میں سائنس کا مقام، علم طب، زراعت سے متعلق مختلف ٹکنولوجی، کے بارے میں جان سکے گیں۔
- اس عہد کے جنگی ٹکنالوجی میں توپ خانہ، دستی بندوق اور سکے بنانے کے طریقے کے بارے میں جانے گیں۔
- کپڑے تیار کرنے کے لیے استعمال ہونے والی مختلف ٹکنالوجی اور آلات سے واقف ہو سکیں گے۔
- اس بات کا جائزہ لے سکیں گے کہ مغل حکمرانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے لیے کیا کیا اقدام اٹھائے۔
- مغل عہد کے مختلف دھاتوں کو نکالنے، اور ان سے مختلف اشیاء تیار کرنے کی ٹکنالوجی، کاغذ بنانے کا طریقہ کار، عرق کشیدی کے عمل، جہاز سازی وغیرہ کے بارے میں روشناس ہو سکیں گے۔

16.2 مغل عہد میں سائنس کا مقام (The Importance of Science during the Mughal Age)

مغل دور میں سائنس اور ٹکنالوجی کے مطالعے کو دو حصوں یعنی 'مقامی ترقی' اور 'یوروپین سائنس اور ٹکنالوجی پر ہندوستانیوں کا ردِ عمل' میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ سائنس کی مقامی ترقی میں ہندوستان کا قابل ذکر کردار رہا ہے۔ ٹکنالوجی کے میدان میں اہم ایجادات اور نئے طریقے بھی قابل ذکر ہیں، جیسے گلاب کی خوشبو اور پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے شورا کا استعمال وغیرہ۔ اسی طرح سے یوروپی سائنس اور ٹکنالوجی پر ہندوستانی ردِ عمل مثبت اور منفی دونوں میں تھا۔ مثال کے طور پر جہاز سازی میں کچھ مثبت ردِ عمل تھے لیکن شیشے کے ٹکنالوجی کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ جہاں تک سائنس کا تعلق ہے ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ہندوستانیوں نے یوروپی تجربے سے فائدہ اٹھایا ہو۔ عہدِ وسطیٰ میں علم طبیعات، فلکیات، کیمیا، طب، جغرافیہ اور ریاضی میں کوئی مثبت پیش رفت نہیں ہوئی۔ اس دور میں روایتی علوم کو پڑھا جاتا رہا۔ سائنسی مسائل پر ہندوستانی اور یونانی عربی نظریات کا اثر تھا۔ ایک فرانسیسی مسافر، کیری (Careri) ہندوستان کے مسلم سائنس دانوں اور علماء کے تعلق سے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''جہاں تک علوم یعنی سائنس کا تعلق ہے وہ کتابوں کی کمی کی وجہ سے ان میں کوئی ترقی نہیں کر سکتے؛ کیونکہ ان کے پاس عربی میں ارسطو اور ابن سینا کے چند چھوٹے مخطوطات کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے۔''

لیکن ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ مغلیہ عہد میں کچھ بہت ہی قابل سائنس داں موجود تھے۔ ان میں سے میر فتح اللہ شیرازی خاص طور پر قابل ذکر ہے، جو 1583ء میں آگرہ میں اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ ابوالفضل اس کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اگر حکمت کی پرانی کتابیں غائب ہو جاتیں، تو فتح اللہ شیرازی علم کی ایک نئی بنیاد رکھ سکتا تھا اور پہلے لکھی ہوئی (کتابوں) کی تمنانہ کرتا'' اکبر نے اس کے انتقال پر مندرجہ ذیل الفاظ میں ماتم کیا ہے ''اگر وہ فرینکو یعنی یوروپین کے ہاتھ لگ جاتا، اور وہ اس کے بدلے میں میرے سارے خزانے مانگ لیتے، تو میں بخوشی منافع بخش قیمتی جواہرات کے عوض اس کو میں خرید لیتا'' کچھ میکانکل آلات ایجاد کرنے کا سہرا اس کے سر تھا۔ ہندوستانیوں نے یوروپی طریقہ کار سیکھ کر سائنس و ٹکنالوجی کو فروغ دیا۔ ابوالفضل کو یوروپ والوں کے ذریعے امریکہ کی دریافت کا علم تھا۔ اس نے اس کے لئے نئی دنیا 'عالم نو' کی فارسی اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ لیکن یہ علم ہندوستان میں جغرافیہ کی تعلیم کا عام حصہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس گلیلیو اور نیوٹن کی دریافت سے ہندوستانی ناواقف تھے۔ فرانسیسی طبیب، برنیئر جو سترہویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان آیا تھا، دعوی کرتا ہے کہ وہ پانچ یا چھ سال تک ایک مغل امیر آغا دانشمند خان کی صحبت میں رہا، جس سے وہ ولیم ہاروے (William Harvey) اور پیقُویٹ (Pecquet) کی خون کی روانگی (circulation of blood) جیسے نئے دریافتوں کی وضاحت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ برنیئر نے بیان کیا ہے کہ ہندوستانی انسانی جسم کے ڈھانچے کے علم (anatomy) میں بہت کمزور ہیں۔ ہمارے حکیموں اور وَیدوں نے ہاروے کی دریافت میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

16.2.1 علم طب کی ترقی (Advancement in the Medical Science)

طب کی تاریخ کے نقطہ نظر سے مغل عہد میں دو قسم کے اہم تجربات دیکھے جاسکتے ہیں۔ چیچک سے بچاؤ کا علاج کے بارے میں پہلی

جانکاری تقریبا1713ء میں ملتی ہے، جبکہ مقامی روایتی علاج تقریبا150 سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔ چیچک کے علاج کے عمل میں چیچک کے چھالے سے پیپ کو سرِنج سے ذریعے نکالا جاتا تھااور ایک موٹی سوئی سے خون کی نالیوں میں انجکشن لگایا جاتا تھا۔ صحیح علم نہ ہونے کے باوجود اس طریقہ کار کے استعمال کرنے والے جدید بایو کیمسٹری، جدید ادویات کی کامیابیوں اور حفاظتی ٹیکے کی تمام اقسام کے علمبردار تھے۔اسی طرح سرجنوں کو پلاسٹک سرجری کے علمبردار ہونے کا دعوی کیا جاسکتا ہے۔ منوچی (Manucci) کے مطابق، بدلہ لینے یا مجرم کو سزا دینے کے لئے ہندوستان میں ناک کاٹنے کے برے عمل نے سرجنوں کی ایک قسم کو پیدا کیا۔ ہندوستانی سرجن کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ 'وہ متاثرہ شخص کی پیشانی کے کچھ خال کاٹ کر نکالتے اور اسے ناک کے زخم پر اس طرح لیپٹ دیتے تھے کہ تازہ زخم کی تہ تازہ جلد کے ساتھ مل جائے۔ اور اس طرح متاثرہ شخص کی ناقص ناک تیار ہونے کے ساتھ ساتھ زخم بھی بھر جاتا تھا۔' انیسویں صدی میں ہماچل پردیش کا کانگڑا ضلع اس قسم کی سرجری کا ایک مشہور مرکز بن گیا تھا۔اور مقامی سطح پر اس طرح کی سرجری کی روایت کے شواہد اکبر کے دور سے ملتے ہیں۔

16.2.2 زرعی ٹکنالوجی اور زراعت پر اس کے اثرات

(Agricultural Technology and its Impact on Agriculture)

زمانہ قدیم میں بھی زرعی ٹکنالوجی مستعمل تھی۔ اس ٹکنالوجی نے بتدریج ترقی کرتے ہوئے عہدِ وسطیٰ اور مغل عہد میں زرعی میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں زمین کی فطرت کے مطابق مختلف قسم کے ہل استعمال کیے جاتے تھے، جس کا ذکر یورپی مورخین نے جابجا کیا ہے۔ 1770 کی دہائی میں جان فیری نے مغربی ساحل کی ہلکی مٹی میں ہل چلانے کے لئے موزوں لکڑی کے سخت پھال کے ساتھ ایک ہل ایجاد کیا تھا، لیکن 1801 میں فرانسس بُکانَن نے کرناٹک کی اونچی زمین پر 8 بیلوں سے کھینچے جانے والے 3 کلو 3 سو گرام لوہے کے پھال کے ساتھ ایک ہل ایجاد کیا۔ ایچ۔ ایم۔ اِلیٹ نے 1842 میں دریافت کیا کہ دہلی اور مغربی اترپردیش میں کاشکار گنے کی کاشت میں زمین پر گہرا ہل چلانے کے لیے ایک مڑے ہوئے لکڑی کے ہل کا استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہل دو قسم کی لکڑی 'رو' اور 'پاکھی' کے چھوٹے تختوں پر مشتمل تھا۔ بیڈن پاویل نے پنجاب میں دو قسم یعنی 'بھاری اور ہلکے ہل کے استعمال کا ذکر کیا ہے۔ عام طور سے بیج ایک قسم کے ڈِرِل مشین سے بوئے جاتے تھے۔ ہمارے پاس اس آلے کی دو تصویر ہیں جسے لاک وُوڈ کپلنگ نے خان گام میں 1872 میں بنائی تھی۔ ایک تصویر میں ایک ڈِرِل ہے جس میں تین نالیاں ہیں، جو اوپر سے ایک گول کپ سے جڑی ہوئی ہے۔ دوسری تصویر میں دو نالیوں کو دکھایا گیا ہے، اور ہر نالی ایک دوسرے سے الگ ہے، لیکن دونوں نالیاں پیندے میں ایک جگہ پر آکر ملتی ہیں۔ یہ ڈِرِل دو بیلوں کے ذریعے کھینچتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کپلنگ نے اس ڈِرِل کی تصویر بنائی تھی اس کا استعمال جنوبی، مغربی اور شمالی ہندوستان میں ہونے لگا تھا۔ جہانگیر کے ہم عصر امان اللہ حسینی نے سترہویں صدی کے ابتدا میں اپنی کتاب، گنج بداوُرد میں کپاس کی بُوائی کے لیے استعمال ہونے والے ہل کا ذکر کیا ہے جو لاک ووڈ کپلنگ کی ڈیزائن کردہ ہل کے مشابہ تھی۔ اس کتاب میں کاشت کے متعلق بیج کی بُوائی کے وقت کا بھی ذکر کیا ہے۔ کھیت میں بیج بونے کے فورا بعد مٹی کو ہموار کیا جاتا تھا۔ زمین کو برابر کرنے کے علاوہ بہت سے دوسرے زرعی امور کو تاریخ الفی میں ذکر ملتا ہے۔ ٹکنالوجی کا استعمال مغلیہ عہد میں بڑھنے لگا جس کی وجہ سے زرعی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوا، جس کے تاریخی شواہد موجود ہیں۔

16.2.3 قلمکاری کے فائدے (Grafting Benifits)

مغل دور میں پھلوں کے پیڑوں کی قلمکاری کا طریقہ کار رائج تھا، جس کا ذکر تاریخی ماخذ میں ملتا ہے۔ بادشاہ جہانگیر لکھتا ہے کہ اکبر کی فتح کشمیر سے پہلے کشمیر میں میٹھی چیری دستیاب نہیں تھی۔ اکبر کے دور میں ایک ایرانی علی قلی افشار کشمیر کا گورنر بنا۔ اس نے کابل سے چیری کا قلم لاکر کشمیر میں لگوایا۔ اسی طرح اُس نے وہاں خوبانی کے درخت بھی لگاوائے۔ جہانگیر ذکر کرتا ہے ہے کہ کشمیر میں شہتوت کے پودے کے قلم لگا کر ہی کھانے قابل بنایا گیا۔ صادق خاں کہتا ہے کہ شاہجہاں کے دور میں قلم کاری کا رواج عام ہو گیا تھا۔ اسی قلمکاری کی وجہ سے تین طرح کے سنترے یعنی سنگتارا، کونلا اور نارنگی، جو پہلے لیمو کی ایک قسم تھی، کی معیار اب بہت بہتر ہو گئی تھی۔ ٹیک چند بہار نے اپنی لغت میں لکھا ہے کہ نارنجی کو نارنجی کے پودے پر تُرنگ قلم لگا کر تیار کیا گیا تھا۔ فارسی زبان کی کتاب 'درفنِ فلاحت' میں سیب کے درختوں میں قلم کاری کے مقصد سے سوراخ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں قلم بنانے کے طریقے کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ پرتگالیوں سولہویں اور سترہویں صدی میں انناس، پپیتا، کاجو اور امرود جیسے بہت سے پھلوں کے پودے ہندوستان لائے۔ سب سے پہلے پرتگالیوں نے قلم کاری کے ذریعے آم لگایا تھا۔ ایک مؤرخ نے کہا ہے کہ کیرانہ میں موجود باغ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس باغ میں آم کی سارے اقسام موجود ہیں۔ 1719 میں جہانگیر نے اس باغ کا دورا کیا تھا۔ ک پی۔ کے۔ گوڈے کی تحقیق بالکل درست ہے کیونکہ منوچی نے آم کی مشہور قسم 'الفنسو' کی قلم کاری سے پہلے آم کی کسی بھی قسم کی قلمکاری کا ذکر نہیں ملتا ہے۔

16.2.4 آبپاشی کی تکنیک (Irrigation Technology)

رہٹ جس میں ایک چرخی اور زنجیر ہوتی تھا جس سے بابر کافی متأثر ہوا تھا۔ یہ وہی رہٹ ہے جو بعد میں 'پَرشیَن ویل' کے نام سے مشہور ہوئی۔ بابر نے رہٹ کو سب سے پہلے 1519 میں مغربی پنجاب کے بھیرا میں دیکھا تھا۔ رہٹ (پَرشیَن ویل) کی پہلی وضاحت بابر نامہ میں ہندوستان سے متعلق بیان میں ملتا ہے۔ کنواں سے اونچائی تک پانی اُٹھانے کا آلا اور طریقہ بھی مغل دور میں رائج تھا۔ اس کام کو لکڑی کے بیڑے میں دانتوں والی تختیوں کے استعمال کے ذریعے انجام دیا جاتا تھا۔ اس آلا اور طریقہ کے استعمال نے اکبر کے درباریوں میں کافی جوش تھا۔ اکبر کے دور کی مصوری کی کتابوں میں ان آلات کی تصویریں ملتی ہیں۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ 'جہاں پناہ نے ایسے رہٹ بنوائے اور ان کے ساتھ ایسے چرخے جوڑے کہ پانی نشیبی مقامات سے بلندیوں تک لے جایا جا سکے، اور دو بیل ایک ہی ساتھ چار پہیوں کو گھما سکے، اور اس کے علاوہ ایک ہی بیل سے دو پہلیوں کو گھما کر پانی کنویں سے نکالا جا سکے اور ایک پن چکی چلائی جا سکے۔' ان مین سے پہلے ایجاد یعنی رہٹ کا خمسہ نامی کتاب میں ذکر ہے۔ موجودہ آثار قدیمہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ منڈی کے مغل باغات میں اس قسم کا آلا آبپاشی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہیں فتحپور سیکری کی ایک جھیل سے پانی ایک تالاب میں جمع کیا جات اور آخر میں اسے بلندی پر لایا جاتا۔ لیکن ان آلات میں پانی کو مؤثر طریقے سے پمپ کرنے کا طریقہ کار بھی موجود تھا۔ ایک انگریز نے جہانگیر سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو یمنا کا پانی عام لوگوں کے استعمال کے لئے اسی طرح پمپ کرنے کا انتظام کر سکتا ہے جس طرح لندن میں ٹیمس ندی سے پمپ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس خیال کو انگریز سفیر سر تھامس رو نے رد کر دیا اور اس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ آب نکاسی کے پمپ کی عدم موجودگی کا مطلب یہ بھی تھا کہ پانی سطح سے نیچے کان کنی

کا کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔

16.2.5 نہروں کی تعمیر اور اس کے فوائد (Construction of Canals and Its Benefits)

عہدِ وسطیٰ میں نہروں کی تعمیر کا مقصد کسانوں کو مستجائی کی سہولیات فراہم کرنا تھا جو مغل عہد میں بھی جاری رہا۔ مغل بادشاہ شاہجہاں کے دور میں تعمیر نہروں کے بارے میں اچھی معلومات دستیاب ہیں۔ نہر بنانے والے کے پاس تفصیلی سروے کا نقشہ ہونا اس وقت ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اس وقت کے معمار اپنی آنکھوں سے دیکھ کر صرف قدرتی ڈھلوان کی لکیر پر کام کرتے تھے۔ 'جہاں ممکن نہیں ہو وہاں کوشش کرو، ناکام ہو تو دوبارہ کوشش کرو' کے مہنگے طریقہ کار کو اپنایا گیا۔ شاہجہاں نے دریاؤں سے پانی نہر کے ذریعے لاہور لانے کی کوشش کی لیکن دو بار نہر کھودنے کے باوجود پانی لاہور نہ پہنچ سکا۔ تیسری کوشش میں سب کچھ پیچھے چھوڑ کر اصل نہر سے چھوٹی نہر نکالنے میں کامیابی ملی اور اسے لاہور لے جایا گیا۔ شاہجہان کی بنائی ہوئی مغربی جمنا نہر جب صفیداں سے دہلی تک کھودی جا رہی تھی تو اس کا پانی ایک گڑھے میں گرا اور روہتک کے قریب لال پور کے قصبے کو تباہ کر دیا، اس کے راستے کو بہتر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر بار ایک اونچے ٹیلے کے کنارے جہاں کبھی نہر کا نچلا حصہ ارد گرد کی زمین سے کافی اونچا ہوتا تھا اور کھوکھلی جگہوں پر چاروں طرف مناسب گارا اور چونا اور گارا لگا کر باندھ بنایا گیا۔ اس طرح جدید طریقے سے نہر بنانے کا تجربہ کیا گیا۔ اونچائی پر بنی ہوئی نہر سے چھوٹی نہروں کے ذریعے آبپاشی کے لیے پانی فراہم کرنا آسان ہوا اور اس وجہ سے کرنال سے دہلی تک نہر جسے نہر فیض کہتے ہیں، کے دونوں کناروں پر واقع دیہی علاقوں کے لئے بڑے پیمانے پر پانی کے ذرائع دستیاب ہوئے۔ پھر اس نہر کو دہلی تک بڑھایا گیا جو کہ بہت اہم کام تھا۔

16.3 جنگی ٹکنالوجی (Military Technology)

16.3.1 توپ خانہ (The Artillery)

کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ توپ کا ہندوستان میں تیرہویں صدی یا اس کے قبل استعمال ہوتا تھا۔ فرشتہ اپنی کتاب تاریخ فرشتہ میں کہتا ہے کہ توپ کو استعمال چودھویں صدی میں جنگ میں کیا گیا تھا، لیکن اقتدار عالم خان کا خیال ہے کہ اس طرح کا بیان ایک انتہا پسندی ہے اور مؤرخ نے چودھویں صدی کے واقعات کے بیان میں اپنے دور کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ لیکن بندوق سے متعلق یہ بیان بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ اکثریت کا یہ اتفاق ہے کہ بابر نے 1527 میں پانی پت کی جنگ میں ہندوستان کی زمین پر پہلی بار توپوں کا استعمال کیا۔ پرتگالیوں نے جنوبی ہندوستان میں توپوں کا استعمال کیا۔ سولہویں صدی کے ایک سنسکرت کتاب، شکرنیتی میں چھوٹی بڑی توپوں اور بارود کے استعمال کے سوالوں پر گفتگو کیا ہے۔ مغلیہ دور کے آغاز میں بڑی توپوں کی تیاری کا رجحان نظر آتا ہے۔ کانسے یا پیتل کی لمبی توپیں ڈھالنا ممکن تھا۔ لیکن اتنی بڑی توپوں کو لے جانے میں اور لمبی بیرل کی وجہ سے صحیح نشانہ لگانے میں دشواری ہوتی تھی۔ 1700 عیسوی تک ان توپوں کو بڑی رکاوٹ کے طور پر دیکھا جانے لگا۔ بابر نے ہندوستان میں نئی فوجی حکمت عملی متعارف کیا۔ ان میں گاڑیوں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھنا اور انہیں خندقوں سے محفوظ رکھنا اور تُلغما جیسے تجربے شامل تھے۔ جو اس نے عثمانیہ اور اوزبیگ کے ترکوں سے سیکھی تھی۔ اکبر نے توپوں کی لے جانے

اور اسکی ڈھلائی میں بہت سے اصلاحات کیا۔ توپوں پر اپنے مختصر باب میں ابوالفضل نے اکبر کی دو ایجادات کی تعریف کی ہے۔ سب سے پہلے توپوں کو آسانی سے لے جانے کے لیے توپوں کو الگ الگ حصوں میں بنایا گیا اور پھر دوبارہ جوڑنے کے لائق بنایا گیا۔

دوسری ایجاد سترہ توپوں کو ایک بعد دیگرے کو چلانے کا انتظام تھا۔ ممکن ہے کہ تمام توپوں کے بارود کو ایک ماچس یا فلیتہ سے آگ لگائی جاتی ہو تاکہ ایک کے بعد ایک لگاتار گولے داغتی ہو۔ لوہے کی لمبے لمبے ٹکڑوں کو ڈھالنے کے مشکلات کی وجہ سے لمبے بیرل (توپ کی نال) کو ڈھالنے میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ کانسے کی ڈھلائی میں بھی کئی بھٹّیوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ تھیوناٹ (Thevenot) نے بھی اس پر تنقید کیا ہے۔ لوہے کی ہندوستانی توپیں عام طور پر کچّے لوہے کے بجائے پِٹواں لوہے (wrought iron) کی سلاخون سے بنی ہوتی تھی۔ ان سلاخوں کو چھلّوں سے ایک ساتھ باندھ کر بیرل بنائی جاتی تھی۔ ان خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے مغل بادشاہوں نے بڑی تعداد میں یوروپی توپچیوں کو تقرر کیا اور توپیں درآمد کیں۔ اورنگزیب نے میر جملہ کو 1777 میں حکم دیا کہ وہ انگریز اور ڈچ انجینئر بھرتی کریں جنہوں نے بادشاہ کے فوج کے لئے پانچ بندوقیں بنائیں۔ شرط یہ تھی کہ وہ تجربہ کار اور ماہر ہوں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یوروپین کے مقابلے ہندوستان توپ بنانے کے تکنیک میں پیچھے تھا کیونکہ توڑے دار توپ اور بندوق ڈھالی نہیں جاسکتی تھی کیونکہ بھٹّیاں کمزور دھوکنیوں کی وجہ سے چھوٹی تھیں۔ اچھے قسم کا لوہا بہت زیادہ تپش دینے والی مضبوط بھٹّیوں میں تیار کیا جاتا تھا۔ 1550 تک یوروپ میں دھوکنیاں (بھٹّی کے آگ کو ہوا دینے والا) پانی سے چلنے والے لیور اور وزن سے چلائی جاتی تھیں، جبکہ ہندوستا میں لکڑی یا ہاتھ سے جلائی جانو والی چمڑی کی دھونکنی (blower) میں کوئی اصلاح نہیں کیا گیا، جیسا کہ بابر اپنی سوانح عمری میں کہتا ہے 'ایک توپ بنانے کے لئے سات یا آٹھ بھٹّیوں میں پگھلائے گئے لوہے کا استعمال کیا جاتا تھا جو کہ عمدہ معیار کا نہیں ہو سکتا تھا۔' مغل ہندوستان میں گرینیڈ کے گولے کے استعمال کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ سال 1740 میں گرینیڈ کے بارے میں کافی دلچسپی پیدا ہوئی۔ 1748 میں مارٹر بندوقوں کی طرف شاہجہاں کی توجہ مبذول ہوئی، لیکن جلد ہی یہ تجربہ ہوا کی یہ کسی کام کا نہیں ہے۔ ہندوستان یوں میں گرینیڈ کے استعمال میں عدم دلچسپی کی ایک وجہ یہ تھی کہ فوج کے پاس زیادہ موثر متبادل ہتھیار جیسے راکیٹ یا بندوقیں تھیں۔ یہ راکٹ بانس کے بنے تھے اور لوہے کے سِلنڈر لگے ہوتے تھے۔ برطانوی عہد میں ٹیپو سلطان نے اس کو مزید ترقی دے کر بہت موثر بنادیا تھا اور اس کی بدولت وہ انگریزوں سے موثر طریقے سے جنگ کرنے میں بہت کامیاب بھی رہا۔ اگرچہ اس کو سکشت ہوئی، بعد میں انگریموں نے اسے مزید جدید اور موثر بنادیا۔

16.3.2 دستی بندوق (Hand-Guns)

ہاتھ سے چلائی جانے والی بندوق میں بادشاہ اکبر کی بڑی دلچسپی تھی اور انہوں نے اس میں بھی اصلاح کیا۔ ان کے دور حکومت کے آغاز میں حمزہ نامہ پینٹنگ تیار کی گئی۔ اس وقت ٹِرِگر لیور کے ساتھ توڑے دار بندوقوں کی تصویریں بنائی گئیں اور یہ بندوقیں اس کے بعد اکبر کی پینٹنگ میں مسلسل ملتی ہیں۔ ابوالفضل نے مَسکٹ (دستی بندوق) کی نال (بیرل) بناوٹ میں کی گئی تبدلی کو اکبر سے جوڑ کر پیش کیا ہے۔ لوہے کی ایک چادر کو ایک نال کی شکل بنا کر جوڑنے کے بجائے اور زیادہ مضبوط بنانے کے لئے ایک نیا طریقہ استعمال میں لایا گیا۔ اس طریقے میں لوہے کی چادر کو گول گول موڑا جاتا تھا، جسمیں ایک سے زائد لوہے کی چادروں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لپٹی ہوئی لوہے کی چادر کو گرم کیا جاتا

اور لوہے کی ایک چھڑی سے پیٹا جاتا۔ اس طرح ایک چکنی نال تیار کی جاتی تھی جو پہلے کے مقابلے زیادہ مضبوط ہوتی تھی۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں زیادہ بارود بھرا جاتا سکتا تھا اور یہ دھماکوں سے پھٹتی بھی نہیں تھی۔ سولہ بندوقوں کی نالیوں (در فرض تُفنگ) کو ایک ساتھ اندر سے گھسنے یا صاف کرنے کی مشین جس کو برگو یا یرگو کہا جاتا تھا۔ اکبر کے دربار کا ایک امیر فتح اللہ شیرازی نے اس کو ایجاد کیا تھا۔ اس آلا یا مشین میں پنڈرم گیر کے ذریعے نالوں کے اندر برما (drill) چلا کر ایک ساتھ کئی بندوقوں کے نالوں کو تیار کیا جاسکتا تھا۔

ابوالفضل یہ دعوی کرتا ہے کہ اکبر نے ایسے بندوق بنوائے جس میں آگ کے فلیتہ (فلیتہ آتش) کا استعمال سے ٹرگر (ماشا) ہلانے سے گولی چل جاتی تھی۔ بندوق کے گھوڑے سے جلتی ہوئی رسی یا فلیتہ کو بارود لگائے بغیر چلانے والی بندوق یا توڑے دار بندوق (flint lock gun) تھی یا 1520 میں اٹلی میں ایجاد کی گئی چرخی والی بندوق (wheel-lock gun) تھی۔ ہندوستان میں اصل توڑے دار بندوق (flint-lock gun) کا استعمال سترہویں صدی کے نصف آخر میں کی شروعات ہوئی۔ اب بندوق چلانے کے لئے فلیتے کی (کارتوس) کی ضرورت نہیں تھی۔ نئی بندوق چقماق پتھر کا استعمال کرتے ہوئے چلائی جاتی تھی۔ یہ پرانی بندوقوں سے ہلکی تھی اور زیادہ تیزی سے چلائے جاسکتی تھی اور دور تک وار کرتی تھی۔ اس کا استعمال پیدل سوار اور گھوڑ سوار دونوں کر سکتے تھے۔ 1723 کی ابتدا میں ایک یوروپین سیاح کے پاس ایسی بندوق دیکھنے کے بعد کالی کٹ کے زمورِن کو بہت دلچسپی ہوئی اور وہ گھوڑے والی بندوق کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ برنیر کہتا ہے کہ ایک زمانے میں ہندوستانی یوروپ میں بنائی جانے والی چیزوں کی نقل کرتے تھے۔ اس کے بعد 1773 میں کہتا ہے کہ 'دوسرے چیزوں کے علاوہ ہندوستانیوں نے بہترین بندوق اور دیگر ہتھیار بنالیے'۔ یہ بیان مینرک (Manrique) کے بیان سے بالکل مختلف ہے، جس نے تقریبا بیس سال پہلے یعنی 1740 میں ہندوستانی دستی بندوق (arquebus) کو ناقص بتایا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ بیس سالوں میں توڑے دار بندوق (flint-lock gun) ہندوستانی لوہاروں نے بڑی کامیابی سے بنالیا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں تصنیف کردہ ایک کتاب 'سیاق نامہ' میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستانی بندوقوں کے استعمال کے ساتھ توڑے دار بندوق (flint-lock gun) کے استعمال کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ لیکن ہم عصر مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنانے اور مرت کرنے میں آسانی کی وجہ سے اٹھارویں صدی میں ہندوستانیوں نے عام میچ لاک بندوق (match-lock gun) استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ سترہویں صدی کے ہندوستان میں لمبی نال والی میچ لاک بندوق تیار کی جاتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے ابتدا کے ایک پینٹنگ میں ایک امیر شکاری کو اس کے نوکر کے کندھے پر ایک لمبی بندوق کی نال کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پیدل اور گھوڑ سوار فوج کی اہمیت کے باوجود تیر اور کمان والے گھوڑ سوار سترہویں صدی اور اس کے بعد بھی ہندوستان میں پیدل سوار کا اہم حصہ تھے۔

16.3.3 کپڑے کی ٹکنالوجی (Textile Technology)

چرخی یعنی کپاس صاف کرنے کا پہیئے کا استعمال کا ہندوستان میں پہلی ادبی ثبوت اٹھارویں صدی لغت بہار اعظم میں ملتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے بنگال کی ایک ایک فارسی دستاویز میں جسے چرخی کہا گیا ہے، اس کے استعمال کا ذکر ملتا ہے۔ کتائی کے معاملے میں دہلی سلطنت کے زمانے میں چرخے کے اہم پہیئے کرینک ہینڈ (crank handle) کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس کا ذکر صوفی گایک وِچِتر

کی 1700 کی پینٹنگ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے بعد اورنگزیب کے عہد میں چرخہ کاتنے والی ایک دیہاتی خاتون کی تصویر ملتی ہے۔ ایک بار جب دھاگہ کی کتائی ہو جانے پر کپڑا بنائی کا مرحلہ شروع ہوتا تھا۔ ہندوستانی لوم (loom) افقی (horizontal frame) ہوتے تھے۔ لیکن مغل عہد میں، شروعاتی ڈیزائن والے پیٹرن لوم (patterned loom) کے علاوہ، ڈرالوم (draw-loom) بھی عام ہو گیا تھا۔ سترہویں صدی کے کبیر کے پینٹنگ میں ایک ہندوستانی بُنکر کا لوم دکھایا گیا ہے۔ 1778 میں برنیر نے لوم کے ذریعے کی جانے والی کڑھائی کی ایک قسم کا ذکر کیا ہے۔ بہت بعد میں تقریباً 1822 میں ولیم مور کرافٹ (William Moorcraft) اور جارج ٹربیک (George Trebeck) نے دیکھا کہ کشمیر میں شال بنانے کے لئے گانٹھوں کے ذریعے کپڑے کو یوروپ کی طرح اٹھایا جاتا تھا۔ انگریز فیکٹری کے مالکوں نے 1779ء میں قالین بننے کے لیے اس قسم کے عمودی لوم استعمال کیا، جو آندھرا پردیش کے ساحلی علاقے ایلور میں استعمال ہوتا تھا جہاں ایران سے لوگ آباد تھے۔ سترہویں صدی کے ہندوستان میں ڈرالوم متعارف کرارایا گیا تھا۔ لیکن ایک تحقیق سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ عمودی لوم (vertical loom) ہندوستان کا سب سے قدیم لوم تھا۔

کپڑے پر چھپائی جسے فارسی میں 'کالب' کہتے ہیں، اس کے مغل دور میں بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔ کپڑوں کی چھپائی کا فن جان اِروِن (John Irvin) کے مطابق سترہویں صدی سے پہلے ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ 'چھاپا' (chhapa) جسے کپڑوں پر چھپائی کے لئے استعمال ہوتا تھا، کا ذکر سب سے پہلے سولہویں صدی میں ملک محمد جائسی کی کتاب میں ملتا ہے۔ 1590 میں جب اکبر نے عبدالرحیم خان خانا کو وسطی ہندوستان کے سروج میں تعینات کیا تو انہوں نے ماہرین کی سرپرستی کی۔ ان ماہرین نے چھینٹ کی چھپائی (تراحی چھینٹ) کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ 1777ء میں ٹیورنیر (Taverinier) نے یہ ذکر کیا ہے کہ غیر ملکی تاجروں کے طریقہ کار کے مطابق مزدوروں نے چھپائی کی۔ اسی طرح تھیوناٹ (Thevenot) آگرہ کا ذکر کرتے ہوئے لحاف اور لحاف پر ٹھپّے والی چھپائی (block printing) کا ذکر کرتا ہے۔ چھپائی کے فن کی ابتداء ہندوستان میں شائد چودھویں صدی میں ہوئی ہے۔ سترہویں صدی میں اس فن کو اس قدر وسعت ملی کہ ہندوستان خود اس کا اصل اور فنکارانہ کمال کی مثال ہو گیا۔ اس طرح کپڑے کی صنعت کے میدان میں تکنیکی تبدیلی کافی اہم تھیں۔ مثال کے طور پر چرخے کو اسی دور میں کرینک ہینڈل (crank handle) ملا اور ایران سے خوبصورت بنائی کی تکنیک حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ کم خرچ والی تکنیک کی صورت میں سادہ سانچوں سے چھپائی کو عالمی شہرت ملی۔

16.3.4 کاغذ اور چھپائی (The Paper and Printing)

پہلی صدی عیسوی میں چین میں کاغذ کی ایجاد سے لے کر دنیا کے مختلف حصوں میں اس کے سفر کی تاریخ مورخین کے لیے تحقیق کا موضوع رہا ہے۔ اسلامی دنیا نے اسے آٹھویں صدی میں حاصل کیا۔ اس کے ہندوستان کے سفر کی تاریخ کا مطالعہ پی۔ کے۔ گوڈے (P. K. Gode) نے کیا ہے۔ ان کی تحقیق البیرونی کے اس بیان کی تائید کرتی ہیں کہ ہندوستانی گیارہویں صدی میں کاغذ کے علاوہ تحریری مواد استعمال کرتے تھے۔ واضح طور پر ہندوستان چین سے براہ راست کاغذ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ غوریوں کی فتوحات کے بعد اس کا استعمال ہوا۔ تیرہویں صدی کے آخر میں امیر خسرو کاغذ بنانے کو اہم عصری دستکاری میں شمار کرتے ہیں۔ اور چودھویں صدی کے وسط تک کاغذ اتنا

سستہ ہو گیا کہ دہلی کے حلوائی اپنی میٹھائی کاغذ میں لپیٹ کر خریداروں کو دیتے تھے۔

مغل دور میں کاغذ بنانے کی تکنیک میں کو خاص ترقی نظر نہیں آتی۔ پرنٹنگ پریس کی عدم موجودگی علم کی توسیع میں رکاوٹ تھی۔ کاغذ بنانے کے لئے خام مال سوتی کپڑے کے چیتھڑے، پرانی ردّی رسّی، ردّی قسم کے ریشے والی چیزیں اور یہاں تک کہ کچھ جھاڑیوں اور درختوں کے چھال کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس خام مواد کو پانی سے بھرے تانور (tank) میں پانی بھر کر بھگو دیا جاتا تھا۔ اور اس کے بعد اسے پیٹ یا گود کر لگدی بنائی جاتی تھی۔ پانی کے ساتھ چونا، سوڈا اور کچھ دیگر اجزاء ملائے جاتے تھے۔ اس میں چپکے ہوئے مواد کو الگ کر لیا جاتا تھا، جسے ٹکڑوں میں کاٹ کار دھوپ میں سکھا کر سخت کیا جات تھا۔ اسے پتھر یا شیشے سے رگڑ کر چمکدار اور ہموار کاغذ بنایا جاتا تھا۔ سترہویں صدی کے آخر میں اعلی معیار کا کاغذ بنانے کے لئے اس پر سونے کی کوٹنگ لگائی جانے لگی۔ کاغذ بنانے کی عمل کی تصویری تفصیل جہانگیر کے دور کے ایلبم میں ملتی ہے۔ جب کہ چین میں طباعت کی تاریخ نوویں صدی میں اور یوروپ میں چودھویں صدی کے آخر تک ہے۔ ہندوستان میں جیسا کہ اوونگٹن (Ovington) نے لکھا ہے کہ کتابوں کو تیار کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر خوبصورت کاتبوں کی موجودگی نے ترقی میں اہم کردار ادا کیا، اور پرنٹنگ میں رکاوٹ پیدا کی۔ لیکن عیسائیوں اور دیگر یوروپیوں کی ذریعے آغل دربار میں لکڑی کی مہریں اور دیگر طباعت شدہ مواد متعارف کروانے سے ان کی بیداری میں دلچسپی ہوئی، اور ہندوستان مین اس فن کے لئے حیرت انگیز کشش پیدا ہوئی۔ 1770 کے دہائی میں سورت میں انگریزی کمپنی کے چیف، بھیم جی پار کرنے پرنٹنگ پریس کے تکنیک میں گہری دلچسپی لی۔

16.5 کان کنی، فلزیات یادھات کاری (Mining and Metallurgy)

مغل دور کے کان کنی کے طریقے واضح طور پر سال 1800 سے پہلے طریقوں سے آگے نہیں بڑھے۔ یہاں گہری کانیں کھودنے کا رواج نہیں تھا۔ سولوہویں اور سترہویں صدیوں میں ہندوستانی ٹکنالوجی کی کئی خامیاں تھی چین اور یوروپ کی طرح یہاں کوئلہ دستیاب نہیں تھا۔ 1711ء میں سمندری کوئلہ انگریزی جہاز کے ذریعے سورت سے جہانگیر کے دربار میں لایا گیا، جہاں وہ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

16.5.1 لوہا (Iron)

کیا مغل دور میں پٹواں (wrought iron) کے علاوہ ڈھالواں لوہا (cast iron) کے بڑے ٹکڑے تیار کرنا ممکن تھا؟ تانبے کے مقابلے لوہے کو پگھلانے کے حدت بہت زیادہ یعنی 1535 سینٹی گریڈ ہوتا ہے، لوہا اپنے سادہ ترین شکل یعنی فیرائٹ میں بھی 770 سینٹی گریڈ پر ویسا ہی بنا رہتا ہے۔ اس لئے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے کو بنانے کے لئے اسے بہت زیادہ درجہ حرارت پر بڑی بھٹّیوں میں پگھلانا اور فوراہی اسے ڈھالنے کے لئے لے جانے کی انتظام ضروری تھے۔ ہندوستان میں بھینس کی خال سے بنی انسانی طاقات سے چلنے والی دھونکنی سے بڑی بھٹیوں کو بلند درجہ حرارت پر مسلسل جلائے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں تک کہ مغل دور کے اختتام تک ہندوستان میں جانوروں کی طاقت یا پانی کی طاقت سے چلنے والی بڑی بھٹّیوں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ 1708 میں جب الیگزینڈر ہیملٹن (Alexander Hamilton) اڑیسہ آیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں بہت زیادہ لوہا تھا، جس سے جہازوں کے لیے لنگر ڈھالتے تھے لیکن

یہ لنگر یوروپ کے لنگروں کے مقابلے اچھے نہیں تھے۔ ممکن ہے کہ اعلی صلاحیت کی بھٹّی نہ ہونے کی وجہ سے لنگروں کی تسلی بخش بناوٹ ممکن نہ ہو۔

16.5.2 اسٹیل (Steel)

لوہے کے حوالے سے ہندوستان اپنی سطحی دھاتوں کے معیار میں خوش قسمت رہا ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے بہترین خام دھات تھا جس سے دمشق یعنی ووٹز اسٹیل (wootz steel) حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کی کان کنی آندھرا میں اِندور کے قریب کی جاتی تھی۔ یہ اسٹیل در حقیقت فارس اور دیگر ممالک کو برآمد کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی اسٹیل کو کروسیبل کاسٹ (crucible-cast) کیا گیا تھا۔ اس عمل کو سترہویں صدی کے دو انگریز مصنفین نے بیان کیا ہے۔

16.5.3 تامبا، ٹِن، کانسہ اور جست (Copper, Tin, Brass and Zinc)

تامبے کی کانیں راجستھان کے کھیتری میں واقع تھیں۔ ٹِن اس ملک کی قدرتی پیداوار نہیں تھی، اسے دوسرے ایشیائی خطوں سے درآمد کیا جاتا تھا۔ کانسہ کا استعمال پڑپا کے زمانے سے ہوتا رہا ہے۔ دھاتوں کا مرکب جیسے پیتال جو تامبا اور زنک یا ٹن ملا کر بنایا جاتا تھا۔ مغل دور میں بڑی بڑی توپیں جیسے ملک میدان کانسہ، لوہے اور پیتل کے بنائے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کی جست (zinc) کی دھات کاری کا آغاز ہندوستان میں بارہویں صدی عیسوی کے آس پاس ہوا تھا۔ ابوالفضل آئین اکبری میں کہتا ہے کہ 'جست کسی کو بھی دیکھنے پر سیسہ (ابرَک) جیسا معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کو یہ پارا لگتا ہے۔ سائس کی کتابوں میں اس کے بارے میں کچھ نہیں ملتا ہے۔ صوبہ اجمیر میں زوار کے قریب اس کی کان کنی ہوتی ہے۔' ہندوستان میں جست مرکب دھات پر کام تفصیل بیدری پروڈکٹ (bidri product) کے وقت سے صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی پیداوار کی شروعات کی تاریخ اٹھارویں صدی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی پہلی تفصیل ہین نے 1817 میں لکھا ہے۔

16.6 کیمیا (Chemistry)

دھات کاری کا مقام کیمائی صنعتوں کے مقابلے میں بہت قریب سے متوازی پائی گئی۔ یہاں کچھ جدید تکنیکیں جنکی نمائندگی عرق کشی (distillation)، ٹھنڈا کرنے کا عمل (refrigeration) اور شیشہ (glass) کرتا ہے۔

16.6.1 عرق کشیدی (Distillation)

ابوالفضل آئین اکبری میں سب سے پہلے عرق کشید کی سائنسی وضاحت کرتا ہے۔ اس نے تین قسم کے کشید برتنوں جیسے منگول، گندھارا اور اطالوی عرب برتن کا ذکر کیا ہے۔ اطالوی عرب برتن سب سے بہتر تھا کیونکہ اس برتن کے اوپر اس کا ڈھکّن الٹے چمچے کی طرح ہوتا تھا۔ اور اس کے اوپر ایک ٹب میں ٹھنڈا پانی رکھا جاتا تھا جسے 'مور ہیڈ' کہتے تھے۔

16.6.2 اطالوی عرب برتن (Italian Arabic Ceramics)

کشید کا یہ عمل مغل دور میں عطر اور عرق نکالنے کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ ابوالفضل نے کشید کے ایک پیچیدہ عمل کا بھی ذکر کیا ہے جس کے ذریعے مسبر کی لکڑی کے عرق سے 'چُوا' نامی عطر نکالا جاتا تھا۔ بادشاہ جہانگیر نے توزک جہانگیری میں ذکر کیا ہے کہ نور جہاں کی والدہ عصمت بیگم نے اس سے عطر عرق کشید کر کے ایک عطر بنایا تھا، جسے عطر جہانگیری کہا جاتا تھا۔ برنیئر (Bernier) نے غیر مصدقہ چینی سے کشید کی جانے والی عرق کی بھی تفصیل دیا ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی سیاح ایبے کیرِی (Abbe Carre) بھی ہمیں عرق کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ مغل دور میں عرق کشیدی کی تکنیک اچھی طرح سے قائم ہو چکی تھی۔

16.6.3 ٹھنڈا کرنے کا عمل (Refrigeration)

اکبر نے لوگوں کے گھروں میں ہوا کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ہندوستان میں خس چوکھٹوں کو مقبول بنایا، جس کا ذکر ابوالفضل نے کیا ہے۔ ٹیک چند بہار نے خس خانہ کی تعریف ہندوستان کی خاص چیز کے طور پر کیا ہے۔ شورا کے استعمال سے پانی کو ٹھنڈا کرنے کی ترکیب کی ایجاد کا سہرا اکبر کو ہی جاتا ہے۔ ابوالفضل نے اس کی تفصیل دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اکبر نے 1585 میں جب اپنا دارالحکومت لاہور کو منتقل کیا تو اس نے پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے قدرتی برف کا استعمال شروع کیا، یعنی اکبر نے 1885 سے پہلے آگرہ اور فتح پور سیکری میں پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے شورے کا استعمال ایجاد کیا۔ یوروپین سیاحوں نے اس حقیقت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ طریقہ صرف ہندوستان میں ہی پایا جاتا ہے۔

16.6.4 شیشہ (Glass)

بابر نامہ میں گھنٹا گھر (جامع سعت) کا ذکر ملتا ہے اور لفظ 'شیشہ سعت (ریت کی گھڑی) کو سولہویں صدی کے آخر میں فیضی سرہندی کی لغت میں واضح طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ اکبر کے زمانے سے ہی ریت کی گھڑیوں کو چھوٹے پینٹنگ میں دکھایا گیا ہے۔ شیشے کی تکنیک میں ہندوستان پیچھے رہ گیا۔ چوڑیاں اور برتن ضرور بنائے گئے لیکن برطانیہ کے پانی پینے کے گلاس، آئینہ اور چشموں کی مانگ ہمیشہ رہتی تھی۔ اکبر کے پینٹنگ میں شیشے کے چشموں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور ان کے درباری شاعر فیضی خود شیشے کے چشمے پر اپنے انحصار کو بیان کیا ہے۔ اس وقت چشمہ اس لئے درآمد کیا جاتا تھا کہ جب بھی مغل بادشاہوں کو یوروپین چشموں کی ضرورت ہوتی وہ انہیں وہیں سے منگواتے تھے۔ سترہویں صدی کے آغاز میں دوربین کی ایجاد ہوئی تھی اور اسے باقاعدگی سے ہندوستان میں درآمد کیا جاتا تھا۔ 1730ء میں دہلی میں سوائی جے سنگھ کی جنتر منتر میں جو دوربین نصب کی گئی تھی وہ خاص طور پر یوروپ سے درآمد کی گئی تھی۔ ٹیک چند بہار نے لکھا ہے کہ کوئی بھی اس دوربین کی مدد سے زہرہ کے قمری مراحل کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کے برعکس ستیش چندر کا خیال ہے کہ سوائی جے سنگھ کی جنتر منتر کی افادیت اس لئے ختم ہو گئی کہ وہ دوربین کو مشاہدے کے لیے استعمال نہیں کر سکے۔ انہوں نے اپنے بہت سے قاصد پرتگال بھیجے لیکن پرتگالی خود مشاہدے کے لئے برطانیہ اور ہالینڈ میں بنائے گئے فلکیات سے ناواقف تھے۔

16.7 جہاز سازی (Shipbuilding)

قرونِ وسطی میں ہر جگہ جہاز لکڑی سے بنائے جاتے تھے۔ تختوں کو جوڑنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے تھے۔ان میں سے ایک لکڑیوں کو باہم جوڑنے کا عمل تھا جو ہندوستان میں بڑے پمانے پر رائج تھا۔ یہ بنیادی طور پر' زبان اور نالی' جوڑ کے اصول (tongue and groove joint principle) پر منحصر تھا۔ایک تختے کی زبان کو دوسرے تختے کی نالی میں لگا کار دو تختے کو جوڑا جاتا تھا۔اس تصویر میں دایاں تختہ نالی ہے اور بایاں تختہ زبان ہے اس طریقہ کار کو انگریزی میں ٹنگ اَینڈ گرووجوائنٹ کہتے ہیں۔اگلا مرحلہ سمندری کیڑوں سے حفاظت کے لئے تختوں کو دیسی تارکول یاڈامر اور چونے کے لیپ لگایا جاتا تھا،تاکہ تختہ پانی میں خراب نہ ہو۔اس کے علاوہ مچھلی کے تیل سے بھی تختوں کو لیپا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں نے جہازوں کے درازوں کو بند کرنے کا یوروپین طریقہ کار (کاکِلنگ) کو نہیں اپنایا تھا کیونکہ یہ طریقہ دیسی تکنیک سے بہتر نہیں تھی۔اس کے علاوہ یہ ہندوستان میں کافی مہنگا بھی تھا۔

یوروپی باشندوں کی آمد سے پہلے بحری جہازوں اور کشتیوں کے تختوں کو ناریل سے بنی رسّیوں سے باندھا جاتا تھااور کبھی کبھی لکڑی کے کیل کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یوروپین لکڑے کے کیل کے بجائے لوہے کی کیل اور کلیمپ کا استعمال کرتے تھے، جو ان کے جہازوں کو مضبوط اور پائدار بنانے میں کافی مددگار ثابت ہوئے۔ ہندوستانیوں نے اس نئی تکنیک کو اپنانے میں بالکل بھی وقت ضائع نہیں کیا۔ 1510ء کے قریب وارتھیما(Varthema) نے کالی کٹ میں ہندوستانی بحری جہازوں میں لوہے کی کیلوں کے استعمال دیکھا تھا۔ابوالفضل ہمیں بتاتا ہے کہ اکبر کے جہاز کے لئے 478 مَن لوہا استعمال ہوا تھا۔ کچھ مغل پینٹنگ میں لوہے کی کیلوں پٹّیوں اور جہازوں میں استعمال ہونے والے کلیمپ کو دکھایا گیا ہے۔ یوروپین کے ذریعہ لوہے کے لنگر کے استعمال کا ثبوت سترہویں صدی میں ملتا ہے۔اس سے پہلے لنگر کے لئے پتّھر کا استعمال ہوتا تھا۔

16 .7.1 لوہے کا لنگر (Iron Anchor)

ہندوستانیوں نے بحری جہازوں میں لیک ہونے والے پانی کو نکالنے کے لئے باٹیوں کا استعمال کرتے تھے۔ جبکہ سترہویں صدی کے نصف آخر میں یوروپین آئرن چین پَمپ کا استعمال ہندوستان میں شروع ہوا۔ لیکن یہ ہندوستان میں وسیع پیمانے پر مستعمل نہیں تھا بلکہ یوروپ سے درآمد کیا جاتا تھا۔

16.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

سائنس کے مقابلے ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی کے لحاظ سے عہدِ وسطی بالخصوص مغل عہد بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔ ترکوں کے ذریعے لائے گئے تکنیکی آلات نے ہندوستانی معیشت کو سرگرم کردیا۔ گیئر والی فارسی ویل (Persian Wheel) نے پانی کو بہت نچلی گہرائی سے اٹھانا ممکن بنایا جس نے آخرکار ان علاقوں میں زراعت کے پھیلاؤ کو آسان بنایا جہاں پانی کی سطح نسبتاً کم تھی۔ دوسری طرف کپڑے

بنانے کے ٹکنالوجی کے شعبے میں نئی تکنیک نے موٹے دھاگے کی پیداوار میں اضافہ کیا۔ نئی فصلوں کی پیداوار میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو رہا تھا۔ قلمکاری کی تکنیک سے پھلوں کی مختلف اقسام کے معیار میں بہتری آئی۔ شیشہ سے بنائے جانے والی اشیاء کے میدان میں ہندوستان پیچھے تھا۔ اسی طرح مغل دور میں کاغذ ضرور بنائے جاتے تھے لیکن ہندوستانیوں نے طباعت کو اختیار نہیں کیا۔ اس کے علاوہ عرق کشیدی کے میدان میں مغل ہندوستان نے کافی ترقی کی۔ عرق کشیدی کے طریقہ کار کے ذریعے عمدہ قسم کے عطر بنائے جانے لگے۔ معدنیات کی کھدائی اور خام مال سے مختلف معدنی اشیاء بنا کر عہدِ وسطیٰ کے حکمرانوں نے صنعت و حرفت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

16.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

چھپایا چھاپا	:	کپڑے پر چھپائی کا کام
کلیمپ	:	(Clamps) باندھنے یا محدود کرنے یا دو سے زیادہ حصوں کو ایک ساتھ جوڑنے کے کا آلہ
کالکِنگ اور رِویٹنگ	:	(Caulking and Riveting) جو جوڑوں کو لیک پروف بنانے کی تکنیک
فِلنٹ لاک	:	(Flintlock) پرائمنگ پَین میں بارود کو بھڑکانے کے لئے فِلنٹ لیور والا دستی بندوق
ویل لاک	:	(Wheel-lock) بندوق کا تالا جس میں چقماق سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔
ووڈز	:	(Wootz) اسٹیل بنانے کا طریقہ جسے کرناٹک میں اُکّو کہتے ہیں

16.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. عطر جہانگیری کا ایجاد کس نے کیا تھا؟
2. شورا کا استعمال کس چیز میں ہوتا تھا؟
3. عرق کشیدی کے لئے سب سے عمدہ برتن کو کیا کہتے تھے؟
4. آئین اکبری کے مطابق جست کہاں سے نکالا جاتا تھا؟
5. بہار اعظم کے مصنف کا نام کیا ہے؟
6. ٹامس روکس مغل بادشاہ کے دربار میں آیا تھا؟
7. فتح اللہ شیرازی کون تھے؟
8. بارگویا پر گو کسے کہتے ہیں؟
9. آئین اکبری کس کی تصنیف ہے؟
10. فِلنٹ لاک کیا ہے؟

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ڈبلنگ (dibbling) پر پانچ جملے لکھیئے۔
2. باغبانی میں قلمکاری کی افادیت پر نوٹ لکھیے۔
3. زراعت پر زرعی ٹکنالوجی کے اثرات کا تجزیہ کیجیے۔
4. مغل عہد میں علم طب کی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔
5. جنگی ٹکنالوجی کی ترقی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
6. کاغذ بنانے کی تکنیک پر تبصرہ کیجیے۔

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل دور کے زرعی ٹکنالوجی کی ترقی کا جائزہ لیجیئے۔
2. مغل عہد میں توپ خانہ اور دستی بندوق کی ترقی بر بحث کریجیئے۔
3. قرون وسطی کے جہاز سازی پر ایک تفصیلی مضمون لکھیئے۔
4. مغل دور میں علم کیمیا کی ترقی پر بحث کیجیے۔
5. کپڑے کے ٹکنالوجی پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیئے۔

16.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد (Suggested Learning Resources)

1. Alam, Muzaffar and Sanjay Subrahmanyam eds., *The Mughal State*, *1526–1750*, Oxford University Press, New Delhi, 2002.
2. Alvi, M.A. and A. Rahman, *Fathullah Shirazi: A Sixteenth-Century Indian Scientist*, New Delhi, 1968.
3. Athar Ali, M., *Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society, and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2022 (first pub. in 2006).
4. Chandra, Satish, *Medieval India*: *From Sultanat to the Mughals*, Part Two (*Mughal Empire 1526 – 1748*), Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 1999.
5. Habib, Irfan, 'Changes in Technology in Medieval India', *Studies in History*, Vol. 2, No. 1, 1980.
6. Habib, Irfan and Tapan Raychaudhuri eds., *The Cambridge Economic History of India*, *Vol. 1*, Cambridge University Press, Cambridge, 1982.
7. Habib, Irfan, *The Economic History of Medieval India*: *A Survey*, Aligarh Historians Society, Aligarh, 2001.
8. Habib, Irfan, *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707*, Oxford University Press, New Delhi, 1963.
9. Habib, Irfan ed., *Akbar and His India*, Oxford University Press, New Delhi, 2021 (first pub. in 1997).

10. Iraqi, Shahabuddin ed., *Medieval India 2*: *Essays in Medieval Indian History and Culture*, Manohar, New Delhi, 2008.
11. Moosvi, Shireen, *The Economy of the Mughal Empire, c. 1595*: *A statistical Study*, Oxford University Press, New Delhi, 1987.
12. Mukhia, Harbans, 'Agricultural Technology in Medieval North India', in Harbans Mukhia, *Perspectives on Medieval History*, New Delhi, 1993.
13. Naqvi, Hameeda Khatoon, *Urban Centres and Industries in Upper India*, *1556–1580*, Asia Publishing House, Bombay, 1968.
14. Qaisar, A.J., *Indian Response to European Technology and Culture*, Oxford University Press, Delhi, 1982.
15. Qaisar, A.J., 'Shipbuilding in the Mughal Empire during the Seventeenth Century', *Indian Economic and Social History Review*, Vol. 5, No. 2, 1968.
16. Richards, Jhon F., *The Mughal Empire*, Cambridge University Press, New Delhi, 2016.
17. Roy, Ariruddha and S.K. Bagchi, *Technology in Ancient and Medieval India*, Sundeep, Delhi, 1968.
18. Subrahmanyam, Sanjay, *Explorations in Connected History*: *Mughals and Franks*, Oxford University Press, New Delhi, 2014 (first pub. in 2005).
19. Vanina, Eugenia, *Urban Crafts and Craftsmen in Medieval India* (Thirteenth-Eighteenth Centuries), Munshiram Manoharlal Publisher, New Delhi, 2004.
20. Verma, Tripta, *Karkhanas under the Mughals from Akbar to Aurangzeb: A Study in Economic Development*, Pragati Prakashan, Delhi, 1994.

نمونہ پرچہ امتحان

نظامت فاصلاتی تعلیم Directorate of Distance Education

ماسٹر آف آرٹس Master of Arts

Subject Code: MAHS301CCT

Paper: Economic History of India (A.D.1200–1757)

پرچہ: ہندوستان کی معاشی تاریخ (1200 تا 1757عیسوی)

تیسرا سمسٹر امتحان ، 3rd Semester Examination

نشانات : ۷۰ Marks : 70 وقت : ۳ گھنٹے Time : 3 hours

ہدایات

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔
(1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. زمین کے عطیہ کے بارے میں پہلی شہادت کس دور کے کتبے سے ملی ہے؟

ii. سلطنت کے دور میں دوآب میں ایک سال میں کتنی فصلیں کاشت کی جاتی تھیں؟

iii. زرعی قرض سوندھر کس سلطان نے شروع کیا تھا؟

iv. 'جاگی' کسے کہا جاتا تھا؟

v. اقطاع استغلال (*Iqta–i–Istighlal*) سے کیا مراد ہے؟

vi. مغلیہ مالگزاری میں جمع سے کیا مراد ہے؟

vii. وطن کس زبان کا لفظ ہے؟

viii. مغل ہندوستان میں سب سے بڑی صنعت کس چیز کی تھی؟

ix. لفظ 'دادن' فارسی زبان کی اصطلاح ہے، جس کا لفظی معنی کیا ہے؟

x. برنیر کہاں کا رہنے والا تھا؟

حصہ دوم

2. ابتدائی عہد وسطی میں مالیاتی بحران پر نوٹ لکھیے۔
3. سلطنت دور میں فصلوں اور پیداوار پر نوٹ لکھیے۔
4. دیوان امیر کوہی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
5. اقطاع کی علاقائی تقسیم پر نوٹ لکھیے۔
6. وطن داروں کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
7. مغل عہد میں علم طب کی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔
8. مغل شاہی کارخانے کے نظام پر نوٹ لکھیے۔
9. مغل عہد میں قلمکاری (Grafting) کے ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10. ابتدائی عہد وسطی میں جاگیرداری نظام کے متعلق مباحثہ کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔
11. سلطنت دور میں دیہی ساخت پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
12. بچولیوں (Intermediaries) کے خاتمے کے لیے علاؤالدین خلجی کے اقدامات پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔
13. کپڑے کے ٹکنالوجی پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیئے۔
14. مغل عہد میں دستی بندوق (Hand Gun) کی ترقی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

اہم نکات